آبِ کوثر

شیخ محمد اکرام

ادارہ ثقافت اسلامیہ
Institute of Islamic Culture
Lahore - Pakistan

آبِ کوثر

اسلامی ہند و پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ

عہدِ مغلیہ سے پہلے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲ - کلب روڈ، لاہور

فہرستِ مضامین

ابتدائی مرحلے

العرب و الہند و پاکستان

سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۹۸۰ء تک

غزنی و لاہور

سنہ ۹۸۰ء سے سنہ ۱۱۸۶ء تک

دورِ توسیع و اشاعت

سنہ ۱۱۸۶ء سے سنہ ۱۳۲۱ء تک

توسیعِ حکومت

(خاندانِ غلاماں اور خاندانِ خلجی)

اشاعتِ اسلام

دَورِ نفوذ و ترویج

خاندانِ تغلق، سادات اور لودھی کا عہدِ حکومت

سنہ ۱۳۲۱ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک

پیش کش

مِلّت اِسلامیہ پاکستان و ہند کے حضور میں!

جس کے رُخِ رنگیں اور خالِ مشکیں کی اِس کتاب میں آئینہ داری کی کوشش کی گئی ہے:-

آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

○

ہم آج جو کچھ ہیں، وہ اِس لیے ہیں کہ کل ہم کیا تھے۔

اور

انسانی مشکلات کا حل زیادہ وعظ و نصیحت سے نہیں،
بلکہ زیادہ علم اور صحیح تر واقفیت سے ہی ہو سکتا ہے۔

دیباچہ طبع پنجم

آبِ کوثر کی یہ پانچویں اشاعت ہے۔ اس کی چوتھی اشاعت بعینہٖ تیسری اشاعت کے مطابق تھی۔ نظرِ ثانی کے علاوہ اس اشاعت میں متعدد اضافے کیے گئے ہیں اور بعض مباحث میں مزید تفاصیل بہم کی گئی ہیں۔ "ہندوستان میں اسلامی فقہ کا آغاز" ایک مستقل باب ہے، جس کا اس اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔ صدر الصدور قاضی منہاج سراج سلطان التمش اور سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کی ایک بہت بڑی علمی، ادبی و سیاسی شخصیت تھی۔ گو اشاعتِ سابق میں بھی اُن کا کافی تفصیل سے ذکر تھا، لیکن اس دفعہ اُن کی شخصیت اور کارناموں پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِسی ضمن میں اِس دَور کے بعض اور اہلِ علم کا بھی ذکر آگیا ہے۔

شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانیؒ اور اُن کے خلفاء کی بدولت افغان علاقوں میں سہروردی سلسلے کو جس طرح فروغ ہُوا، اس اشاعت میں اُس کے تفصیلی حالات کا "سہروردی سلسلے کے افغان مشائخ" کے تحت اضافہ کیا گیا ہے۔

بنگال میں سہروردی اور چشتی بزرگ اسلام کا پیغام لے کر پہنچے تھے

اور انھی کی برکت سے وہاں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ تاریخ میں انھیں "غازی اولیا" کا نام دیا گیا ہے۔ "آبِ کوثر" کی اس اشاعت میں "بنگال کے غازی اولیا" کا ایک نیا باب شامل کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں کتاب کے مختلف مقامات میں بعض اور اضافے کیے گئے ہیں، اور اسلامی ہند و پاکستان کے اس دور کی مذہبی اور علمی تاریخ میں جو مزید تحقیقات ہوئی ہیں، انھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے، بحث و نظر کے دائرے کو اور آگے بڑھایا گیا ہے۔ اور اس بارے میں مزید معلومات جمع کی گئی ہیں۔

امید ہے قارئین کرام اس کتاب کو پہلے سے زیادہ مکمل پائیں گے۔

شیخ محمد اکرام

۲۰ مئی ۱۹۶۴ء

دیباچہ طبع ثالث

چشمۂ کوثر کا دُوسرا ایڈیشن اور اگر اسے آبِ کوثر کی بدلی ہوئی صُورت سمجھیں تو تیسرا ایڈیشن ہدیۂ ناظرین ہے۔

کتاب پر پھر سے تفصیلی طور پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ بلکہ متعدد مباحث مثلاً بوہروں اور خوجوں کا بیان۔ ملتان اور اچہ کے سہروردی بزرگوں کے حالات اور تبلیغی کارنامے، سلطان غیاث الدین بلبن کا کیرکٹر بالکل نئے سرے سے لکھے گئے ہیں اور حضرت چراغ دہلیؒ اور سیّد بندہ نواز گیسُودراز کے ملفوظات اور بعض دوسری اہم کتب کے ہاتھ آجانے سے بزرگانِ چشت کے حالات میں بھی تصحیح و اضافہ کا موقع ملا ہے۔

سلطان علاء الدین خلجی کی نسبت بھی بہت سا نیا مواد جمع کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ اس منتظم اور رعایا پرور بادشاہ کے ساتھ انصاف ہو۔ اور ایک گناہ یا ایک نقص کی بدولت اس کی بے اندازہ نیکیاں اور خوبیاں نظر انداز نہ ہو جائیں۔

آخری باب، جس میں اکبر سے پہلے کے عہدِ مغلیہ کے واقعات تھے رودِ کوثر میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اب اس سلسلۂ کتب میں قومی تاریخ کے تین مختلف دوروں یعنی:-

(۱) عہدِ مغلیہ سے پہلے (۲) عہدِ مُغلیہ اور (۳) مُغلوں کے بعد کے جُداگانہ حالات ہیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء

محمد اکرام

استدراک

آبِ کوثر کا یہ ایڈیشن شروع ۱۹۴۷ء میں مرتب ہو گیا تھا۔ اور تقسیم ہند سے پہلے کتابت بالکل مکمل تھی۔ لیکن اس سال کے آخر میں میری کتابوں کے قدیمی ناشر اور میرے کرمفرما شیخ نذیر احمد مالک تاج آفس بمبئی و کراچی ایک ہوائی حادثہ میں وفات پا گئے۔ اور ان کی ناگہانی موت سے جہاں ان کا وسیع کاروبار منتشر ہوا، وہاں آبِ کوثر کی طباعت بھی معرض تعویق میں آ گئی۔ بلکہ کتابت شدہ کاپیاں بے کار ہو گئیں۔ اب تمام کاپیوں پر نئے سرے سے نظر ثانی کی گئی ہے۔ اور کتاب دوبارہ کتابت کے بعد قارئین کرام کے سامنے پیش ہو رہی ہے۔

۱۱- جولائی ۱۹۵۲ء

محمد اکرام

دیباچہ طبع ثانی

آج سے کوئی چار سال پہلے ہم نے آبِ کوثر اور موجِ کوثر میں اسلامی ہندوستان کی ذہنی اور روحانی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا تھا۔ اس میدان میں یہ ہماری پہلی کوشش تھی۔ اور جس ماحول میں رہ کر ہمیں کام کرنا پڑا، وہ اِس قسم کی کوششوں کے لیے بالکل ناسازگار تھا۔ اس لیے آبِ کوثر میں بہت سی کوتاہیاں رہ گئیں اور کئی اندراجات کے لیے ہمیں معاصرانہ تصانیف کے بجائے دَورِ حاضر کے تذکروں ہی پر اعتماد کرنا پڑا۔

اب ہم نے کوشش کی ہے کہ اس خاکے میں رنگ بھرا جائے۔ اور بہت سی تفاصیل جن سے پہلی کتاب عاری تھی، چشمۂ کوثر اور رودِ کوثر میں جمع کی گئی ہیں۔

قوم کی علمی اور رُوحانی تاریخ مرتب کرنے میں جو مشکلات ہیں ان سے اہلِ نظر خوب واقف ہیں۔ مولٰنا مناظر احسن گیلانی، الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں لکھتے ہیں: "علمائے اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے ہیں، ان میں دیکھیے بقول نواب علامہ مولٰنا حبیب الرحمٰن شروانی سوائے البحر العلام البحر القمقام" کے ہم قافیہ الفاظ کے سوانح حالات کی ایک سطر نہیں ملتی"۔ اولیا و مشائخ کے جو تذکرے ہیں، وہ بھی ان سے بہتر نہیں۔ بیسیوں بلکہ بسا اوقات سینکڑوں صفحے اُلٹے جائیں، تب کام کی ایک سطر ملتی ہے۔

بقول شمس العلماء شبلی نعمانی چیونٹیوں کے مُنہ سے دانہ دانہ جمع کر کے خرمن تیار کرنا پڑتا ہے۔ قِصّہ نویسی اور خوش اعتقادی کی کُہر تمام لٹریچر پر چھائی ہوئی ہے، جس کے اندر نہ مختلف اولیائے کرام کے جُدا گانہ خدوخال نظر آتے ہیں اور نہ ان کے عملی کارناموں سے صحیح واقفیت ہوتی ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم اِن مشکلات پر غالب آسکے ہیں، لیکن اپنی بساط کے مطابق ہم نے ان پر عبُور پانے کی پُوری کوشش کی ہے۔ قدیم تصانیف میں سے جو چھپ چکی ہیں، انھیں اور جو غیر مطبوعہ اور کمیاب ہیں، ان کے متعلق مطبوعہ مقالات اور مضامین پڑھے ہیں اور طلب کا دامن دُور دُور تک پھیلایا ہے۔ اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں اُردو فارسی تذکروں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک ایک ضلع کا سرکاری گزیٹر دیکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان سب موادّ کی بنا پر قوم کی مذہبی اور علمی تاریخ واضح اور قابلِ فہم صورت میں مرتب ہو سکے۔

محمد اکرام

(۱۹۵۱ء)

اِبتدائی مرحلے

(الف) العرب والہند و پاکستان

سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۹۸۰ء تک

(ب) غزنی و لاہور

سنہ ۹۸۰ء سے سنہ ۱۱۸۶ء تک

العرب والہند و پاکستان

قدیم تعلقات عرب اور ہند و پاکستان کے تعلقات بہت پُرانے ہیں۔ ان دونوں علاقوں بالخصوص سندھ اور جنوبی عرب کے سواحل اس قدر قریب ہیں کہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات اور دوسرے روابط قائم ہوجانا ناگزیر تھا۔ جہاں تک طلوعِ تاریخ سے قبل کے واقعات کا تعلق ہے، قصص الانبیا کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے تو وہ پہلے لنکا یعنی ہندوستان کے جنوبی جزیرہ میں آئے اور حضرت حوا عرب میں پہنچیں۔ ان دونوں کی ملاقات جدہ میں ہوئی۔ عرب اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کی یہ پہلی ملاقات تھی، جو اس کرۂ خاکی پر وقوع پذیر ہوئی۔ سبحۃ المرجان میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس طرح کی کئی روائتیں جمع کی ہیں اور ان سے اپنے وطنِ مالوف کی فضیلت اور اہمیت ثابت کی ہے۔

مولانا آزاد نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ جنت سے نکلے تو حجرِ اسود ان کے ساتھ تھا اور آج یہی پتھر لنکا اور جنوبی ہندوستان سے ہوتا ہوا مسلمانوں کی مقدس ترین عمارت (خانہ کعبہ) میں نصب ہے۔ اس کے علاوہ عرب مصنف لکھتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان سے جو طرح طرح کی خوشبوئیں اور پھل اور مسالے عرب جاتے تھے اور وہاں سے ساری دُنیا میں پھیلتے تھے، وہ حقیقتاً ان تحفوں کی یادگار ہیں جو حضرت آدمؑ اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طوبیٰ جو عربی اور فارسی میں بہشت کا

ایک درخت ہے، ہندوستان کی کئی زبانوں میں بہشت کا نام ہے۔ اسی طرح رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے"۔ یہ حدیث ضعیف کے درجے سے بالاتر نہیں۔ لیکن اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے سامعین یا اس حدیث کے راوی ہندوستان سے بے خبر نہ ہوں گے۔ اقبالؔ نے اپنی نظم میں اسی حدیث کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے | پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لَے سُنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے | میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یہ بیانات تو زیادہ تر جوشِ محبت کے کرشمے اور قصہ کہانیوں پر مبنی ہیں، لیکن عرب اور ہند و پاکستان کے درمیان قدیم الایام سے ایسے تجارتی روابط قائم ہو گئے تھے جنھوں نے دونوں علاقوں بلکہ تمام دُنیا کی تاریخ پر اثر ڈالا اور جن کی تصدیق سے مورخین کو انکار نہیں۔ ہندوستان کی پیداوار اور دوسرے مال و اسباب کی اہلِ یورپ اور اہلِ مصر کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔ عرب تاجر یہ مال جہازوں کے ذریعے ہندوستانی بندرگاہوں سے یمن اور وہاں سے خشکی کے راستے ملکِ شام پہنچاتے۔ جہاں یہ چیزیں پھر جہازوں میں لدتیں اور یورپ تک پہنچتیں۔

فتحِ سندھ جب عرب نورِ اسلام کی روشنی سے منور ہُوا تو عرب اور ہند کے یہ دیرینہ تعلقات منقطع نہ ہو گئے۔ مسلمان ملاحوں اور تاجروں نے اپنے پیشرووں کا کام برقرار رکھا اور اپنی کشتیاں اور جہاز لے کر عرب سے ہندوستان اور لنکا کے سواحل پر آتے جاتے رہے۔ لیکن جلد ہی ان کاروباری تعلقات کے ساتھ ساتھ سیاسی روابط بھی شروع ہو گئے جو شروع میں اس قدر خوشگوار نہ تھے۔

اسلامی عرب اور خطۂ ہند و پاکستان کا پہلا واسطہ جس کا تواریخ میں ذکر ہے،

آغازِ اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور یہ واسطہ مخالفانہ تھا۔ مشہور مورخ طبری لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکم بن عمرو تغلبی اسلامی فوج لے کر مکران جا رہے تھے کہ راستے میں ایرانی فوج نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایرانیوں نے اپنی مدد کے لیے سندھ کے راجا سے فوج منگائی تھی، جو عربوں کے خلاف صف آرا ہوئی۔ لیکن ایران اور سندھ کی متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی اور جو مالِ غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا اس میں ہندوستان کے ہاتھی بھی تھے۔ اس زمانے میں بحرین کے عرب گورنر عثمان بن ابی العاص الثقفی نے حضرت عمرؓ کی اجازت کے بغیر عمان کے راستے ساحلِ ہند پر ایک لشکر بھیج دیا۔ جو علاقۂ بمبئی میں مقام تانہ (تھانہ Thana) تک آیا۔ یہ لشکر بخیر و عافیت عرب واپس پہنچا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جو بحری مہموں اور پُرخطر لڑائیوں کے خلاف تھے، والئ بحرین کو ایک خفگی کا خط لکھا اور ایسی مہموں کی ممانعت کر دی۔ اس کے بعد متعدد عرب افسروں کے بھروچ اور سندھ میں مختلف مقاصد سے آنے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ہندوستان پر فوج کشی کے مخالف تھے اور اگرچہ سندھ کی سرحد پر مکران کے مسلمانوں اور سندھ کے راجے میں گاہے گاہے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی لیکن عربوں نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے تک ہندوستان پر باقاعدہ چڑھائی نہیں کی۔ اور اس وقت بھی واقعات نے انھیں مجبور کر دیا۔

اس زمانے میں عراق کا گورنر حجاج بن یوسف تھا، جو عرب کی تاریخ میں اپنی بہادری، انتظامی قابلیت اور ظلم و ستم کے لیے مشہور ہے[1]۔ سندھ میں راجہ داہر

---

[1] پروفیسر محمد حبیب ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "اموی حکومت کی نسبت باقی امور میں خواہ ہماری رائے کیا ہو لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی توسیع میں حضرت عمر فاروقؓ کے بعد کسی نے اتنا حصہ نہیں لیا جتنا (اموی) خلیفہ ولید بن عبدالملک اور حجاج بن یوسف ثقفی نے ۔ ۔ ۔ ۔ حجاج

(باقی اگلے صفحے پر)

حکمران تھا۔ داہر نے اس سے پہلے ہی ان عربوں کو پناہ دے کر جنھوں نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کیا تھا۔ عرب حکومت سے مخالفت کی بُنیاد رکھ دی تھی۔ لیکن خلیفہ وقت ہندوستان پر لشکرکشی کے خلاف تھا اور اس نے راجا کے ساتھ لڑائی ضروری نہ سمجھی۔

اس واقعہ کے چند سال بعد لنکا سے کچھ جہاز ان تحائف سے لدے ہوئے عرب آرہے تھے جو لنکا کے راجہ نے حجاج کو بھیجے تھے۔ ان کے ساتھ کئی مسلمان تھے جو حج کو جارہے تھے اور ان مسلمانوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے، جو لنکا میں وفات پا گئے تھے۔ بادِ مخالف ان جہازوں کو ساحلِ دیبل پر لے گئی جو (موجودہ کراچی سے تھوڑی دُور) مملکتِ سندھ کی بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں دیبل کے میدٖ لوگوں نے ان جہازوں کا مال و اسباب لُوٹ لیا اور عورتوں اور مردوں کو گرفتار کر کے اندرُونی علاقے میں لے گئے۔ حجاج کو یہ خبر ملی تو اسے بڑا طیش آیا۔ اس نے راجا داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا تاکہ وہ گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو رہا کرائے اور تحفے دارالخلافہ پہنچائے۔ راجا نے سفیر کو جواب دیا کہ

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۲۲) ایک ظالم اور جابر شخص تھا، جس کے سیاہ کارناموں کی یاد اسلامی ذہن پر ایک ہیبت ناک خواب کی طرح مسلط ہے۔ لیکن اگر حجاج سے لوگ سخت متنفر تھے تو اس کی تابعداری بھی بلا چون و چرا کرتے۔ اور جب ولید نے، جو اموی خلفا میں سب سے جری تھا۔ حجاج کو خراسان کا گورنر مقرر کیا تو بلادِ شرقی میں اسلام کی دوسری بڑی توسیع کا آغاز ہوا۔ خلیفہ ثانی ایرانیوں کو دائرہ اسلام میں لائے تھے۔ اب حجاج کی بدولت تُرک اور تاتار حکومتِ اسلامی کے زیرِ نگیں آئے۔" (اسلامک کلچر۔ جنوری ۱۹۲۹ء ص ۸۲۔ ۸۳)

[۲] (از صفحہ ۲۲)۔ اس زمانے میں سندھ کی سرحد میں موجودہ مغربی پنجاب کا بڑا حصہ اور بلوچستان اور مکران کے مشرقی علاقے بھی شامل تھے اور انتظامی سہولت کے لیے کل مملکت چار صوبوں میں منقسم تھی۔ (۱) سیوستان (۲) برہمن آباد (۳) اُچہ (۴) ملتان۔ دارالسلطنت (موجودہ روہڑی یا سکھر کے قریب) الور تھا۔

"یہ سب کام بحری ڈاکوؤں کا ہے اور میرا ان پر کوئی زور نہیں"۔ حجاج اس جواب سے مطمئن نہ ہُوا اور اس نے راجا داہر کو قرار واقعی سبق سکھانے کے لیے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔ پہلے عبداللہ اور بدیل کے زیرِ قیادت مکران سے لشکر بھیجے گئے۔ لیکن راجا داہر کے بیٹے جے سنگھ نے انھیں شکست دی اور دونوں سپہ سالار لڑائی میں شہید ہوئے۔ حجاج کو ان شکستوں کا بڑا رنج ہُوا۔ بالخصوص بدیل کی موت نے اسے بہت متاثر کیا۔ چنانچہ اس نے خلیفۂ وقت ولیدؒ کی منت سماجت کر کے ہندوستان میں پورے انتظامات کے ساتھ[2] ایک خاص انتقامی لشکر بھیجنے کی اجازت لی اور اس کی قیادت کے لیے اپنے داماد اور چچازاد بھائی عماد الدین محمد بن قاسم کو چُنا جس کی عمر اس وقت صرف سترہ برس کی تھی۔

محمد بن قاسم چھ ہزار سوار لے کر خشکی کے راستے ۷۱۱ء کے موسمِ خزاں میں دیبل پہنچا اور شہر کا محاصرہ شروع کیا۔ کئی روز تک کامیابی نہ ہوئی، لیکن بالآخر العروس نامی ایک بڑی منجنیق کی مدد سے جسے پانسو آدمی چلاتے تھے، شہر فتح ہوگیا۔ اور محمد بن قاسم نے قلعے پر قبضہ کر کے ان قیدیوں کو رہا کیا جو لنکا کے جہازوں سے گرفتار ہوئے تھے۔ دیبل سے محمد بن قاسم (موجودہ حیدر آباد کے قریب) نیرون گیا جہاں کے حاکم نے بغیر لڑائی کے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر سہوان کی باری آئی۔ یہاں کا حاکم راجا داہر کا بھتیجا تھا۔ شہر کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے

---

[1] یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بالآخر راجا داہر کا وزیر سیسکار ([illegible]) قیدی عورتیں محمد بن قاسم کے پاس لایا۔ جب محمد بن قاسم نے دیبل کو فتح کیا تو قیدی مرد اور عورتیں سب یہیں سے ملے۔ (چچ نامہ)

[2] حجاج کے انتظامات اتنے مکمل تھے کہ مورخین لکھتے ہیں کہ سوئی دھاگا بھی ساتھ تھا اور جب حجاج کو معلوم ہُوا کہ اسقربوط ([illegible]) کی وجہ سے مجاہدین کو سرکہ کی ضرورت ہے تو اس نے روئی کو سرکے میں تر کر کے سایے میں خشک کرایا اور خشک شدہ روئی سندھ بھیجی تاکہ بوقتِ ضرورت تر کر کے کام میں لائی جائے۔

عربوں کی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد محمدؐ بن قاسم نے بہمن آباد کا رُخ کیا اور راوَر اور بہمن آباد کے مقامات پر راجا داہر اور اس کے بیٹے جے سنگھ کو شکست فاش دی۔ جواں ہمت سپہ سالار پھر ملتان کی طرف بڑھا اور ۷۱۳ء میں یہ تاریخی مقام بھی فتح ہوگیا۔ اس طرح دو سال کے عرصے میں سندھ اور ملتان کا سارا علاقہ عربوں کے ہاتھ آگیا۔ لیکن عرب سپہ سالار کا انجام اچھا نہ ہُوا۔

چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمدؐ بن قاسم کی فوجیں شمالی پنجاب کے اس مقام تک پہنچیں، جہاں دریائے جہلم میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے اور جہاں کشمیر اور راجا داہر کے مقبوضات کی حدیں ملتی تھیں۔ محمدؐ بن قاسم کا ارادہ مشرقی سمت بڑھنے کا تھا۔ چنانچہ اس نے قنوج کے راجے کو، جس کی حکومت مغرب میں اجمیر (اور غالباً وسطی پنجاب) تک پھیلی ہوئی تھی، پیغامِ جنگ بھیجا۔ لیکن یہ منصوبے پورے نہ ہوئے۔ ۷۱۴ء کے وسط میں اس کے خسر اور سرپرست حجاج کی وفات ہوگئی۔ جس کی وجہ سے محمدؐ بن قاسم کو متامل ہونا پڑا۔ اگلے سال کے شروع میں خلیفہ سیفت ولید چل بسا اور اس کے بعد تو دمشق میں ایک طرح کا انقلاب ہوگیا۔ ولید کا جانشین اس کا بھائی سلیمان ہُوا۔ جس کی حجاج سے پُرانی عداوت تھی۔ اس نے حجاج کے تمام اقارب اور دوستوں کے خلاف دستِ تعدّی دراز کیا۔ محمدؐ بن قاسم کو سندھ سے واپس بُلا بھیجا اور اسے اور اس کے عزیزوں کو سخت ایذائیں دے کر مروا ڈالا۔

محمدؐ بن قاسم کا نظم و نسق

محمدؐ بن قاسم ہندوستان میں قریباً چار سال رہا، لیکن اس مختصر قیام کے باوجود اس کے ملکی انتظامات خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ جن عربوں نے براہِ راست اسلام قبول کیا تھا، انھیں ہندوستان آنے کا یہی ایک موقع ملا۔ دوسرے حکمران جنھوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی ترک اور افغان تھے۔ اور اگرچہ وہ مسلمان ہوگئے تھے، لیکن ان کی اپنی قومی خصوصیات، ان کے مذہبی اعتقادات اور ان کے مُلکی نظم و نسق کو متاثر کرتی رہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سندھ کا نظم و نسق،

جس میں آخری احکام حجاج جیسے ظالم اور جابر گورنر کے ہوتے تھے شاید ترکوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ رواداری اور رعیت پروری پر مبنی تھا۔

جہاں تک محمدؐ بن قاسم کا تعلق ہے۔ چچ نامہ کا بیان ہے کہ اس نے دیبل کے محصوروں کے ساتھ بُرا سلوک کیا، لیکن ایک تو چچ نامہ کے بعض اندراجات مبالغہ آمیز اور ناقابلِ تسلیم ہیں۔ دوسرے یہ امور بھی قابلِ غور ہیں کہ محمدؐ بن قاسم ایک تعزیری مہم کا سردار تھا۔ کئی بے گناہ مسلمان عورتیں اور مرد جہازوں سے گرفتار ہو کر دیبل کے قلعے میں قید تھے۔ جے سنگھ نے بدیل اور عبداللہ کے لشکروں کا قتلِ عام کیا تھا۔ اور پھر یہ بھی اس زمانے کا مسلّمہ اصولِ جنگ تھا کہ جہاں حملہ آور فوج کی مخالفت زیادہ کی جاتی تھی، وہاں اس کی سزا بھی بہت سخت ہوتی تھی۔

محمدؐ بن قاسم سترہ سال کا جوشیلا نوجوان تھا۔ اگر اس نے دو ایک جگہ جوشِ انتقام کے ماتحت یا شدّتِ مخالفت سے برافروختہ ہو کر فتح کے وقت وہ رحم و کرم نہیں دکھایا جس کی مثال رسولِ اکرمؐ نے فتح مکّہ کے موقعہ پر قائم کی تھی تو کم از کم یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ باقی سب جگہوں پر اس نے اہلِ سندھ سے بڑی نرمی کا سلوک کیا۔ جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی، انھیں کسی طرح تنگ نہ کیا بلکہ ہر طرح امان دی۔ ہندوؤں کو وہ مراعات عطا کیں، جو بعض فقہا کے نزدیک اہلِ کتاب کے لیے مخصوص تھیں اور ایسے نظم و نسق کی بُنیاد رکھی جو پہلے راجاؤں سے یقیناً بہتر تھا۔

داہر کے باپ راجا چچ کی نسبت ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں: "چچ ایک متعصب حاکم تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے ایک حصّے کے لیے سخت جابرانہ قوانین نافذ کیے۔ انھیں ہتھیار رکھنے، ریشمی کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین ڈال کر سوار ہونے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر اور کتّوں کو ساتھ لے کر چلا کریں[1]۔" محمدؐ بن قاسم کے متعلق وہ لکھتے ہیں "مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ

---

[1] مختصر تاریخ اہلِ ہند از ڈاکٹر تارا چند (انگریزی) ص ۱۱۲

عقلمندی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ مالگذاری کا پُرانا نظام قائم رہنے دیا اور قدیمی ملازموں کو برقرار رکھا۔ ہندو پُجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی اور ان پر فقط ایک خفیف سا محصول عاید کیا جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمینداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں"۔

ڈاکٹر تارا چند نے جس خفیف ٹیکس کا ذکر کیا ہے، وہ جزیہ تھا جو برہمنوں سے نہیں لیکن دوسرے لوگوں سے لیا جاتا تھا۔ جزیہ کی بنا پر محمدؐ بن قاسم پر اعتراض کیا جاتا ہے، لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ مسلمانوں کو زکوٰۃ اور صدقہ دو ایسے ٹیکس دینے پڑتے تھے جن سے ہندو محفوظ تھے اور جو جزیہ کی رقم سے کہیں زیادہ ہوتے تھے تو یہ ٹیکس (جزیہ) غیر منصفانہ نہیں معلوم ہوتا۔ "مسلمانوں کو بیت المال یعنی شاہی خزانے میں اکثر ڈھائی فیصدی اور بعض دفعہ ساڑھے بارہ فیصدی تک داخل کرنا پڑتا تھا، لیکن غیر مسلموں کو سال میں پانچ دینار سے زیادہ نہ دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جنگی خدمت یعنی جہاد سے آزاد تھے، جو اسلامی حکومت میں ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے۔ بالعموم جزیہ وصول کرنے کے لیے برہمن مقرر تھے۔ غربا سے جزیہ کی رقم تھوڑی لی جاتی تھی اور وصول کرنے والے برہمن ہر حالت میں ان کا خیال رکھتے تھے۔

محمدؐ بن قاسم نے پرانے نظام کو حتے الوسع تبدیل نہ کیا۔ راجا داہر کے وزیرِ اعظم کو وزارت پر برقرار رکھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تمام نظامِ سلطنت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ عرب فقط فوجی اور سپاہیانہ انتظام کے لیے تھے۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے، لیکن ہندوؤں کے لیے ان کی پنچائتیں بدستور قائم رہیں۔

ؔ مختصر تاریخ اہلِ ہند از ڈاکٹر تارا چند (انگریزی) صر ۱۲۲-۱۲۳

محمد بن قاسم کی یہی رواداری اور انصاف تھا جس کی وجہ سے اس کی مخالفت کم ہوئی۔ کئی شہروں نے خود بخود اطاعت قبول کر لی اور علامہ بلاذری نے تو فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ "جب محمد بن قاسم قید ہو کر عراق بھیجا گیا تو ہندوستان کے لوگ روتے تھے اور کیرج (علاقہ کچھ) کے لوگوں نے تو اس کا مجسمہ بنایا۔"

محمد بن قاسم کے جانشین

محمد بن قاسم کی کامیابی ایک حد تک سازگار اتفاقات اور زیادہ تر اس کی اپنی شخصیت کی مرہونِ منت تھی۔ جب وہ چل دیا تو سندھیوں نے سر اٹھایا۔ اس پر مشہور اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ایما پر سندھ کے عرب گورنر نے اعلان کیا کہ اگر سندھ کے لوگ مسلمان ہو جائیں تو انھیں عرب حکمرانوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ چنانچہ بعض سندھی قبائل اور ان کے سرگروہ، جن میں داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی شامل تھا، مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد جلد ہی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔ (۷۲۰ء) اور جب اس کے چار سال بعد ہشام بن عبدالملک نے ایک شخص جنید کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تو سندھیوں نے جو خود مختار ہونا چاہتے تھے، اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے اور جے سنگھ کی سرکردگی میں بہت سے قبیلے جو مسلمان ہو گئے تھے، دوبارہ ہندو[1] ہو گئے۔ جنید نے بغاوت کو دبا دیا۔ بلکہ اس نے سندھ سے باہر مارواڑ، گجرات اور وسطی ہند میں بھی لشکر کشی کی۔ مارواڑ کو تو اس نے فتح کر لیا، لیکن گجرات اور اجین کے راجاؤں نے اسے شکستیں دیں اور بالآخر

---

[1] ان سب حالات کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان (ترجمہ انگریزی) مولوی عبدالحلیم شرر کا خیال ہے کہ جے سنگھ صرف دکھاوے کے لیے مسلمان ہوا تھا اور دل سے مسلمان نہ تھا۔ (تاریخ سندھ از شرر) لیکن مولوی ابوظفر ندوی کی رائے ہے کہ جے سنگھ کبھی بھی مرتد نہیں ہوا۔ فقط سیاسی طور پر اس نے عرب گورنر کی مخالفت کی (تاریخ سندھ از مولوی ابوظفر ندوی ص ۱۲۷)

۷۴۰ء میں وہ واپس بُلا لیا گیا۔

اس کی واپسی پر حالات بگڑ گئے۔ حتےٰ کہ مارواڑ، گجرات اور کچھ کی سرحدوں پر جو عرب دستے مقیم تھے، انھیں سندھ میں واپس بُلانا پڑا۔ یہاں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ جو سندھی مسلمان ہوئے تھے وہ سب سوائے ایک شہر کے اسلام سے منحرف ہوگئے اور عربوں کا اقتدار ختم کرنے کے لیے جو تحریک شروع ہوئی تھی اس میں غیر مسلم قبائل کے ساتھ مل گئے۔ حالات اس قدر بگڑے کہ عرب مسلمانوں کو اپنی بیشتر چھاؤنیاں خالی کرنی پڑیں اور بعض میں تو وہ اپنا قبضہ پھر کبھی نہ جما سکے[1]۔

جنید کی جگہ جو گورنر مقرر ہوا تھا وہ ایک سال کے اندر مر گیا اور نئی صورتِ حالات کا تدارک اس کے جانشین حکم کو کرنا پڑا۔ اس نے بڑی ہوش، سمجھ اور قابلیت سے کام لیا۔ سب سے پہلا کام ان منتشر عرب فوجوں کو بچانا تھا جو ایک مخالف آبادی کے درمیان گھر گئی تھیں۔ چنانچہ حکم نے دریائے سندھ کے دہانے کے مشرق کی طرف (موجودہ حیدرآباد سندھ کے قریب) ایک مستحکم مقام چُنا۔ اور تمام عرب فوجوں کو اس کے اندر جمع کیا۔ اس کا نام رکھا گیا محفوظہ (یعنی جائے حفاظت)۔ جب یہ مرحلہ طے ہوگیا تو یہاں سے پوری تیاری اور مناسب تدابیر کے ساتھ مُلک کے مختلف حصوں میں فوجی دستے بھیجے گئے، جو باغیوں کی سرکوبی کرتے۔ حکم کی یہ پالیسی اس قدر کامیاب رہی کہ جلد ہی سندھ کے طول و عرض پر عربوں کا دوبارہ تسلط ہوگیا اور انھیں ایک بڑی فتح ہوئی۔ چنانچہ محفوظہ کے بالمقابل (دریائے سندھ کے دہانے کی مغربی جانب) خلیفۂ وقت منصور کے نام پر ایک اور شہر آباد کیا گیا جس کا نام

---

[1] اس کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد بلاذری لکھتا ہے کہ مسلمان عربوں کے بعض مرکز پھر کبھی آباد نہ ہوئے اور "ابھی تک وہ خالی ہیں"۔ (منقولہ در تاریخ سندھ مرتبہ مولوی ابوظفر ندوی ص ۱۲۷)

منصورہ (یعنی مقام فتح) قرار پایا اور جو سندھ کا نیا دارالخلافہ تجویز ہُوا۔

ان سارے انتظامات میں حکم کا دستِ راست محمدؒ بن قاسم کا بیٹا عمر بن محمدؒ تھا جو حکم کی وفات کے بعد ایک قلیل مدت کے لیے سندھ کا گورنر بھی رہا۔

اب تک عرب میں اموی خلفا کی حکومت تھی، جن کا دارالسلطنت دمشق تھا۔ سنہ ۷۵۰ء میں ان کی جگہ عباسی برسرِعروج ہوئے اور بغداد پایۂ تخت قرار پایا۔ عباسی گورنروں میں سب سے کامیاب ہشام تھا جو سنہ ۷۵۷ء میں سندھ میں آیا۔ وہ جہازوں کا ایک بیڑہ لے کر کاٹھیاواڑ کے ساحل پر گندہار نام ایک جگہ پر حملہ آور ہُوا اور اپنی فتح کی یادگار میں یہاں ایک مسجد بنوائی، جو گجرات میں سب سے پہلی مسجد تھی۔ اس کے بعد اس نے شمال کا رُخ کیا اور کشمیر کے بعض سرحدی مقامات فتح کیے۔

فتح سندھ کے ساٹھ ستر سال بعد تک تو عرب فاتحین کا پلّہ بھاری رہا، لیکن اب ان میں یمنی اور حجازی کا جھگڑا شروع ہوگیا، جس نے عرب حکومت کو کمزور کر دیا۔ جب عرب حاکم اپنے قبائلی اختلافات میں اُلجھے ہوئے تھے تو مقامی قوموں نے سر اُٹھایا۔ چنانچہ شمالی سندھ میں جاٹوں نے اور جنوب میں میڈ (Meds) قوم کے لوگوں نے بغاوتیں کیں اور ملک کے بعض حصے خودمختار ہوگئے۔ آہستہ آہستہ خلیفۂ بغداد کا اس دُور اُفتادہ مملکت سے برائے نام تعلق رہ گیا اور سنہ ۸۵۴ء میں ہباری خاندان کی موروثی حکومت شروع ہوئی، جو ابتدا میں تمام مفتوحہ ممالک پر حکمران تھا، لیکن سنہ ۹۰۲ء میں مُلتان کے بنوسامہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور اس وقت سے عرب مقبوضات ملتان اور منصورہ کی خودمختار ریاستوں میں منقسم ہوگئے۔ اس دوران میں روہڑی کے قریب ہندوؤں نے اپنی ریاست قائم کرلی۔ چنانچہ ملتان اور منصورہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ ریاست ملتان کے تابع بالائی (شمالی) سندھ کا علاقہ تھا۔ اور منصورہ کے زیرِنگیں زیریں (جنوبی) سندھ کا۔

اس زمانے میں اسمٰعیلی عقائد کے لوگ جنھیں قرمطی کہتے ہیں، مصر اور شام پر قابض تھے اور قاہرہ میں انھی عقائد کے ماننے والے فاطمی خلفا کی حکومت تھی۔ بغداد اور مشرقی علاقے عباسیوں کے ماتحت تھے۔ جن سے فاطمیوں کی سخت عداوت تھی۔ چنانچہ قرمطی داعی اور مُبلّغ عباسیوں کے علاقوں میں جاکر اپنے مذہب اور فاطمیوں کی بیعت کی تلقین کرتے تھے۔ دُور افتادہ سندھ بھی ان کی کوششوں کا بڑا مرکز بن گیا۔ پہلا اسمٰعیلی داعی ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں سندھ میں آیا[1] اور اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی اشاعت میں مشغول ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرے داعی آئے اور مُلک کو انقلاب کے لیے تیار کرتے رہے۔ جب ان کی کوششیں کامیاب ہوتی نظر آئیں تو قاہرہ سے جلم بن شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ بھیجا گیا۔ جس نے ۹۷۷ء میں ملتان پر اچانک حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ اب ملتان میں فاطمی خلفاء کا سکّہ اور خطبہ جاری ہُوا اور قرمطی عقائد کی تبلیغ شروع ہوئی۔ ملتان میں اس زمانے میں ایک بڑا مندر تھا جس میں ایک قدیمی مورتی تھی۔ محمّد بن قاسم نے اس مندر کو برقرار رہنے دیا تھا اور اس کے قریب ایک نئی جامع مسجد تعمیر کی تھی۔ لیکن قرمطیوں نے وہ مسجد تو بند کرادی اور مندر کو گراکر اس کی جگہ ایک دوسری جامع مسجد تعمیر کی۔ ۱۰۰۰ء میں ایک اور قرمطی حاکم ابو الفتح داؤد ملتان کے تخت پر قابض تھا۔ اس نے لاہور کے راجا جے پال کو سلطان محمود غزنوی کے خلاف مدد دی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ غالباً اس لیے کہ بغداد کا عباسی خلیفہ جس کے نام کا خطبہ سلطان محمود غزنوی کی سلطنت میں پڑھا جاتا تھا، فاطمی خلفا کے اقتدار کو ملتان و سندھ سے نیست و نابود کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ سلطان نے ملتان پر حملہ کرکے فتح کرلیا۔ قرمطی یہاں سے بھاگ کر منصورہ گئے اور اس شہر پر قابض ہوگئے، لیکن اٹھارہ سال بعد (سفرِ سومنات سے واپسی پر) محمود نے

---

[1] تاریخ سندھ مرتبہ مولوی ابوظفر ندوی ص ۲۰۰

منصورہ کو بھی فتح کر لیا اور سندھ کا کل علاقہ سُنّی بادشاہوں کے تابع ہو گیا۔

علمی اور تمدنی روابط

عرب اور ہند و پاکستان کے تجارتی تعلقات پرانے ہیں لیکن جب سندھ عرب حکومت کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا تو عربوں اور اس سرزمین کے باشندوں (بالخصوص سندھیوں) کے درمیان گہری راہ و رسم کا دروازہ کھل گیا اور پھر جب عباسیوں نے دمشق کی جگہ بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا تو "ہند و سندھ" سے عربوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا۔ اس قرب سے خلفاے بغداد نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی علمی ترقیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر کیا۔ عرب اس وقت دنیا کی ساری قوموں سے سربلند تھے۔ چین کی سرحد سے اسپین کے ساحل تک ان کا پرچم لہرا رہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ دُنیاوی تفوق حاصل کرنے اور حاصل کر کے اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ "دَعْ مَاکَدَرَ وَخُذْ مَاصَفَا" کے اصول پر عمل ہو اور علمی ترقیاں جہاں کہیں بھی ہوں ان سے خبردار رہا جائے۔ ہندوستانی ان کے محکوم تھے لیکن انھوں نے محکوموں اور ماتحتوں سے سبق سیکھنے سے گریز نہ کیا اور کئی ہندوستانی کتب کو عربی میں منتقل کر کے ان کے مطالب اخذ کیے۔

ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہُوا، سدھانت تھی۔ ۷۷۱ء میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ ہیئت اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت یہ کتاب لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے ایک عرب ریاضی دان نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب علم ہیئت میں تھی اور عربی میں "السند ہند" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کتاب نے عربوں کے علم ہیئت پر گہرا اثر ڈالا۔ ہندو فاضل کے بغداد میں کئی شاگرد ہوئے، جنھوں نے سدھانت کے اصولوں کو اپنے اپنے طرز پر عربی میں منتقل کیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد اس علم کی مشہور یونانی کتاب مجسطی کا عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اور خلیفہ مامون کے زمانے

میں ایک رصد خانہ تیار ہو جانے سے کئی نئی تحقیقات ہوئیں، لیکن ان سب ترقیوں کے باوجود ایک مدت تک عرب ہیئت دان بغداد سے لے کر اسپین تک اس ہندی کتاب سدھانت کے پیچھے لگے رہے۔ اس کے خلاصے کیے۔ اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کی غلطیاں درست کیں۔ اس میں اصلاحیں کیں۔ یہاں تک کہ گیارھویں صدی عیسوی یعنی البیرونی کے زمانے تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اب بھی عربی میں علم ہیئت کی چند اصطلاحیں ایسی باقی ہیں جن میں ہندوستانی علم ہیئت کا اثر نظر آتا ہے۔

علم ہیئت کے علاوہ علم حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں سے اور تمام اہل مغرب عربوں سے مستفید ہوئے۔ عربوں کا بیان ہے کہ انھوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ اس لیے وہ ہندسوں کو حساب ہندی یا ارقام ہندیہ کہتے تھے۔ اقوام یورپ نے یہ ہندسے عربوں سے سیکھے اس لیے وہ انھیں Arabic Numerals یا اعدادِ عربیہ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے عرب لفظوں میں عدد لکھتے تھے۔ پھر حروفِ ابجد میں لکھنے لگے اور اہل مغرب رومن ہندسوں میں (جن کا استعمال بہت پیچیدہ تھا) اعداد کو بیان کرتے تھے۔ یہ امر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ "ارقام ہندیہ" عرب میں کب پہنچے۔ لیکن خیال ہے کہ جو پنڈت سدھانت لے کر بغداد گیا تھا، اسی نے عربوں کو حساب کا نیا طریقہ سکھایا ہوگا۔

علم ہیئت اور حساب کے علاوہ ہندوستانی طب پر عربوں کی خاص نظر تھی اور ہندوستان کے وید عرب میں بڑے مقبول تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید سخت بیمار پڑا اور تمام عرب اطبا اس کے علاج سے عاجز آگئے۔ اس پر ایک شخص نے مشورہ دیا کہ ہندوستان سے منکہ (مانک؟) نامی وید کو بلایا جائے۔ چنانچہ خلیفہ نے سفر خرچ بھیج کر اسے بلوایا اور اس کے علاج سے خلیفہ کو صحت ہوگئی۔ خلیفہ نے خوش ہو کر اسے بہت انعام و اکرام دیا اور

پھر اسے دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ اسی طرح ایک اور ہندوستانی طبیب نے ہارون رشید کے چچازاد بھائی کا جب وہ مرض سکتہ میں مبتلا تھا اور دربار کے یونانی عیسائی طبیب نے اس کی موت کا حکم لگادیا تھا، کامیاب علاج کیا۔ عباسی خلفا کے مشہور برمکی وزرا کے شفاخانے کا افسرِ اعلےٰ بھی ایک ہندوستانی تھا اور وہ دوسرے اطبّا کے ساتھ سنسکرت سے عربی میں کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور تھا۔ علمِ طب کی جو کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں، ان میں سشرت اور چرک کی کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دو کتابیں جڑی بوٹیوں کے متعلق تھیں۔ ایک ہندو پنڈتانی کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا، جس میں عورتوں کی بیماریوں کے علاج درج تھے۔ زہروں کے اثرات اور ان کی پہچان کے متعلق بھی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ جانوروں کے علاج میں چانکیہ پنڈت کی کتاب بھی عربی میں منتقل ہوئی۔ عربوں نے ہندی علم طب سے جس طرح فیض حاصل کیا اس کے اثرات بعض دواؤں کے ناموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً مشہور دوا اطریفل (ترپھل، یعنی تین پھلوں، ہلیلہ۔ بلیلہ اور آملہ کا مرکب) ہے۔ عودِ ہندی۔ قسطِ ہندی۔ تمر ہندی بھی انھی اثرات کی یادگار ہیں۔

حکمت و دانش کی بھی کئی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے کلیلہ و دمنہ اور بوذاسف و بلوہر دنیا کی اہم ترین کتابوں میں سے ہیں۔ کلیلہ و دمنہ پنچ تنتر کا ترجمہ ہے۔ پہلے یہ کتاب سنسکرت سے فارسی میں ساسانیوں کے عہدِ حکومت میں منتقل ہوئی۔ پھر دوسری صدی ہجری میں عبداللہ بن المقفع نے اسے عربی میں ترجمہ کیا۔ اصل فارسی ترجمہ تو کھو گیا، لیکن عربی ترجمہ سلامت رہا اور یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ نظم اور نثر میں کئی دفعہ منتقل ہوئی اور پھر عربی سے دُنیا کی سب مہذب زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ بوذاسف و بلوہر کو کلیلہ و دمنہ کی سی عام شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کی اہمیت اور

بلندی کلیلہ ودمنہ سے بڑھ کر ہے۔ یہ کتاب گوتم بدھ کی پیدائش، تربیت اور حکایات و تمثیلوں کے پیرائے میں ایک جوگی سے دنیا کے سربستہ رازوں پر اس کی گفتگو کا بیان ہے۔ مذہبی حلقوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ عیسائیوں نے اس کو اپنے ایک مذہبی عالم سے منسوب کیا اور مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اسے اپنے امام کی تصنیف بتایا۔ رسائل اخوان الصفا میں جو چوتھی صدی کی نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ تصنیف ہے، اس کتاب کے کئی ابواب ہیں۔

ان کے علاوہ اور کئی کتابیں ہندوستان سے عرب پہنچیں۔ بعض قصّہ کہانیوں کی تھیں، بعض ہندوستان کے جادو منتر، کیمیا اور علم جوتش کے متعلق تھیں۔ مہابھارت کا خلاصہ بھی عربی میں مرتب ہوا۔ دو کتابیں شناق (چانکیہ) اور دیاگھر کی علم حکومت اور فنونِ جنگ کے متعلق تھیں۔ تیسری کتاب کا ترجمہ ادب الملک کے نام سے مرتب ہوا۔

ان تعلقات کے علاوہ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں تصوّف کا آغاز بھی ہندوستانی اثرات کی وجہ سے ہوا۔ بنی امیہ کے زمانے میں کئی ہندوستانی بصرے کے دفترِ خزانہ میں ملازم تھے۔ خلیفہ معاویہؓ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ملکِ شام میں انطاکیہ کے نزدیک اور حجاج نے کاشغر کے قریب بہت سے ہندوستانی آباد کیے۔ پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں: "خلفا کے علاقوں میں سیاہ چشم ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہتے تھے۔ اسلامی حکومت کے مشرقی حصّے یعنی خراسان۔ افغانستان۔ سیستان اور بلوچستان کے لوگ مسلمان ہونے سے پہلے ہندو مذہب یا بدھ مت کے پیرو تھے۔ بلخ میں بدھ مت کا ایک بہت بڑا عبادت خانہ تھا، جس کے مہتمم کا نام برمک تھا۔ عباسیہ خاندان کے مشہور وزراء اسی برمک کی اولاد سے تھے۔"

عربوں نے بدھ مت کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ عرب مصنفین (مثلاً الندیم۔ الاشعری۔ شہرستانی) کی تصانیف میں ہندوستانی مذاہب اور فلسفہ کے متعلق

مُستقل ابواب ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے کے اسلامی لٹریچر میں بُدھ سادھوؤں اور یوگیوں کا ذکر بالوضاحت ملتا ہے۔ ان تعلقات کی بنا پر بعض یورپین مستشرقین کی رائے ہے کہ ان ہندوستانی اثرات کے راستے کئی خیالات جن کا سُراغ قرآن مجید یا احادیث یا سیرت نبوی میں نہیں ملتا۔ تصوّف میں داخل ہو گئے۔

مذہبی حالت

سندھ میں عربوں کی حکومت دیر تک برقرار رہی اور بعض شہروں میں ان کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں جن میں عالم فاضل لوگ بھی تھے، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے عوام میں اشاعتِ اسلام کی کوئی منظم کوشش نہ کی اور سندھ کی بیشتر آبادی کا تبدیلِ مذہب آہستہ آہستہ اور کئی تدریجی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہُوا۔ معاصرانہ تواریخ سے خیال ہوتا ہے کہ دیبل اور دوسری جگہوں پر جہاں عربوں کی نوآبادیاں تھیں علماء کی کمی نہ تھی۔ قاضی عبدالکریم سمعانی (المتوفی ۵۶۲ھ) نے محدثین کا ذکر کیا ہے، جو دیبل میں گزرے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب الانساب[1] میں اپنے معاصرین اور متقدمین کا شہروں اور علاقوں کے انتساب سے ذکر کیا ہے۔ اس میں دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کا بھی ذکر ہے۔ اور سندھ۔ دیبل۔ منصورہ اور لاہور کے کئی بزرگوں کے مختصر حالات درج ہیں۔ مثلاً ابومعشر نجیح سندھی، جو نومُسلم تھے اور مدینہ منورہ میں مدّت تک رہنے کی وجہ سے مدنی کہے جاتے تھے۔ اپنے

---

[1] یہ کتاب گب میموریل سیریز میں شائع ہو چکی ہے۔ نزہت الخواطر جلد اوّل میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[2] سب سے پہلے جس اہلِ تصنیف بزرگ کے سندھ میں آنے کا بالوضاحت نام ملتا ہے۔ وہ ربیع بن صبیح السعدی البصری تھے، جو ۱۵۹ھ میں فوج کے ہمراہ یہاں تشریف لائے۔ کشف الظنون کے مطابق آپ نے تدوینِ حدیث میں حصّہ لیا اور بعض کا خیال ہے کہ آپ ہی اسلام میں پہلے مصنّف و مرتّب تھے آپ تابعی تھے۔ طبقات ابن سعد کے بیان کے مطابق آپ نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ اور جزیرۂ سندھ (گذا) میں مدفون ہوئے۔

زمانے میں فنِ مغازی و سیر کے امام تھے بلکہ مورخین آپ کو ان بزرگوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں، جو فنِ سیر و مغازی کو اولاً قیدِ تحریر میں لائے۔ آپ کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی اور آپ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی نمازِ جنازہ خلیفہ ہارون رشید نے پڑھائی۔

دوسرے نو مسلم محدث رجاء السندھی تھے، جو (ایران میں قیام کی وجہ سے ؟) اسفرائنی کہلانے لگے۔ انھیں بعض بزرگوں نے "رکن من ارکان الحدیث" لکھا ہے۔ ۳۲۱ھ میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے بھی بڑے ممتاز محدث تھے اور بغداد میں درس دیا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے، سندھ میں علمِ حدیث سے دلچسپی شروع سے تھی۔ چنانچہ بیت المقدس کے عرب سیاح عالم ابوالقاسم جو سلطان محمود کی فتوحات سے پچیس سال پہلے سندھ میں آئے تھے۔ اہلِ سندھ کی نسبت لکھتے ہیں: "واکثرہم اصحاب حدیث"۔ علامہ سمعانی نے متعدد محدثین اور علما کا ذکر کیا ہے، جو سندھ کے مختلف شہروں میں تھے۔ ان کے علاوہ ایک عربی سندھی شاعر ابوعطا سندھی کا نام بھی ملتا ہے، جس کے عربی اشعار کے اہلِ عرب معترف تھے۔ بایزید بسطامیؒ کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا ایک اُستاد ابوعلی سندھی تھا۔ نفحات الانس میں مولانا جامیؔ نے شرحِ شطحیات شیخ روزبھان بقلی کے حوالے سے لکھا ہے۔ "بایزید گوید من از ابوعلی علمِ فنا و توحید آموختم و ابوعلی از من الحمد و قل ھو اللہ احد"[1]

لیکن اگرچہ یہ تعلق تصوف کی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ [اور مولانا جامی نے نفحات الانس میں ہند و پاکستان کے فقط چھ سات صوفیہ کا ذکر کرنے کے باوجود ابوعلی سندھی کا ذکر ضروری سمجھا ہے] لیکن اس مختصر بیان کے علاوہ ابوعلی سندھی کی نسبت کوئی دوسری اطلاع نہیں ملتی۔

---

[1] نفحات الانس ص ۶۰

ایک عرب سیاح مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں منصورہ کے متعلق لکھا تھا "میں نے یہاں قاضی ابو محمدؒ منصوری کو دیکھا جو داؤدی (امام داؤد ظاہری کے پیرو) تھے اور اپنے مذہب کے امام ہیں اور ان کی بہت سی اچھی تصنیفات ہیں۔" مقدسی نے سندھی مسلمانوں کی تعریف کی ہے: "ان کے ہاں اسلام کو تازگی حاصل ہے اور علم اور اہلِ علم یہاں بہت ہیں۔" ...

غالباً یہ بیان عرب آبادکاروں کے متعلق ہوگا۔ کیونکہ یہی سیاح آگے چل کر لکھتا ہے: "اہل ذمہ بُت پُوجتے ہیں[1]۔ مسلمانوں میں واعظوں کا وجود نہیں"۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مبلغ اہل ذمہ میں جاکر وعظ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ورنہ جس جگہ اہلِ علم کثرت سے ہوں، وہاں خطیب اور مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے والے واعظ تو ضرور رہیں گے۔

منصورہ کی قابل ذکر ہستیوں میں ایک عرب نوجوان کا بھی بیان آتا ہے، جس نے الور (روہڑی) کے ہندو راجا کی استدعا پر قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

مقدسی نے سندھ کے دوسرے شہروں کی نسبت جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ منصورہ کے باہر علم و فضل کو وہ رونق نہ تھی جو سندھ کے اس قدیم دارالخلافہ[2] کو تھی، جہاں عرب کثرت سے موجود تھے۔ مثلاً مکران کے مستقر الحکومت کی نسبت مقدسی کا بیان ہے:-

> "جو لوگ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، صرف برائے نام مسلمان ہیں۔ کیونکہ ان میں مسلمانوں کی سی کوئی بات نہیں۔ زبان یہاں کی بلوچی ہے .... اچھی اچھی

---

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ مقدسی کی آمد کے وقت ہندوؤں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ پتا نہیں اس کا باعث حکومت کی کمزوری تھی یا یہ فتویٰ کہ بت پرست ذمی نہیں ہو سکتے۔ (تاریخ سندھ از مولوی عبدالحلیم شرر جلد دوم ص ۱۹)

[2] اس وقت سندھ مختلف حکومتوں میں بٹ چکا تھا اور مکران، منصورہ اور ملتان میں جداگانہ حاکم تھے۔ ملتان میں خلیفہ بغداد کے ساتھ ساتھ بعض اوقات شیعہ خاندان بویہ کے فرمانروا عضدالدولہ کا نام لیا جاتا تھا۔

کارواں سرائیں ہیں اور جامع مسجد بھی اچھی ہے۔ مگر عام علم وفضل یہاں کے لوگوں میں نہیں ۔"

اس کے علاوہ سندھ میں بھی ان نیم سیاسی مذہبی اختلافات کا پرتو پڑتا تھا، جنھوں نے ممالک عرب وایران ومصر کو اسمٰعیلی۔عباسی کشمکش کی وجہ سے ایک کارزار بنا رکھا تھا۔ مثلاً اگرچہ مقدسی لکھتا ہے کہ علاقہ ملتان میں امام ابوحنیفہ کے مقلد کثرت سے تھے اور مختلف فرقوں میں کوئی جھگڑا نہ تھا، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں (۳۷۵ ہجری کے قریب) اس علاقے پر اسمٰعیلی اثرات پوری طرح غالب آچکے تھے:۔

"اہلِ ملتان شیعہ ہیں۔ اذان میں حی علیٰ خیر العمل کہتے ہیں اور تکبیر دو دفعہ کہتے ہیں.... .... اور ملتان والوں کا سکہ (مصر کے اسمٰعیلی) فاطمیوں کے مثل ہے.... ملتان میں خلفاے بنی فاطمہ کا خطبہ جاری ہے اور یہاں کوئی حکم بغیر ارمن مصر کے فاطمی خلیفوں کی منظوری کے اجرا نہیں پاتا۔ اہلِ ملتان کے ہدایا اور قاصد برابر مصر میں آتے جاتے رہتے ہیں اور مصر کے اسمٰعیلیوں کا یہاں اس قدر زور ہے کہ بغیر ان کی اجازت کے یہاں کوئی شخص ملتان کے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا (ملاحظہ ہو مقدسی کی احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم کا ترجمہ در اختصار مولٰنا عبدالحلیم شرر کی تاریخِ سندھ میں جلد دوم ص ۱۲۳-۱۲۵)

مقدسی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے سفر کے زمانے میں عرب آبادکاروں کی مذہبی حالت اچھی تھی، لیکن جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے،

لہ عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کی داد دینی چاہیے کہ ان کی بدولت ہمیں اس زمانے کی عام تمدنی حالت اور علمی وادبی مشاغل کے متعلق ایسی تفاصیل حاصل ہیں، جو بعد کے سندھ یا ملک کے دوسرے حصوں (مثلاً بنگالہ) بلکہ خود عہدِ غلاماں کی دہلی کے متعلق موجود نہیں۔ [اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سید ابوظفر ندوی کی تاریخ "سندھ کے حصص"، "سندھ کی تمدنی تاریخ" اور "سندھ کے علما و شعرا"]

ان کی رُوحانی زندگی میں صدیوں تک ایک عجیب کھلبلی مچی رہی۔ فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ فتح سندھ کے جلد بعد خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت میں سندھ کے بعض قبیلے دائرۂ اسلام میں آئے، لیکن اسی کتاب میں لکھا ہے کہ اس کے چند سال بعد کتنے ہی قبیلے اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اس کے بعد سندھ اسمٰعیلی اور قرمطی مبلغوں کا بازی گاہ بنا رہا اور مسعودی کے زمانۂ سفر میں ہی یہ لوگ مُلتان اور مکران پر چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں تبلیغ کے لیے سب سے زیادہ منظم اور باقاعدہ کوششیں انھی لوگوں نے کیں اور ان کے مخلوط مذہبی نظام نے سندھ کے قدیمی مذہب اور اسلام کے درمیان ایک پُل کا کام دیا۔ ان لوگوں کی کوششوں اور عام روحانی بدنظمی سے جو حالت پیدا ہو گئی تھی، اس کا اندازہ سومرہ خاندان کے حالات دیکھ کر ہو سکتا ہے، جن کے نام ہندوانہ تھے اور مذہب کی نسبت یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سمہ خاندان کے زمانے میں اسلامی اثرات غالب آگئے تھے، لیکن اس کے بعض حکمرانوں کے نام بھی ہندوانہ تھے اور یقیناً اُن کے رسم و رواج میں بھی کئی باتیں ہندوؤں کی باقی رہ گئی ہوں گی۔ سمہ خاندان کی ڈیڑھ سو سال کی حکومت کے بعد یہ حالت تھی کہ جب ۱۴۷۲ء میں احمد آباد کے حاکم سلطان محمود بیگڑہ نے سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت بھی کئی سندھی مسلمان برائے نام مسلمان تھے۔ چنانچہ بادشاہ ان کے کئی سرداروں کو جوناگڑھ لے گیا اور انھیں مسلمانوں کے سپرد کیا تاکہ وہ انھیں مذہبِ حنفیہ کے مطابق سُنتِ نبوی کا طریقہ سکھائیں (تاریخِ فرشتہ جلد دوم ص ۱۹۹)

شیخ ابوتراب تبع تابعی
(وفات ۱۷۱ھ)

موجودہ سندھ (بلکہ ہند و پاکستان) میں عہدِ اسلامی کی سب سے قدیمی زیارت گاہ شیخ ابوتراب کا مزار ہے۔ تحفۃ الکرام کے مصنف کا بیان ہے کہ شیخ ایک بزرگ تبع تابعی تھے اور عباسی خلفا کے عہدِ حکومت میں ضلع ساکورہ اور اس علاقے کے مضبوط قلعہ ٹھرہ (؟)۔ شہر بکار (بھکر) اور مغربی سندھ کے بعض مواضعات پر قابض تھے۔

آپ کا مزار زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور اس کے گنبد پر تاریخ بنا ۱۷۱ھ درج ہے۔ (تحفۃ الکرام جلد ۳ صہ ۲۶) مولوی ابوظفر ندوی کا خیال ہے کہ شیخ ابوتراب غالباً "والیِ سندھ کی طرف سے قلعہ دار ہوں گے (بطور کمشنر)" سندھ گزیٹر میں لکھا ہے کہ شیخ ابوتراب نے بھکر کا قلعہ فتح کیا اور بہادری کے دوسرے کارہائے نمایاں دکھائے۔ آپ کا مزار ٹھٹھہ سے کوئی دس میل کے فاصلے پر تحصیل میرپور ساکرو میں موضع گُوجو کے قریب ہے۔ اس پر ۱۷۱ ہجری (یعنی ۷۸۸ عیسوی) کی تاریخ درج ہے (صہ ۹۱) آپ کے مزار پہ ہر مہینے چھوٹا سا میلہ لگتا ہے اور عوامُ الناس نے آپ کو ایک باکرامت پیر بنا دیا ہے۔ مقامی روایت ہے کہ اس علاقے میں تھارنہ نام کا ایک ہندو راجا تھا۔ شیخ نے اپنی کرامت سے اسے اور اس کی فوج کو ایک پہاڑی کی صورت میں منتقل کر دیا۔ یہ پہاڑی بھی زائرین کو دکھائی جاتی ہے۔

ساحلِ ہند پر عربوں کی بستیاں

نوائط محمد بن قاسم کی مہم، جس نے سندھ کی فتح کا سامان کر دیا۔ حجاج بن یوسف کے انتقامی جوش کا نتیجہ تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر عرب مسلمانوں کی سب سے قدیم نوآبادیاں بھی حجاج کی بدولت وجود میں آئیں۔ اگرچہ اس میں حجاج کی کوشش بلکہ خواہش کو دخل نہ تھا۔ حجاج امویوں کا ملازم تھا اور ہاشمیوں کا بدترین دشمن۔ مشہور ہے کہ اس نے پچاس ہزار افراد کو جو فریقِ مخالف کے طرف دار تھے، تیغ ظلم وستم کا شکار بنایا۔ چنانچہ جہاں کہیں وہ جاتا، بنی ہاشم کے طرف دار ترکِ وطن پر مجبور ہو جاتے۔ جب وہ عراق کا گورنر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان[1] آگئی۔ ان میں سے جو لوگ مغربی ساحل (بالخصوص کونکن کے کنارے) پر آباد ہوئے ان کی اولاد کو نوائت (نووارد) یا نوائط، اور جو لوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کر کے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے۔ انھیں لبّی (Labbes) کہتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں ہندو جہاز رانی کو پاپ سمجھتے تھے، اس لیے ان لوگوں نے جہاز رانی اور تجارت سے اپنے نئے وطن میں عزت و وقار حاصل کر لیا۔ اب بھی ساحلی علاقوں کے مسلمانوں میں ان لوگوں کی کثرت[2] ہے۔

---

[1] تاریخ نوائط سے خیال ہوتا ہے کہ سبھی نوائط اس زمانے میں نہ آئے تھے بلکہ بعض نے دوسری صدی ہجری اور بعض نے آٹھویں صدی ہجری میں ترکِ وطن کیا۔ منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ شروع شروع میں ہندو راجاؤں کے احکام کی وجہ سے انھیں بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑا اور اپنے عقائد اور رسوم کے معاملے میں انھوں نے کئی جگہ تقیہ کیا۔

[2] عام طور پر نوائط لبّیوں کو اپنے سے کمتر درجہ دیتے ہیں۔

صُوبہ بمبئی کے کونکن مسلمان جو اپنے تئیں نوائط کی اولاد بتاتے ہیں، بڑے اچھے جہازراں ہوتے ہیں اور دکن کے ساحل پر نوائط تاجروں کی اچھی آبادیاں ہیں۔ نوائط بالعموم شافعی مذہب کے پیرو ہیں اور ان میں سے کئی بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں۔ بالخصوص مخدوم علی مہائمیؒ جن کا مزار بمبئی کے قریب قصبہ مہائم میں ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے علماء کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

لنکا ان لوگوں کے علاوہ جو حجاج کے خوف سے یا بعد میں قرمطیوں اور اسمٰعیلیوں کے مذہبی احتساب سے بچنے کے لیے ہندوستان کے ساحلی مقامات پر پناہ گزیں ہوئے۔ عرب اور ایرانی تاجر کثرت سے ان جگہوں میں آتے رہے۔ نقلِ مکان کا یہ سلسلہ ظہورِ اسلام سے پہلے ہی قائم تھا اور جب عرب اور ایران میں اسلام پھیل گیا تب بھی برقرار رہا۔ لنکا میں تو مسلمانوں کے نشانات ہندوستان سے بھی پہلے ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم سندھ کی مہم کے ضمن میں کہہ چکے ہیں کہ عربوں اور سندھ کے راجا کے درمیان وجہ مخاصمت یہ تھی کہ سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا تھا، جن میں لنکا سے آنے والے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے سوار تھے۔

قدیم عربی کتاب عجائب الہند میں لنکا کی نسبت لکھا ہے کہ جب یہاں کے رہنے والوں کو رسولِ اکرمؐ کی بعثت کا حال معلوم ہُوا تو انھوں نے ایک سمجھ دار آدمی تحقیق حالات کے لیے بھیجا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو رسولِ اکرمؐ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی وصال پا گئے تھے اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ انھوں نے مُتجسّس حالات سے تمام باتیں تفصیل سے کہیں اور وہ اپنی تشفی کے بعد ہندوستان کی طرف واپس پھرا۔ راستے میں وہ تو مر گیا، لیکن اس کا ایک ہندو نوکر صحیح سلامت لنکا واپس پہنچ گیا۔ اُس نے رسول اللہ صلعم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا۔ اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور و طریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں

سوتے ہیں۔" یہ باتیں لنکا والوں کو پسند آئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی محبت بڑھ گئی۔ چنانچہ عجائب الہند کا راوی لکھتا ہے "اب یہ لوگ مسلمان کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں، وہ اسی سبب سے ہے۔"[1]

جزائر مالدیو مالدیو کے مجمع الجزائر میں بھی اسلام اسی زمانے میں پہنچا ہوگا۔ ان لوگوں کے مسلمان ہونے کی عجیب داستان بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں ہر مہینے سمندر سے دیو کی شکل میں ایک بلا آتی تھی اور یہاں کے لوگ اس سے بچنے کے لیے ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگار کر کے سمندر کے کنارے ایک بت خانے میں چھوڑ آتے تھے۔ اتفاق سے یہاں مراکو کے ایک بزرگ شیخ ابوالبرکات بربری مغربی آئے۔ ان کی دعا اور برکت سے یہ بلا ٹلی اور ان کے ہاتھ پر مالدیو کا راجا اور اس کی تمام رعایا مسلمان ہو گئے۔ ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے مالدیو کی مسجد کی محراب پر جسے راجا نے مسلمان ہو کر تعمیر کیا۔ یہ لکھا پایا کہ "سلطان احمد شنوارہ ابوالبرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔"

ساحلِ گجرات ساحلِ گجرات کی بندرگاہوں پر بھی مسلمان تاجروں نے جلد اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں۔ یہ بندرگاہیں گجرات کے ان راجاؤں کے تابع تھیں، جن کا دارالحکومت (موجودہ جام نگر کے پاس) وکبھی پور تھا۔ اور بعد میں نہروالہ پٹن ہوا۔ ان راجاؤں نے مسلمان تاجروں سے بڑی مروت اور انصاف کا سلوک کیا۔ تمام عرب سیاح (مثلاً سلیمان جس نے اپنا سفرنامہ ۸۴۹ء میں ختم کیا۔ مسعودی جو ۹۱۵ء میں کھنبائت آیا) یک زبان ہو کر لکھتے ہیں کہ ان راجاؤں کو عربوں اور مسلمانوں سے بہت محبت ہے۔ (اگرچہ خالص گجراتی (گوجر) راجے عربوں کے دشمن تھے)۔

مشہور کتاب لباب الالباب کے مصنف عوفی نے جو التمش کے زمانے میں

---

[1] منقولہ در "عرب و ہند کے تعلقات" از سید سلیمان ندوی۔

ہندوستان آیا تھا پٹن کے راجاؤں کی انصاف پسندی کی ایک مثال اپنی کتاب جامع الحکایات ولامع الروایات میں درج کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "مجھے ایک دفعہ کھنبائت جانے کا اتفاق ہوا جو سمندر کے کنارے ایک شہر ہے اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے۔ یہاں میں نے سُنا کہ راجا جنک کے زمانے میں مسجد تھی۔ اس کے ساتھ ایک مینار تھا جس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیا کرتے تھے۔ پارسیوں[1] نے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں سے لڑا دیا۔ ہندوؤں نے مینار توڑ دیا اور مسجد کو مع اسّی مسلمانوں کے شہید کر دیا۔ مسجد کے امام نے پٹن جا کر راجا کے درباریوں سے مِل کر داد چاہی لیکن کسی نے دھیان نہ دیا۔ امام نے یہ حال دیکھ کر خود ایک دن موقع پا کر جبکہ راجا ہاتھی پر سوار ہو کر باہر جا رہا تھا، ایک نظم کی صورت میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ راجے نے اس پر اپنے درباریوں سے تو کچھ نہ کہا لیکن انہیں اطلاع دیے بغیر خود بھیس بدل کر کھنبائت گیا اور سب باتوں کی تحقیق کی۔ واپس آ کر اس نے دربار منعقد کیا۔ اپنی تفتیش کا حال بتایا اور حکم دیا کہ پارسیوں اور ہندوؤں میں سے ان سب کو جو مسلمانوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے تھے سزا دی جائے۔ اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوترا (گجراتی سکہ) تاوان ملے تاکہ وہ مسجد اور مینار نئے سرے سے تعمیر کریں۔

ان علاقوں میں ایک دستور تھا کہ مسلمانوں کے معاملات ان کا اپنا آدمی فیصل کرتا تھا جسے ہنرمند کہتے تھے اور بڑے شہروں میں جہاں مسلمانوں کی زیادہ آبادی تھی، راجاؤں نے ہنرمند متعین کر رکھے تھے۔ مسلمانوں نے یہ خاص حقوق (Extra territorial Rights) اپنی حکومتوں میں اجنبی لوگوں کو دیے ہوئے تھے۔ مثلاً ترکی میں یونانیوں۔ روسیوں کے مقدمات ان کی اپنی

---

[1] اصل کتاب میں لفظ "ترسایان" ہے۔ سیّد سلیمان ندوی نے اس سے پارسی مراد لیا ہے۔ پروفیسر ہوڈی والا کا خیال ہے کہ اس سے "جین" مراد ہیں۔

عدالتیں فیصل کرتی تھیں اور مسلمانوں کی سہولت کے لیے گجراتی راجاؤں نے بھی اپنے ملک میں یہ انتظام کر رکھا تھا۔

گجرات کی جن بندرگاہوں پر مسلمان آباد تھے ان میں سے کھنبائت اور صیمور (جو اب صوبہ بمبئی کے ضلع قلابہ میں چاؤل کے نام سے مشہور ہے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسعودی کا بیان ہے کہ فقط صیمور میں دس ہزار مسلمان آباد تھے جن میں کچھ ہندوستانی تھے اور کچھ باہر سے آئے ہوئے تھے۔ گجرات کے راجاؤں کی نسبت وہ لکھتا ہے: "سندھ اور ہندوستان کے تمام راجاؤں میں راجا بلھرا (ولبھ راے) کی طرح اور کسی راج میں عربوں اور مسلمانوں کی اتنی عزت نہیں۔ اسلام اس راجے کی حکومت میں معزز اور محفوظ ہے اور اس ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہیں جو ہر طرح آباد ہیں۔

مالابار اسلامی اثرات کا دوسرا بڑا مرکز مالابار تھا۔ جہاں موپلا مسلمان آباد ہیں۔ تحفۃ المجاہدین میں منقول ہے کہ تیسری صدی ہجری میں جب مسلمان درویشوں کی ایک جماعت لنکا میں حضرت آدم کے نقش قدم کی زیارت کے لیے جا رہی تھی تو بادِ مخالف ان کا جہاز مالابار کے شہر کدنگلور (کدنگانور) کے ساحل پر لے گئی۔ وہاں کے راجا زمورن (سامری) نے ان کی آؤ بھگت کی۔ ان سے ان کے مذہب کا حال دریافت کیا اور ان کے بیان سے اتنا متاثر ہوا کہ جب زائرین لنکا سے واپس آئے تو وہ اپنی حکومت اپنے سرداروں کے سپرد کر کے خود ان کے ساتھ عرب چلا گیا۔ وہاں اس کی تو وفات ہو گئی لیکن مرنے سے پیشتر اس نے عرب درویشوں سے کہا، "ملیبار میں اسلام پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت اور سوداگری کا کام شروع کرو۔" اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر دیا کہ ان پردیسی سوداگروں سے لطف و محبت کا سلوک کرنا۔ چنانچہ انھوں نے نووارد عربوں سے یہی سلوک کیا اور وہاں کثرت سے عرب سوداگر آنے جانے اور رہنے سہنے لگ گئے۔

تحفۃ المجاہدین کے اندراجات میں روایتی عنصر موجود ہے، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر تاراچند اور مالابار گزیٹیر کے مرتب مسٹر انز نے لکھا ہے، ان سے اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کدنگانور کی حکومت ایک پیرامل کی تخت سے دست برداری کے ساتھ ختم ہو گئی، جو غالباً نویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوا۔ ویسے کئی مقامی اثرات ایسے ہیں جن سے تحفۃ المجاہدین کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اب بھی جب سامری گدی نشین ہوتا ہے تو اسے مسلمانوں کے کپڑے پہناتے ہیں اور ایک موپلا اس کے سر پر تاج رکھتا ہے۔ اس کے بعد سامری کو ذات باہر سمجھا جاتا ہے اور نائر یا اعلیٰ طبقے کے ہندو اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ کہا جاتا ہے کہ سامری اپنے اس پیشرو کا جو عرب چلا گیا ہے، نائب ہے۔ جب ٹراونکور کا مہاراجہ تخت نشین ہو کر تلوار حاصل کرتا ہے تو اسے کہنا پڑتا ہے: "میں یہ تلوار اس وقت تک رکھوں گا جب تک میرا چچا جو کہ مکہ معظمہ گیا ہے، واپس نہیں آتا۔"[۱]

قطع نظر اس حکایت کے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مالابار میں عربوں اور مسلمانوں کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ ان کا لقب موپلا ہوا جس کا مطلب ہے دولھا یا بڑا بچہ۔ یہ عزت و احترام کا لقب ہے۔ موپلوں کے سردار تھنگل کو سامری کے ساتھ ساتھ پالکی میں جانے کی اجازت ہوتی تھی اور کئی باتوں میں موپلوں کا درجہ نائروں سے زیادہ تسلیم کیا گیا۔[۲] تحفۃ المجاہدین میں اس حسن سلوک کی ایک واضح وجہ لکھی ہے: "بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیونکہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انہی مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے۔" اس کے علاوہ راجاؤں کو مسلمانوں کی

---

[۱] ملاحظہ ہو ڈاکٹر تاراچند کی کتاب "Influence of Islam on Indin Culture"

[۲] یہ سب تفصیلات ڈاکٹر تاراچند کی کتاب " " " " " " " میں درج ہیں۔

جہاز رانی کے لیے بھی ضرورت تھی، جس سے ہندو متنفر تھے۔ مسٹر آنز کا بیان ہے کہ اُن جہازوں پر کام کرنے کے لیے جن پر سامری کی خوشحالی کا مدار تھا، سامری نے تبدیل مذہب میں خاص طور پر مدد دی۔ اس نے حکم دیا کہ ماہی گیروں کے ہر خاندان میں سے کم از کم ایک لڑکے کی مسلمانوں کی طرح تعلیم و تربیت کی جائے۔ ان تمام اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد معقول اور ان کا اثر وسیع ہو گیا۔ جب ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کھنبائت سے چین کا سفر کیا۔ تو اس نے مالابار کے ساحل پر جابجا مسلمانوں کی معقول آبادیاں دیکھیں۔ ضلع کاروار موبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ہونادر میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمران تھے اور اس شہر میں کئی مسلمان عالم اور اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا، لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انھیں بڑا دخل حاصل تھا۔

مالابار میں آج کل مسلمان کل آبادی کا تیس فی صدی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد گیارہ لاکھ تھی اور مورخین کا قیاس ہے کہ اگر سولھویں صدی میں پرتگیز اسلام کی پُرامن اشاعت کو تلوار کے زور سے نہ روکتے تو اس علاقے کے سب باشندے مسلمان ہو جاتے۔

تحفۃ المجاہدین جس کا سطور بالا میں کئی دفعہ ذکر آیا ہے ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اسے ایک غیرت مند عالم شیخ زین الدینؒ نے اس زمانے (وسطِ عہد اکبری) میں تصنیف کیا جب پرتگیز مالابار کے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑ رہے تھے۔ یہ کتاب بیجاپور کے بادشاہ سلطان علی عادل شاہ اول کے نام معنون تھی اور اس کی تصنیف کا مقصد مسلمان حکمرانوں اور رؤسا کو مالابار کے مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کرنا تھا۔ پہلے تین ابواب میں جہاد کے احکام، مالابار میں اشاعتِ اسلام کا ذکر اور یہاں کی ہندو اقوام کی عادات و مراسم کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں پرتگیزوں کے مظالم کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

تحفۃ المجاہدین کی تصنیف سے شیخ زین الدین کا جو وقتی مقصد تھا وہ تو پورا نہ ہو سکا لیکن اس میں اشاعتِ اسلام کے متعلق جو تفصیلات درج ہیں، وہ بہت کارآمد ہیں اور ان سے اس اثر و اقتدار کا پتا چلتا ہے جو مسلمانوں نے مالابار میں بغیر کسی تیغ و تفنگ کے حاصل کر لیا تھا۔

تحفۃ المجاہدین کے فاضل مصنف شیخ زین الدین معبری کا مزار کالی کٹ کے جنوب میں ایک قصبہ پونانی (فنان) میں ہے، جو اب موپلا مسلمانوں کا علمی اور مذہبی مرکز ہے۔ یہاں نویں صدی ہجری کے اخیر میں سادات مشائخ کا ایک خاندان کوچین سے آکر آباد ہوا، جس کے معزز افراد کو پونانی کے مخدوم یا ملیباری زبان میں "مخدوم جارا تنگل یتنگل" کہتے ہیں۔ ان کو مسلمانانِ مالابار اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ زین الدین الویحیٰ (۸۷۳-۹۲۸ھ) نے پونانی میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی اور اس کے پاس خانقاہ اور مدرسہ بنوایا۔ یہ مدرسہ مالابار کا مشہور مدرسہ ہے اور یہاں مالابار اور کرناٹک سے ہی نہیں بلکہ جزائر مشرقی سے بھی طلبا تحصیلِ علم کے لیے آیا کرتے تھے۔ اور شیخ ابن حجرؒ جیسے بزرگوں نے یہاں درس دیا ہے۔

شیخ زین الدین الویحیٰ علومِ ظاہری اور باطنی میں کامل تھے۔ انھوں نے چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بیعت کر رکھی تھی اور تصوف۔ فقہ۔ مسائل وعظ و تذکیر میں کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، جن میں سے بعض گذشتہ صدی میں مصر میں طبع ہوئی ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک منظوم تصنیف ہدایۃ الاذکیا ہے، جس کی گزشتہ صدی میں دو شرحیں ایک مکہ معظمہ میں اور دوسری جاوا میں تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کے زمانے میں فتنہ پرتگیزی نمودار ہو چکا تھا اور انھوں نے اپنی ایک نظم "تحریض اہلِ ایمان علیٰ جہاد عبدۃ الصلبان" میں پرتگیزوں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب و تحریص دلائی تھی۔

تحفۃ المجاہدین کے مصنف شیخ زین الدین الویحیٰ کے پوتے اور ان کے ہمنام تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے علاوہ چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ارشاد العباد

پند و موعظت کا مجموعہ ہے۔ ایک رسالے میں احادیث کے مطابق ان کوائف کا تذکرہ ہے جو موت کے بعد انسان پر گزرتے ہیں۔ قرۃ العین فی مہمات الدین میں فقہ شافعی کے مسائل ہیں۔ فتح المعین میں خود مصنف نے قرۃ العین کی شرح لکھی ہے۔ یہ سب کتابیں مصر میں کئی بار چھپی ہیں اور فتح المعین پر کئی علما نے مبسوط حواشی لکھے ہیں، جو جاوا سماٹرا میں مروّج و متداول ہیں۔[1]

معبر ایک اور ساحلی خطہ جہاں عرب تاجروں نے پاؤں جمائے مشرقی ساحل پر راس کماری کے شمال مشرق کی طرف کارومنڈل کا علاقہ ہے جسے عرب معبر کہتے تھے۔ اس علاقے میں عربوں کی قدیم آبادیاں ہیں۔ سب سے اہم اور پُرانی بستی مٹنے ولی صوبہ مدراس کا شہر کیالاپٹم ہے۔ یہاں چھان بین کرتے وقت ایک انگریز افسر کو کئی اسلامی سکّے الکتر ہجری سے لے کر پانسو سال بعد تک کے ملے تھے۔ جو لوگ یہاں آباد ہیں، ان کا بیان ہے کہ ان کے آبا و اجداد حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم سے ڈر کر ہندوستان آئے تھے، لیکن غالباً یہ روایت مہاجرین کے سب سے قدیم قافلے کی نسبت صحیح ہے اور بعد میں ان کے بھائی بند دوسرے اسباب کی بنا پر بھی یہاں آئے ہوں گے۔ انھیں عام طور پر لبّی یا لبے کہا جاتا ہے۔

کیالاپٹم کی آبادی گزیٹیر کی رپورٹ کے مطابق تیرہ ہزار کے قریب ہے اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مشہور ہے کہ پانڈیا خاندان کے راجاؤں نے نووارد عربوں کو چار میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا علاقہ دیا اور یہاں انھوں نے اپنی بستیاں آباد کیں۔ انھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور آہستہ آہستہ اس علاقے میں

---

[1] یہ تمام حالات حکیم سید شمس اللہ قادری کی ایک تحریر سے ماخوذ ہیں۔ کاش پونانی کے علما خود اپنے بزرگوں کے حالات لکھیں تاکہ خاص و عام کو معلوم ہو کہ اس مقدس سرزمین نے کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے ہیں، جن کی چمک دمک نے نہ صرف مالابار بلکہ جزائر شرقی یعنی جاوا اور ملایا کی تاریکیاں روشن کیں۔

کافی اثر حاصل کر لیا۔ سرکاری گزیٹر میں کیالائیم کے مسلمانوں کی نسبت لکھا ہے :
"ان کی رسوم اور بسا اوقات ان کے لباس اور شکل و شباہت، بالخصوص ان کی طویل نورانی ڈاڑھیوں اور نکیلے ناک نقشے سے خیال ہوتا ہے کہ گویا یہ لوگ ابھی عرب کی سرزمین سے آئے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی لکھ اور بول سکتے ہیں۔ عربی رسم الخط سے تو اکثر واقف ہیں"۔ یہ لوگ تامل بھی عربی حروف میں لکھتے ہیں اور مقامی مسلمانوں اور ان کی ہندوانہ رسموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مسلمان ضلع ٹنے ولی کی کل آبادی کا چھ فی صدی ہیں اور تین تحصیلوں میں دس فی صدی ہیں۔ اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ پوٹن پودار (Pottanpudar) کی مسجد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ہندو زائرین کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ (گزیٹر) کئی مزارات کا ہندو احترام کرتے ہیں۔ اور کئی مسجدوں کے تبرکات ہندو بڑے شوق سے لیتے ہیں۔

سرکاری گزیٹر میں یہاں کے عرب مسلمانوں کی نسبت لکھا ہے: "رسول اکرمؐ کی ایک حدیث کے بموجب، جس میں انھوں نے اس استفسار کے جواب میں کہ دنیاوی فلاح کس طرح حاصل ہو سکتی ہے، تجارت کی تلقین کی تھی۔ بیشتر مسلمان تجارت پیشہ ہیں۔ اس ضلع میں مبادلہ کی سب سے بڑی منڈی پتانی (Pettai) ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں بہتوں نے ہزاروں روپے کمائے ہیں.... بہت سے لوگ لنکا اور ملایا وغیرہ کے ساتھ تجارت کر کے امیر ہو گئے ہیں.... کئی لوگ لنکا، برما، ملایا اور دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں۔ اور جب کافی دولت جمع کر لیتے ہیں تو واپس آجاتے ہیں.... تجارت کے بعد یہاں کے مسلمانوں کا دوسرا اہم پیشہ بافندگی ہے"۔

سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں معبر پانڈیا راجاؤں کے تابع تھا۔ لیکن عربوں کا یہاں بہت اثر ہو گیا تھا اور راجا کا وزیر اور مشیر ملک تقی الدین بن عبدالرحمٰن ایک مسلمان تھا۔ بحری تجارت بھی زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ عرصہ بعد علاءالدین خلجی کے زمانے میں ملک کافور نے یہ علاقہ فتح کر کے راجا کو حکومت دہلی کا

باجگزار بنایا۔ لیکن جب دکن میں بدامنی شروع ہوئی تو محمد بن تغلق نے یہاں سید حسن کیتھلی کو مقرر کیا جس نے خود مختاری کا اعلان کر کے معبر میں آزاد اسلامی حکومت قائم کی۔ موجودہ اضلاع مدورا۔ ترچناپلی۔ جنوبی ارکاٹ اور ٹنے ولی کے بعض حصے اس ریاست میں شامل تھے۔ یہ حکومت قریب قریب اڑتالیس سال قائم رہی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں وجے نگر کی مضبوط ہندو ریاست دکن میں قائم ہو چکی تھی اور معبر کے دہلی سے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اس لیے معبر کی حکومت دیر پا ثابت نہ ہوئی اور وجے نگر کے راجاؤں نے پہلے معبر کا شمالی اور پھر جنوبی حصہ فتح کر لیا اور ۷۸۰ھ (۱۳۷۸ء) میں معبر کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

جب وجے نگر کے راجے معبر کے مسلمان بادشاہوں پر غالب آئے تو ہنود نے بڑی خوشیاں منائیں اور مندروں اور دھرم شالاؤں میں بڑے جوش و خروش سے فتح کے شادیانے بجائے گئے۔ اس واقعہ کی نسبت تاریخ فیروز شاہی (عفیف) میں لکھا ہے (ترجمہ)

ہمسایہ سردار باکن (بکارائے) نے معبر پر حملہ کیا۔ تمام معبر اس کے قبضے میں آگیا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ مسلمانوں پر بے حد ظلم کیا گیا[1]۔

اس پر ایک ہندو مورخ لکھتا ہے:۔

ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان دشوار گزار پہاڑیوں اور جنگلوں میں اپنے مذہب کو چھپا کر رہنے لگے[2]۔

اس کے بعد معبر کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ عجب نہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب ہو جانے سے عربوں کو جو حصہ بحری تجارت میں حاصل تھا وہ بھی کم ہو گیا ہو۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳ کی عبارت قدرے مختلف ہے۔
[2] منقولہ در تاریخ جنوبی ہند مولفہ محمود میسوری ص ۲۴۷

شرق الہند میں اشاعتِ اسلام

اسی زمانے میں اسلام نے جاوا سماٹرا اور ملایا میں فروغ حاصل کیا۔ ہالینڈ کے مستشرقین کا خیال ہے کہ ان ممالک میں عربوں نے نہیں بلکہ ان مسلمانوں نے جو شاید عرب نسل سے تھے، لیکن ہندوستان میں بس چکے تھے، اشاعتِ اسلام کی۔ عجب نہیں کہ جب وجے نگر نے معبر کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا اور مسلمانوں پر ظلم وستم کا آغاز کیا تو بعض مسلمان ترکِ سکونت کر کے جزائر شرق الہند میں جا بسے ہوں اور وہاں اسلام کی ترقی اور رونق کا باعث بن گئے ہوں۔

ملایا، جاوا اور دوسرے علاقوں میں جو شواہد ملتے ہیں، ان سے گجرات، ملابار اور معبر ہی نہیں بلکہ بنگالہ کے ان علاقوں سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے تمام ساحلی علاقے کشتیوں اور بادبانی جہازوں کی آمدورفت سے منسلک تھے۔ جن کے کشتی بان ہی نہیں بلکہ تجارت پیشہ مسافر بھی مسلمان تھے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ان علاقوں میں تجارتی بلکہ ثقافتی اور دینی تعلقات قائم ہوئے اور جزائر شرق الہند میں اسلام کی اشاعت کا سامان ہوا۔

غالباً گجرات، مالابار اور معبر کی طرح چٹاگانگ کے پاس (موجودہ مشرقی پاکستان میں) مسلمانوں کی بستیاں تھیں۔ چٹاگانگ کے گردونواح اور قریبی جزائر (مثلاً سندیپ) میں بنگالی کی جو صورت رائج ہے، اس میں عربی اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اس علاقے میں عربی رسم الخط کو بنگال کے باقی حصوں سے زیادہ اہمیت رہی ہے۔ یہاں قدیم بنگالی کتابوں (مثلاً علاؤل کی تصانیف) کے جو مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں کئی عربی رسم الخط میں ہیں۔ (یہ محض اتفاق نہ تھا کہ بنگالی کو حروفِ قرآن میں لکھنے کی جو تحریک ایک زمانے میں شروع ہوئی تھی، اس کا مرکز چٹاگانگ تھا)۔ یہ عربی اثرات یقیناً عرب تاجروں اور ملاحوں کی آمدورفت کا نتیجہ تھے اور اس ساحل پر عربوں کی مقامی نوآبادیاں قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہیں، لیکن افسوس کہ تاریخ ان کے متعلق خاموش ہے۔ اس علاقے میں

عربوں کی آمد کا سب سے پہلا سراغ برما کے علاقے اراکان کی مقامی تواریخ میں ملتا ہے - جن سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے ایک راجا کے عہدِ حکومت میں (جو ۸۱ء میں تخت نشین ہُوا) عربوں کے کئی جہاز سمندر میں طغیانی کی وجہ سے رمری کے قریب (جو چٹاگانگ سے چودہ میل جنوب میں ہے) ٹوٹ پھوٹ گئے اور مسافروں کو اراکان کے اندرونی علاقے میں بسایا گیا - بعد میں اراکان کے ساحل پر اسلامی اثرات بہت بڑھ گئے - چنانچہ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ تیرھویں صدی میں آسام سے ملایا تک کے ساحل پر جا بجا مسجد نما عمارتیں تھیں، جنھیں بدر مکان (یا بدر مقام) کہا جاتا تھا - ہاروے نے وضاحت کی ہے کہ ان عمارتوں کو نہ صرف مسلمان بلکہ چینی اور بُدھ مت کے پیرو بھی احترام سے دیکھتے - ان کا انتساب بدر اولیا یا بدر الدین اولیا سے تھا، جن کا چٹاگانگ میں چلہ خانہ بتایا جاتا ہے - لیکن جو بہار میں دفن ہیں اور جن کے ملاح اور کشتی بان خاص طور پر معتقد تھے[1] -

---

[1] اس موضوع پر ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کے جرنل (جلد ہفتم شمارہ ایک) میں ایک تفصیلی مضمون چھپا ہے

غزنی و لاہور

امیر ناصر الدین سبکتگین
وفات ۹۹۷ء

محمدؐ بن قاسم نے دو سال کی مُدت میں سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کر لیا اور عجب نہ تھا کہ اگر اُسے مہلت ملتی تو یہ قسمت سے محروم "ابن قاسم ہندوستان کے دُور دراز حصّوں میں فتح کے پھریرے لہراتا" لیکن عربوں کی قبائلی اور شخصی نزاعیں سدِ راہ ہوئیں اور چار سال کے اندر یہ جوان سال سپہ سالار واپس بُلا لیا گیا۔

محمدؐ بن قاسم نے صحرائے سندھ میں جو سرچشمۂ فیض بہایا تھا وہ تو خشک نہ ہُوا۔ لیکن اس کے عرب جانشین اسے وسعت اور گہرائی نہ دے سکے۔ اور جو نہریں اُس چشمۂ فیض سے نکلی تھیں، وہ ملتان تک آتے آتے خشک ہو گئیں۔ پنجاب اور شمالی ہند کے باقی علاقوں میں آبیاری ان لوگوں نے کی جو عرب سے نہیں بلکہ افغانستان سے آئے تھے اور انھیں بھی یہاں پہنچتے ایک زمانہ لگا۔

سندھ اور ملتان ۷۱۳ء میں فتح ہوئے تھے۔ اس کے بعد کوئی ڈھائی تین سو سال تک راجپوت شمالی ہندوستان میں بے کھٹکے حکومت کرتے رہے اور باہر سے کوئی مسلمان تلوار کا دھنی ہندوستان میں نہیں آیا۔ ۹۸۰ء کے قریب امیر سبکتگین نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کی طرف نظر کی اور بعض اہم فوجی مقامات فتح کر کے آنے والوں کا راستہ صاف کیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ محمدؐ بن قاسم کی مہم کی طرح اس نے بھی کسی سوچی ہوئی سکیم کے مطابق نہیں بلکہ واقعات سے مجبور ہو کر یہ قدم اُٹھایا۔

جب امیر سبکتگین ۹۷۶ء میں غزنی میں تخت نشین ہُوا، اُس وقت کابل اور پشاور کا علاقہ پنجاب کے راجا جے پال کے زیرِ نگین تھا۔ افغانستان میں

دونوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ جے پال کو سبکتگین کی کشورکشائی ناگوار ہوئی تو وہ ایک لشکر لے کر غزنی کی طرف بڑھا۔ لمغان اور غزنی کے درمیان ۹۷۹ء میں جنگ ہوئی۔ جس میں جے پال نے شکست کھائی اور اسے صلح کے لیے ملتجی ہونا پڑا۔ سبکتگین کا بیٹا محمود جو اپنے باپ کے ہمرکاب تھا صلح کے خلاف تھا لیکن جب جے پال نے یہ پیغام بھیجا کہ ہم شکست کی صورت میں اپنے مال و دولت، نقد و جنس کو جلا کر خاک کر دیتے ہیں اور اپنے بال بچوں کو اپنے ہاتھ سے فنا کر کے بے جگری سے لڑتے ہیں تو محمود بھی خاموش ہو گیا۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ جے پال اپنے ملک میں واپس جا کر گھوڑے، ہاتھی، مال و جواہر جن کی تعداد عہد نامہ میں معین ہوئی تھی۔ امیر سبکتگین کے کارندوں کے ہاتھ غزنی بھیجے گا۔

لاہور پہنچ کر جے پال اپنا وعدہ بھول گیا بلکہ امیر کے آدمیوں کو قید کر لیا۔ سبکتگین کو یہ پتا چلا تو اُسے بڑا طیش آیا۔ اُس نے جگہ جگہ سے فوجیں جمع کیں اور جے پال کے علاقے پر بلہ بول دیا۔ امیر کو بہت سا مال و اسباب اور بے شمار لونڈی غلام ہاتھ آئے۔ لیکن جے پال بھی غافل نہ بیٹھا تھا۔ اس نے چٹھیاں بھیج کر ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں سے مدد مانگی۔ اور جب پشاور کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کی منتخب فوجیں راجا جے پال کے ہمرکاب تھیں۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب شمالی ہندوستان کے تمام حکمرانوں نے متحد ہو کر مسلمان حملہ آوروں کو روکنا چاہا اور ہندوستانی فوج کی اس قدر کثرت تھی کہ سبکتگین کے سردار بھی گھبرا گئے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جب مخالف فوج کا اندازہ لگانے کے لیے سبکتگین ایک پہاڑی پر چڑھا تو اُس نے دیکھا کہ مقابل میں ایک دریا ہے بے پایاں۔ اور ایک لشکر ہے، مثل مور و ملخ کے فراواں۔ لیکن سبکتگین نے ہندوستانی فوجوں کے ہاتھ دیکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کی کثرت سے مرعوب نہ ہوا اور اس نے اپنے تئیں مانند ایک قصاب کے سمجھا جو

گوسفندوں کی کثرت سے نہیں گھبراتا۔ اور مثل ایک شاہین کے تصور کیا جو کلنگوں کی صف سے ہراساں نہیں ہوتا۔"[1] لیکن اس کے باوجود وہ بھانپ گیا کہ خاص داؤ پیچ اور نئے طریقے سے لشکر آرائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک تو اُس نے اپنے سرداروں کو بُلاکر جہاد و غزا کی ترغیب دی اور بہادروں کے کارنامے سُناکر ان کے دل بڑھائے اور دوسرے اپنے لشکر کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کیا تاکہ جب ایک دستہ دشمن سے لڑتا لڑتا تھک جائے تو پانسو تازہ دم سپاہیوں کا دُوسرا دستہ مُقابلے میں ڈٹ جائے اور دشمن پر اپنی کمزوری عیاں نہ ہو۔ جب کچھ دیر اس طرح لڑائی جاری رہی اور دشمن کی صفیں ڈھیلی پڑگئیں تو تمام دستوں نے یکبارگی پورے زور کا حملہ کیا اور اس انبوہِ عظیم کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔

جے پال نے غزنی پر حملہ کرکے بھڑوں کے چھتّا میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ "مَیں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا" سبکتگین پر ہندو راجاؤں کی کمزوری پوری طرح ظاہر ہوگئی تھی۔ اُس نے جے پال کو دو ایک اَور شکستیں دے کر کابل اور پشاور کا سارا علاقہ اس سے چھین لیا۔ اور پشاور میں اپنا ایک نائب معیّن کرکے اسے مقبوضاتِ غزنی میں داخل کر لیا۔

سبکتگین نے جے پال کے خلاف جو اقدامات کیے، ان کا عملی سبب جے پال کی اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی تھی۔ لیکن اس زمانے میں غزنی اور اس کے گردونواح میں ایک مذہبی اور احیائی تحریک زوروں پر تھی۔ اس کا اثر بھی سبکتگین اور اس کے جانشین محمود غزنوی پر ہُوا ہوگا۔ یہ تحریک کرامیہ فرقے کی تحریک تھی، جس کے معاصرانہ راہنما ابوبکر اسحاق کا سبکتگین بڑا مداح تھا بلکہ ایک بیان کے مطابق پیرو تھا۔ ابُوبکر اسماعیلی فرقے کا بڑا سخت مخالف تھا اور غیر مسلموں میں بھی اس کی تبلیغی کوششیں زوروں پر تھیں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے" کہ اس نے پانچ ہزار یہودیوں آتش پرستوں وغیرہ کو مسلمان کیا۔ اس کی وفات ۹۹۳ء میں ہوئی۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل صہ ۲۰

اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود غزنوی کو اسماعیلیوں کے خلاف مصروف کار رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ بعد میں اس فرقہ کی انتہا پسندی کی وجہ سے سلطان محمود نے اس کی سرپرستی ترک کر دی۔ لیکن ایک زمانے میں وہ بھی اس کے راہنماؤں سے متاثر رہا تھا۔ عجب نہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے ملتان اور منصورہ کے اسماعیلیوں کے خلاف جو قدم اٹھایا یا اس نے اور اس کے والد سبکتگین نے ورے ہند کے غیر مسلم راجاؤں کے متعلق اپنے پیروؤں سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اس میں اس فضا کو بھی دخل ہو، جو کرامیہ فرقے کے راہنماؤں نے غزنی میں پیدا کر رکھی تھی۔ بعد میں سلطان محمد غوری اور اس کا بھائی بھی (غور کے عام باشندوں کی طرح) ایک زمانے تک اس فرقے سے متعلق رہے لیکن بالآخر اس فرقے کو زوال آیا اور منگولوں کے حملے کے بعد اس کا نام سننے میں نہیں آتا۔

عام طور پر اوراق تاریخ میں سبکتگین کا نام اس جلی قلم سے نہیں لکھا جاتا جس سے اس کے فاتح اور بلند اقبال بیٹے سلطان محمود غزنوی کا نام روشن ہوتا ہے۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ باپ کا مرتبہ بیٹے سے بہت کم نہیں اور ٹھوس نتائج میں تو شاید سبکتگین کو محمود پر فوقیت حاصل ہے۔ امیر سبکتگین کا سب سے بڑا کام تو یہ تھا کہ اس نے ہندوستان کی سرحد پر غزنی میں ایک ایسا اہم عسکری اور حکومتی مرکز قائم کیا جس نے برصغیر کی فتح کے لیے ایک Base (فوجی صدر کیمپ) کا کام دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کابل سے لے کر پشاور تک کا علاقہ فتح کیا اور اپنے تدبر اور حسن انتظام سے وہاں کامیاب حکومت قائم کر کے اور راستوں اور قلعوں کی درستی سے آیندہ فتوحات کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان کے تمام راجاؤں کو شکست دے کر اس نے اس عسکری نظام پر کاری ضرب لگائی جو شمالی حملہ آوروں کو روک سکتا ہے ؎

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہروان است مرا

سبکتگین کی فتوحات میں وہ ڈرامائی عنصر نہیں جو سلطان محمود غزنوی کے حملۂ سومنات یا اس طرح کے دوسرے کارناموں میں نظر کو خیرہ کرتا ہے۔ لیکن نتائج کے لحاظ سے وہ بھی کم وقعت نہیں۔

سُلطان محمُود غزنوی
وفات ۱۰۳۰ء

سبکتگین نے ۹۹۷ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ محمود تخت نشین ہُوا، جس کی فتوحات کا سلسلہ سکندرِ اعظم کی یاد دلاتا ہے۔ اس نے جے پال کے خلاف لڑائی جاری رکھی اور ۱۰۰۱ء میں اٹک کے قریب اسے شکست دی۔ جے پال کے بعد اس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہُوا۔ اُس نے بے سمجھی سے ۱۰۰۵ء میں جب محمود ملتان کے اسمٰعیلی حاکم ابوالفتح داؤد کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہا تھا، محمود پر حملہ کر دیا۔ لیکن شکست کھائی اور کشمیر بھاگ گیا۔ اگلے سال محمود نے انند پال کو "مخالفت کی مزید سزا" دینے کا ارادہ کیا اور پشاور کے قریب اس کے عظیم[1] لشکر کو شکست دے کر ہندوستان میں داخل ہُوا اور کانگڑہ[2] تک چڑھ آیا۔

---

[1] غزنویوں اور ہندوستانی راجاؤں کے درمیان یہ دوسرا بڑا معرکہ تھا اور انند پال کے لشکر کے ساتھ نہ صرف اجمیر، قنوج اور کالنجر بلکہ اجین اور گوالیار کی فوجیں تھیں۔ اور افغان حملہ آوروں کے خلاف نہ صرف راجاؤں میں بلکہ عوام میں بھی بڑا جذبۂ مخالفت تھا۔ بالخصوص گکھڑوں میں جن کی عورتوں نے زیور بیچ بیچ کر لشکریوں کی مدد کی اور جو غریب تھیں اُنھوں نے چرخہ کات کر اور مزدوری کر کے پیسے بچائے اور ان سے چیزیں خرید کر لشکریوں کو بھیجیں۔ (فرشتہ جلد اوّل ص ۳۶)

[2] نگر کوٹ (کانگڑہ) اس زمانے کا اہم تیرتھ تھا اور اسے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل تھی جو قدیم یونان میں ڈیلفی دارالاستخارہ (Delphic oracle) کی تھی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ہندو بڑے اور کٹھن کام شروع کرنے سے پہلے نگر کوٹ کے بُت سے مشورہ لیتے تھے اور اگر اجازت ملتی تو اس کام کو شروع کرتے ورنہ اس سے دست کش ہو جاتے۔ اس کا تو کہنا ہے کہ اس کے زمانے میں (یعنی سترھویں صدی عیسوی تک!) بعض لوگ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے وہ بھی اس بُت سے مشورہ کرتے اور اس بُت خانے میں بقصدِ ثواب بڑے چڑھاوے بھیجتے۔ توزکِ جہانگیری سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور متھرا، قنوج اور سومنات وغیرہ سے بہت سا مالِ غنیمت لے کر واپس ہُوا۔ محمُود نے ان مقامات پر کوئی حکومت قائم نہ کی لیکن اخیر میں لاہور کی حکومت اپنے غلام ایاز کو دے گیا۔ محمُود نے ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔

محمُود کی نسبت ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:۔

"محمُود کی زندگی کی زبردست خواہش فتح اور حکومت کی توسیع تھی اور اسی میں اس نے ساری زندگی صرف کر دی۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ اس نے وسطِ ایشیا اور فارس کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا اور عباسی خلیفہ بغداد کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ۱۰۳۰ء میں مر گیا۔ اس نے سپاہیانہ کامیابی اور لوٹ مار کے لیے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ کئی مندروں کو لُوٹا اور جلایا لیکن اس لیے کہ ان میں زر و مال جمع تھا۔ اس نے کسی کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبُور نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے متعدد ہندو افسروں اور سپاہیوں کو اپنی فوج میں ملازم رکھا، جو اس کے لیے وسطِ ایشیا اور ایران میں لڑتے رہے۔"[۱]

محمُود کی فوج میں جن ہندو سپہ سالاروں نے عرُوج حاصل کیا، ان میں سوبندر رائے، تلک اور ناتھ خاص طور پر مشہور ہیں۔ سوبندر رائے پر حکومت کو اس قدر اعتماد تھا کہ جب محمود کی وفات کے فوراً بعد مغربی ولایت کے شہر بست میں بغاوت ہوئی تو محمود کے جانشین نے سوبندر رائے کو اس نازک موقع پر بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا اور وہ بڑی بہادری سے لڑتا ہُوا میدانِ جنگ میں کام آیا۔ ناتھ کی وفاشعاری بھی اسی قسم کی تھی۔ اسے مسعُود نے نیالتگین کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور جب وہ کئی فتوحات کے بعد لڑائی میں مارا گیا تو مسعُود کو اتنا رنج ہُوا کہ اس نے تین روز تک کھانا نہ کھایا اور

---

[۱] مختصر تاریخ اہلِ ہند ص ۱۲۷

اس کی جگہ اس کا ہم مذہب (تِلک) نامزد کیا۔

سلطان محمود نے نہ صرف فتح ممالک اور جمع اموال میں کمال حاصل کیا بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانہ بھر کے منتخب شعرا اور علما و فضلا جمع کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعرا کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا، ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانروا کو میسر نہیں ہوا۔ ان شعرا کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دیے اور نہ صرف سیاسی تاریخ میں بلکہ فارسی ادب کے اوراق میں بھی محمود اور اس کے دربار کو بلند جگہ مل گئی۔ جن شعرا نے محمود کے دربار میں شہرت پائی۔ ان میں فردوسی، عنصری، عسجدی اور فرخی خاص طور پر مشہور ہیں۔ فردوسی کے سوا باقی تین شعرا نے ایسے اشعار لکھے ہیں، جن میں سلطان کی ہندوستانی فتوحات کی طرف اشارہ ہے۔ عسجدی شاید سلطان کی مہم سومنات میں شریک بھی تھا اور اس نے اس کے متعلق ایک زبردست قصیدہ لکھا تھا جس کے چند شعر محفوظ ہیں۔ مطلع تھا ؎

تا شاہِ خسرواں سفرِ سومنات کرد
کردارِ خویش را علمِ معجزات کرد

اس سے بھی پُرزور قصیدہ فرخی کا ہے، جو اس نے فتح کی یادگار میں لکھا ؎

فسانہ گشت و کہن شد حدیثِ اسکندر
سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر

اور پھر آگے چل کر سفرِ سومنات اور فتح کی تمام تفصیلات نظم کی ہیں۔ فرخی نے محمود کی وفات پر جو مرثیہ لکھا، وہ بھی فارسی شاعری میں ایک خاص چیز ہے ؎

شہرِ غزنیں نہ ہمانست کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار

کوچہا بینم وسر تا سر کوئے بینم
ہمہ پر جوشش و جوشش در و پر خیل و سوار

مہتراں بینم، بر روئے زناں ہمچو زناں
چشمہا کردہ ز خوں تا بہ برنگِ گلنار

ملک امسال مگر باز نیامد ز غزا
دشمنے روئے نہاد است دریں شہر و دیار

سیر گشتہ خوردہ مگر دی و بخفتہ است امروز
دیر تر خاستہ مگر رنج رسیدش زخمار

خیز شاہا کہ رسولانِ شہاں آمدہ اند
ہدیہ ہا دارند آوردہ فراواں و نثار

سلطان محمود ایک عجیب دل گردے کا مالک اور ایک عظیم الشان قوتِ ارادی کا انسان تھا۔ ۱۰۲۹ء میں اسے بخار رہنے لگا، جس نے تپ دق کی صورت اختیار کر لی، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے معمولات میں فرق آنے نہ دیا۔ دربار اور بار یابی کا سلسلہ اسی طرح برقرار رکھا۔ خراسان سے سلجوقوں کو نکالا۔ رے کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۱۰۲۹ء کا موسم گرما خراسان میں اور اگلا موسم سرما بلخ میں گزارا، لیکن اب صحت نے بالکل جواب دے دیا اور ۲۲ اپریل ۱۰۳۰ء کو اسے غزنی واپس آنا پڑا۔ سات آٹھ روز بعد قضا کا پیغام آ پہنچا۔

بستر مرگ پر بھی سلطان نے اُسی بلند ہمتی اور قوتِ ارادی کا ثبوت دیا جس کا مظاہرہ ہندوستان کے معرکوں میں ہوتا تھا۔ اپنی طویل بیماری میں اُس نے بسترِ علالت پر دراز ہونا قبول نہ کیا۔ وہ دن اور رات تکیوں کا ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا اور اسی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

محمود کے جانشین

محمود کی وفات ۱۰۳۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد مسلمان شاہی خاندانوں کی قدیم روش کے مطابق بیٹوں میں جنگ ہوئی۔ بالآخر مسعود غالب آیا۔ اسے خوش قسمتی سے خواجہ احمد میمندی جیسا قابل وزیر ملا تھا، لیکن اسے بہت دن حکمرانی نصیب نہیں ہوئی۔ لاہور میں اس کا نائب نیالتگین تھا اور اس کی مدد کے لیے (غالباً شرعی امور کی نگرانی کے لیے) قاضی شیرازی مقرر تھے۔ ان دونوں کی بن نہ آئی۔ بالآخر قاضی شیرازی سے کہا گیا کہ وہ ملکی معاملات میں دخل نہ دیں، لیکن قاضی نے غزنی میں اپنے کارندے بھیج کر نائب کے خلاف شکایت کی کہ وہ اپنے تئیں سلطان محمود غزنوی کا بیٹا بتاتا ہے اور بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر مسعود نے تلک کے زیرِ قیادت نیالتگین کے خلاف فوج بھیجی اور نیالتگین شکست کھا کر

مارا گیا۔ اس کے بعد مسعود نے خود ہندوستان آ کر ہانسی کا قلعہ فتح کیا۔ لیکن اس کی عدم موجودگی میں سلجوقیوں نے غزنی کا علاقہ تباہ و برباد کر دیا اور اس کے ترکی و ہندو غلاموں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اس کے بھائی محمدؒ کو تخت نشین کیا۔

اس کے بعد غزنی میں کئی کمزور اور بے اثر حکمران ہوئے، جن کے نام صفحاتِ تاریخ میں اس لیے آجاتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کی طرح وہ بھی کسی مشہور شاعر کے مُربّی تھے۔ ان میں سے ایک بہرام شاہ تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کی نسبت گزشتہ صدی کی ایک کتاب حدیقۃ الاولیا میں تحفۃ الواصلین کے حوالے سے ایک اندراج نقل ہُوا ہے جس میں ممکن ہے بعض جُزئیات غلط ہوں، لیکن جو ایک حقیقی واقعہ کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مؤلف مزار شہید گنج (واقعہ محلہ سادھواں لاہور) کا ذکر کرتا ہُوا لکھتا ہے:-

"شاہ بہرام کے وقت آپس میں سلاطین غزنویہ اور سلاطین غور کے فساد ہُوا تو پنجاب کی حکومت بہت ضعیف ہوگئی۔ اس وقت راجا انگ پال راجا جے پال کا بیٹا(؟) راجگان ہند کا لشکر لے کر لاہور پر چڑھ آیا۔ چھ ماہ تک شہر والے لوگ لڑتے رہے۔ ہر چند غزنی سے مدد طلب کی۔ کوئی لشکر نہ آیا۔ آخر شہر فتح ہُوا۔ ہندوؤں نے موقع پا کر بہت سے مسلمان قتل کر ڈالے۔ اس محلّے میں بھی قتلِ عام ہُوا۔ اور بقدر دو ہزار نعش کے مسلمان اس جگہ دفنائے گئے۔ اس وقت ہندوؤں نے دخل پا کر مسجدیں گرا دیں اور بُت خانے دوبارہ قائم کر دیے۔ چندے عملداری ہندوؤں کی رہی۔ پھر جب غزنی سے لشکرِ قاہرہ لاہور آیا تو راجا انگ پال

---

[1] کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے (جلد سوم صفحہ ۳۳) کہ سلطان مودود غزنوی (متوفی ۱۰۴۹ء) کے زمانۂ حکومت میں دہلی کے راجا مہی پال نے مسلمانوں سے ہانسی، تھانیسر اور کانگڑہ کے علاقے چھین لیے بلکہ لاہور پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا، لیکن مسلمانوں نے جم کر مقابلہ کیا اور مہی پال کو ناکام واپس جانا پڑا۔ غالباً جو مسلمان اس محاصرے اور محاربے کے دوران میں شہید ہوئے، انھیں گنج شہیداں میں دفن کیا گیا ہوگا۔

مارے خوف کے بھاگ گیا۔

بہرام کا بیٹا خسرو شاہ علاء الدین غوری سے شکست کھا کر غزنی چھوڑ کر ہندوستان آگیا۔ اور جب اس کے بیٹے خسرو ملک کو سلطان محمد غوری نے ۱۱۸۶ء میں شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا تو غزنویوں کا سارا علاقہ غوریوں کے زیر نگیں آگیا اور غزنویہ خاندان کا خاتمہ ہُوا۔

علم و ادب

غالباً غزنویہ دَور کا سب سے زیادہ قابلِ تعظیم عالم البیرونی تھا جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ اس نے کتاب الہند محمُود کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد مرتب کی اور اپنی دوسری کتاب قانونِ مسعودی محمود کے جانشین مسعُود کے نام معنون کی۔

محمود کی طرح مسعود بھی اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اور اس کے دربار سے کئی اہلِ کمال وابستہ تھے۔ لیکن اس زمانے کی ایک قابلِ ذکر تبدیلی لاہور اور اہلِ لاہور کا علم و فن میں عُروج تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی مختلف فتوحات سے ایک فائدہ یہ ہُوا کہ لاہور میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ اور چونکہ یہاں غزنی سے کئی اہلِ علم بسلسلۂ ملازمت آ کر آباد ہوئے، اس لیے ان کے فیض سے یہ شہر بھی اسلامی علوم اور مذہبِ اسلام کی اشاعت کا مرکز ہو گیا۔ شروع شروع میں تو یہاں اہلِ علم کا قحط تھا۔ چنانچہ جب داتا گنج بخشؒ یہاں تشریف لائے تو انھیں غزنی کی صحبتیں یاد آتی تھیں اور انھوں نے اپنی ایک کتاب میں شکایت کی ہے کہ میں یہاں آ کر ناجنسوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ لیکن ابراہیم غزنوی کے زمانۂ حکومت (۱۰۵۹ء - ۱۰۹۸ء) میں لاہور علمی سرگرمیوں کا گہوارہ ہو گیا۔ اور بقول عوفی علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ ابراہیم کا ایک وزیر ابونصر فارسی جو ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے ادیب مشہور ہے، علم و فضل کا مربی تھا۔ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ قائم کی جو اہلِ علم اور دوسرے بزرگوں کی جائے پناہ تھی۔ اور آہستہ آہستہ لاہور بلخ و بخارا اور دوسرے ممالک سے اہلِ علم کھچ کر آنے لگے تاریخ سلاطین آلِ غزنیں

کا مصنف لکھتا ہے :-

"و جمق بوق تشنگانِ علوم از سائر بلادِ ہند و ولایتہاے کاشغر و ماوراءالنہر و عراق و بخارا و سمرقند و خراسان و غزنی و غیر ذالک ازاں خیراتِ منبع منتفع مے شدند چنانکہ یک آبادانی نو در حدودِ لاہور پدید آمد۔"

ابراہیم غزنوی کے بعد اس کا بیٹا سلطان علاءالدین مسعود تخت نشین ہُوا۔ اس کے دربار کی ایک قابلِ ذکر ہستی مسعود سعد سلمان ہے، جو پاکستان کا پہلا فارسی شاعر تھا۔ ایرانی تذکرہ نویسوں نے تو اسے ہمدانی اور جرجانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ خود اپنی جائے پیدائش لاہور بتاتا ہے اور وہاں سے دُور ہونے پر افسوس کرتا ہے۔

مولدم لاہور و از لاہور دُور
دیکھ اے لاہور بے تو کے صبور

اس کے والد خواجہ سعد سلمان بعہد سلطان مسعود شہید بسلسلہ ملازمت لاہور آکر آباد ہوئے تھے۔ جب ۴۳۶ھ؁ میں سلطان مذکور نے شہزادہ مجدود کو والی ہند مقرر کیا تو سعد سلمان کو شہزادے کا مستوفی نامزد کیا۔ والی ہند کا دارالحکومت لاہور تھا اور یہیں مسعود سعد سلمان پیدا ہُوا۔

مسعود نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ اس نے پہلے سلطان ابراہیم اور پھر اس کے بیٹے مسعود کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ ایک زمانے میں تو اسے بڑا فروغ ہُوا، لیکن بالآخر بادشاہِ وقت نے اس کی وفاداری پر شبہ کر کے اسے قید کر دیا۔ مسعود سعد سلمان نے اس قید کے دوران میں جو حبسیہ قصائد لکھے ہیں وہ اپنے طرز میں بالکل نئے ہیں اور درد و اثر سے بھرے ہوئے ہیں۔ مشہور شاعر سنائی جس کی مثنوی حدیقۃ الحقیقت یا حدیقہ اربابِ تصوف کی آنکھ کی عینک ہے۔ مسعود سعد سلمان کا بڑا مداح تھا اور اسی نے مسعود کا فارسی دیوان مرتب کیا۔ لیکن مسعود کے تین دیوان تھے۔ ایک عربی ایک

فارسی اور ایک ہندوستانی میں۔ عوفی لکھتا ہے :-

"و او راسہ دیوان است یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہ ہندوی"۔

سلطان ابراہیم غزنوی کے دربار کا ایک اور شاعر ابوالفرج رونی تھا، جو بعض تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق مضافات لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ قصیدہ نویسی میں یکتائے زمانہ تھا۔ انوری نے کئی اشعار میں اس کی اُستادی کا لوہا مانا ہے ؎

باد معلومش کہ من بندہ بشعر بوالفرج
تا بدیدستم ولوعے داشتستم بس تمام

اور عرفی نے تو ایک شعر میں انوری اور ابوالفرج کو قریب قریب ہم پایہ قرار دیا ہے ؎

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز | بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را

سلطان مسعود ابن ابراہیم کے بعد اس کے بیٹے بہرام نے شعرا کی سرپرستی کی خسرو ملک جو غزنوی خاندان کا آخری حکمران تھا، بہرام کا پوتا تھا۔

مشہور شعرا اور مورخین کے علاوہ غزنویہ دَور کی قابلِ ذکر ہستی داتا گنج بخش ہیں جن کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ اس زمانے کے فنِ تعمیر کے نمونے پاکستان میں کوئی نہیں اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے پہلے ہندوستان میں بیشتر نائب السلطنت رہتے تھے۔ اور حکومت کا دارالخلافہ غزنی تھا۔

علامہ ابُو ریحان البیرُونی

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونی خطۂ ہند و پاکستان میں آیا اور ہندوستانی علوم کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس علاقے اور ہندوؤں کے متعلق ایک نہایت اہم اور سیر حاصل کتاب لکھی۔

البیرونی کے اپنے حالات پر اخفا کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ فقط اس کی تصانیف میں کہیں کہیں اس کے قلم سے اپنی نسبت جو کوئی لفظ ٹپک پڑا ہے، اسے پھیلا کر اس کی داستانِ حیات ترتیب دینی پڑتی ہے۔ وہ خوارزم (خیوا) کے قریب ایک

گاؤں بیرون میں ۹۷۳ء میں پیدا ہوا۔ تیئس برس اپنے وطن میں گزارے۔ پھر کئی سال شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار سے وابستہ رہا اور یہیں ۱۰۰۰ء میں آثار الباقیہ لکھی۔ اس کے بعد وہ خوارزم چلا آیا اور جب سلطان محمود غزنوی نے خوارزم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو دوسرے اعیان و مشاہیر کے ساتھ ۱۰۱۷ء میں غزنی گیا۔ محمود اس سے کسی بات پر ناراض رہا، لیکن اس کے بیٹے مسعود نے البیرونی کی سرپرستی کی۔ موخر الذکر کے نام اس نے قانون مسعودی معنون کی۔ اور بالآخر ۷۷ سال کی عمر میں ۱۱۴ سے زیادہ علمی کتابیں لکھنے کے بعد ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔ بیہقی کی تاریخ الحکما میں البیرونی کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے چالیس سے زیادہ سال تحصیل علوم میں صرف کیے اور ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اس کا بوعلی سینا سے اکثر مناظرہ ہوتا تھا۔ بیہقی نے البیرونی کا ایک قول نقل کیا ہے۔ "عاقل کسے تواند بود کہ بہ تدبیر امروز از تدبیر فردا مستغنی شود۔"

البیرونی نے علوم تاریخ۔ سنین۔ ریاضی۔ ہیئت۔ جغرافیہ۔ طبیعیات۔ کیمیا اور علم معدنیات میں کتابیں تصنیف کیں۔ وہ عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ خوارزمی کے علاوہ عبرانی اور یونانی سے واقف تھا اور سنسکرت میں تو اس نے عربی سے کئی کتابیں ترجمہ کیں۔

البیرونی کی زندگی بیشتر خطۂ ہند و پاکستان سے باہر بسر ہوئی، لیکن چونکہ اس کی مشہور ترین کتاب اسی سرزمین کے متعلق ہے، اس لیے یہاں کی علمی تاریخ میں اس کا ذکر آجانا ناگزیر ہے۔ علاوہ ازیں البیرونی کی تصانیف میں اس بے تعصبی، انصاف پرستی، اخلاقی جرأت اور عالمانہ تبحر کی بہترین مثالیں ملتی ہیں، جسے مسلمان اہل تحقیق نے اپنے عہد عروج میں اپنا مطمح نظر بنایا۔ (اور جسے سطحی علمیت اور سستی قوم پروری کے موجودہ دور میں تو شاید ایک عیب سمجھا جاتا ہے) چنانچہ اس زمانے کے مزاج علمی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے البیرونی کے طریق کار کا مطالعہ بے فائدہ نہ ہوگا۔

البیرونی کی کتاب الہند کو پہلے جرمن اور پھر انگریزی قالب میں ڈھال کر پروفیسر سخاو نے اسے مغربی دنیا سے روشناس کرایا تھا۔ اور جلد ہی اہلِ نظر نے اس گوہر یکتا کی قدر و قیمت پہچان لی۔ اردو میں مولوی سید حسن برنی نے چند مختصر اور تشنہ مضامین کا مجموعہ البیرونی کے نام سے مرتب کیا، لیکن حال ہی میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام کتاب الہند کا ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

کتاب الہند میں ایک تمہید کے علاوہ، جس میں کتاب کی غرض و غایت اور وجہ تصنیف بیان کی گئی ہے، اسّی باب ہیں اور ان میں ہندوستان کے مذہب، فلسفہ، ادب، جغرافیہ، ہیئت، جوتش، رسم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔ بالعموم کوشش کی گئی ہے کہ مختلف مضامین پر ہندوؤں کی اپنی مستند کتابوں سے اقتباس دے کر ان کا نقطۂ نظر واضح کیا جائے۔ کہیں کہیں جب اس نقطۂ نظر میں غرابت معلوم ہوتی ہے تو البیرونی نے یونانیوں یا یہودیوں کی مثالیں دے کر یہ غرابت رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

تمہید میں مصنف نے اپنے استاد ابو سہل عبدالمنعم ابن علی سے ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس کے دوران میں البیرونی نے ہنود کے متعلق مسلمانوں کی مروجہ کتابوں کی خامیاں بتائی تھیں:-

"استاد موصوف نے جب ان کتابوں کو دوبارہ پڑھا اور ان کی وہی حالت پائی جو بیان کی گئی تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ ہم کو جو ہندوؤں کے ذریعے معلوم ہوا ہے وہ قلمبند کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کو جو ان سے بحث و مناظرہ کرنا چاہیں، اس سے مدد ملے۔ اور جو لوگ ان سے میل جول پیدا کرنا چاہیں، ان کے لیے بھی کار آمد ہو۔ اور انھوں نے (ہم پر) اس کی فرمائش کی۔

ہم نے اس کتاب کو اس طرح لکھ ڈالا کہ اس میں کسی فریق کی طرف کوئی ایسا قول منسوب نہیں کیا جو اس کا اپنا نہیں ہے اور نہ ان کا کلام نقل کرنے سے، اگر وہ حق کے مخالف اور اہلِ حق کو ان کا سننا گراں ہو احتراز کیا ہے۔ وہ اس

فریق کا اعتقاد ہے اور وہ اپنے اعتقاد سے بخوبی واقف ہے۔

یہ کتاب بحث و مناظرہ کی کتاب نہیں ہے کہ ہم مخالف کی دلائل بیان کرکے جو ان میں سے حق کے خلاف ہیں، ان کی تردید کریں۔ یہ فقط نقل و حکایت (تاریخ) کی کتاب ہے۔"

البیرونی علم ہیئت و نجوم کا عالم تھا۔ اس لیے یہ کتاب ان علوم اور سنین کے متعلق اتنے طویل عالمانہ اقتباسات اور ہندی اور یونانی نظریوں کے ایسے لطیف موازنوں سے بھری ہوئی ہے کہ اس سے پوری طرح بہرہ ور ہونا انھی کا حصّہ ہے جو ان علوم میں دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن کتاب میں عام دلچسپی کی بھی کئی باتیں ہیں۔ مذہب کے متعلق البیرونی ہندو خواص اور ہندو عوام میں ایک بیّن فرق بیان کرتا ہے۔ اس نے پاتنجلی سے طویل اقتباسات دے کر بیان کیا ہے کہ خواص کے نزدیک خدا واحد ہے۔ ازلی ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اپنے فعل میں مختار ہے۔ قادر ہے۔ حکیم ہے۔ زندہ ہے۔ زندہ کرنے والا ہے۔ لیکن عوام ہندو دیوتاؤں سے انسانی خواص منسوب کرنے میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ ان سے جورو، بیٹا، بیٹی، حمل اور تمام حالات طبعی منسوب کرتے ہیں اور ان کے ذکر میں خلافِ عقل مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ عوام بُت پرستی کرتے ہیں، لیکن جو شخص نجات کی راہ کا طالب ہے یا جس نے مناظرہ و کلام کا مطالعہ کیا اور حقیقت کو جاننا چاہا ہے "جس کو یہ لوگ سار کہتے ہیں" وہ اللہ کے سوا ہر دوسری چیز کی عبادت سے پاک دامن ہے۔ بنائی ہوئی صورت کی کیا عبادت کرے گا۔"

ہندوؤں کے رسم و رواج کی نسبت البیرونی لکھتا ہے کہ شادیاں کم عمری میں ہوتی ہیں۔ مرد کو کثرتِ ازدواج کا اختیار ہے۔ طلاق کی اجازت نہیں۔ نکاح بیوگان بھی ممنوع ہے۔ "جب ایک عورت کا خاوند مر جائے تو یا تو اسے تمام عمر بیوہ رہنا پڑتا ہے یا زندہ جل جانا۔ بالعموم وہ زندہ جل جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ کیونکہ بیوگی کی حالت میں اس سے تمام عمر بدسلوکی ہوتی ہے۔"

البیرونی بھاگوت گیتا اور اپنشدوں کے فلسفے کی تعریف کرتا ہے اور ہندوؤں کی نرم دلی کا عیسائیوں کی نرم دلی سے مقابلہ کرتا ہے۔ طریق عدل و انصاف کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بلند پیمانے پر تھا۔ لیکن برہمنوں کو کھلم کھلا مراعات حاصل تھیں اور وہ ٹیکسوں اور سزائے موت سے بھی بچے۔ ہندوؤں کے چار طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے: "ہم میں اور ہندوؤں میں بڑا اختلاف یہ ہے کہ ہم آپس میں سب کو برابر سمجھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر فضیلت صرف تقوے کی بنا پر دیتے ہیں۔ یہ اختلاف ہندوؤں اور اسلام کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔"

البیرونی نے ایک باب ہندوؤں کی عجیب رسوم و عادات کے متعلق لکھا ہے جس میں ہندوؤں کی ان تمام باتوں کو جمع کیا ہے جو اس کی نظر میں مکروہ یا عجیب وغریب تھیں۔ چونکہ بطور ایک محقق اور عالم کے اس نے ہر ایک چیز کو دیانتداری اور ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے اس نے ان رسوم کی بھی تاویل کی ہے اور لکھا ہے کہ "کسی چیز کا عجیب وغریب ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ (ہم میں) کم پائی جاتی ہے۔ اور اس کو دیکھنا عادت کے خلاف ہے۔"

ان رسوم کی فہرست دے کر البیرونی لکھتا ہے:۔

> "ہم نے کسی ہندو لڑکے کو جو اسلامی ملکوں میں نیا آیا ہو اور اس ملک والوں کے طریقے کا مشاق نہ ہو، ایسا نہیں پایا۔ جو اپنے آقا کے سامنے ہمیشہ کھڑا ہو کر اس کی اصلی وضع کے خلاف یعنی دائیں پاؤں والی کو بائیں کے بدلے نہ رکھتا ہو۔ کپڑا الٹا نہ کرتا ہو۔ فرش الٹا نہ بچھاتا ہو اور اسی قسم کی بہتیری باتیں جس کا سبب یہی ہے کہ اس کی فطرت میں طبیعت کی مخالفت ہے۔

اس جاہلیت پر ہم تنہا ہندوؤں ہی کو ملامت نہیں کرتے۔ اہل عرب بھی زمانۂ جاہلیت میں انھی کے مانند بڑی نامناسب اور

قابلِ شرم باتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ مثلاً حائضہ اور حاملہ عورتوں سے نکاح۔ ایک ہی طہر کے زمانے میں ایک عورت کے پاس چند مردوں کا جانا اور غیر کے لڑکوں اور مہمانوں کی اولاد کو اپنی طرف منسوب کر لینا۔ بیٹی کو زندہ دفن کرنا۔

علاوہ ان امور کے جو ان کی عبادت میں مثلاً تالی پیٹنا اور سیٹی بجانا اور کھانے میں مثلاً گندی چیزیں اور مُردار کھانا قابلِ اعتراض تھے۔ ان سب کو اسلام نے مٹایا۔ اور اسی طرح ہندوستان کے جس علاقے کے لوگ مسلمان ہو گئے، وہاں سے بھی اکثر برائیوں کو جو سرزمینِ ہند میں ہیں دفع کیا۔ والحمد للہ!"

عُلما و مشائخ

شیخ صفی الدین گازرونیؒ
وفات ۱۰۷۰ء

عہدِ غزنویہ میں پاکستان کے جس شہر نے سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا، لاہور تھا لیکن اس سرزمین میں اسلام کے قدیمی گہوارے سندھ اور مُلتان کے علاقے ہیں اور ان میں اب صرف عرب سے ہی نہیں، بلادِ عجم سے بھی علما و مشائخ آنے شروع ہو گئے تھے۔ اگر سندھ میں شیخ ابوتراب کے مزار کو، جو فی الواقع ایک مُلکی حاکم تھے، شمار نہ کیا جائے تو سرزمینِ ہند و پاکستان میں سب سے قدیم اسلامی زیارت گاہ اچہ (ریاست بہاولپور) میں شیخ صفی الدین حقانی گازرونیؒ کا مزار ہے۔ شیخ صفی الدین مشہور صُوفی بزرگ خواجہ ابو اسحاق گازرونیؒ کے مرید اور خواہر زادے تھے، جو اپنی تبلیغی اور روحانی کوششوں کے لیے شہرۂ آفاق ہیں۔ شیخ صفی الدین ۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ستر برس کی عمر میں اچہ تشریف لائے اور ۱۰۷۰ء میں وفات پا گئے۔[1]

فوائد الفواد میں سُلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) کی زبانی ایک حکایت نقل ہوئی ہے کہ ایک مرتبہ اچہ میں ایک جوگی شیخ صفی الدین گازرونی کی خدمت میں آیا۔ بحث شروع کی اور شیخ سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی کرامت دکھاؤ۔ اُنھوں نے فرمایا کہ دعوےٰ لے کر تم آئے ہو۔ تم کرامت دکھاؤ۔ اس پر وہ جوگی زمین پر سے ہوا میں سیدھا اوپر کو اُڑا۔ اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور کہا کہ تم بھی کچھ دکھاؤ۔ شیخؒ نے آسمان کی طرف مُنہ کر کے درگاہِ باری تعالےٰ میں التجا کی کہ اے پروردگار! تو نے بیگانوں کو یہ طاقت عطا کی ہے۔ مجھے بھی کچھ عنایت کر!

---

[1] تاریخ اُچہ (مرتبہ مولوی محمد حفیظ الرحمان بہاولپوری) صو ۴۰

بعد ازاں شیخ اپنی جگہ سے قبلہ رُخ اُڑے۔ پھر مشرق کی سمت۔ پھر شمال کو پھر جنوب کی طرف اور پھر اپنی جگہ پر آگئے۔ جوگی یہ دیکھ کر قائل ہوگیا۔ اور کہا کہ میں تو صرف سیدھا اُوپر اُڑ سکتا ہوں اور آپ ہر سمت اُڑ سکتے ہیں۔ واقعی آپ سچے ہیں اور ہم باطل۔[1]

اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں کہ قصبۂ اچہ کی بُنیاد شیخ صفی الدین گازرونیؒ نے رکھی۔ ان کے ماموں شیخ ابو اسحاق گازرونیؒ نے انھیں نعمتِ خلافت سے فیض یاب کر کے حکم دیا کہ تم اونٹ پر سوار ہو جاؤ اور جدھر اونٹ جائے، اُسی طرف چلتے جاؤ۔ جب اونٹ اچہ کی سرزمین میں پہنچا تو ایسا بیٹھا کہ اُٹھنے سے انکار کر دیا۔ شیخ نے یہیں توطن اختیار کیا۔ عمارتیں بنوائیں اور اس جگہ کو آباد کیا۔ (ص ۲۰۵)

فی الواقع قصبہ اچہ بہت پُرانا ہے بلکہ ان شہروں میں سے ہے۔ جن کی آبادی کو سکندرِ اعظم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن بہت دفعہ اُجڑ کر بگڑا اور آس پاس کئی آبادیاں ہوئیں۔ ممکن ہے شیخؒ نے پُرانی آبادی سے دُور ایک بستی بسائی ہو۔

شاہ یُوسف گردیزی مُلتانیؒ

سندھ و مُلتان کی دوسری زیارت گاہ
مُلتان میں شاہ محمد یوسف گردیزیؒ کا مزار

---

[1] فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے ملفوظات و ارشادات مشہور فارسی شاعر امیر حسن سجزی نے سلطان المشائخ سے سُن کر بڑی احتیاط سے ترتیب دیے تھے۔ بالعموم اس میں وہ واقعات ہیں، جو سلطان المشائخ یا ان کے مُرشد شیخ کبیر بابا فرید گنج شکر یا ان کے معاصرین کو پیش آئے۔ اس میں خارقِ عادت واقعات بہت تھوڑے ہیں۔ لیکن شیخ صفی الدین اور سلطان المشائخ کے درمیان دو صدیوں کا بُعد تھا۔ ان کے متعلق وہ پوری تحقیق نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا جو روایت سلطان المشائخ نے اپنے بزرگوں سے سُنی بیان کر دی۔

ہے۔ ان کا خاندان اصل میں بغداد کا تھا۔ لیکن ان کے بزرگ بغداد سے گردیز چلے گئے۔ اس لیے اب انھیں گردیزی کہتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث نے تو شاہ صاحب کو شیخ بہاء الدین زکریا کا ہمعصر بیان کیا ہے لیکن مقامی روایات کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت ۴۶۲ھ ہجری (۱۰۶۹ء) اور تاریخ وفات ۵۴۷ھ (۱۱۵۲ء) ہے۔ آپ گردیز میں پیدا ہوئے اور بہرام شاہ غزنوی کے عہدِ حکومت میں ملتان تشریف لائے۔ آپ کا مزار ملتان کی مشہور زیارت گاہوں میں سے ہے۔ شاہانِ اسلام نے اس کے ساتھ بہت سی جاگیریں معافی میں دے رکھی تھیں۔ لیکن مہاراجا رنجیت سنگھ نے انھیں ضبط کر لیا۔ گردیزی سادات زیادہ تر شیعہ عقائد کے ہیں اور علم و فضل سے بڑی رغبت رکھتے ہیں۔

خطۂ لاہور کے عُلما و مشائخ

سندھ اور ملتان کے بعد شمالی ہندوستان میں ہدایت کا سرچشمہ سب سے پہلے لاہور میں پھوٹا بلکہ چونکہ سندھ اور ملتان پر قرامطہ قابض ہو گئے تھے اور ان کا کئی صدیوں تک کسی نہ کسی صورت میں وہاں اثر برقرار رہا۔ اس لیے لاہور کو جلد ہی ان علاقوں پر فوقیت حاصل ہو گئی اور جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد قرمطیوں کا ملتان اور سندھ سے قلع قمع ہوا تب ہی شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور دوسرے بزرگوں کی بدولت ملتان کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت واپس ملی۔

شیخ اسمٰعیل لاہوریؒ

تاریخی کتابوں میں سب سے پہلے جس مبلغِ اسلام کا نام آتا ہے وہ شیخ اسمٰعیل لاہوری[۱] تھے جو یہاں اُس زمانے میں آئے، جب ابھی لاہور میں ایک ہندو راجا حکمران تھا۔ وہ شاید سلطان محمود غزنوی کو

---

[۱] حضرت سالار مسعود غازی (شہادت ۱۰۳۳ء) | شیخ اسمٰعیل لاہوری اس زمانے کی مشہور شخصیت ہیں لیکن (بعد کی روایات کے مطابق' جن کا تحریری مآخذ ابن بطوط

خراج دیتا تھا لیکن سلطان نے ابھی لاہور میں اپنا نائب مقرر نہیں کیا تھا۔ شیخ اسمٰعیل بخاری سید تھے اور علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ واعظین اسلام میں وہ سب سے پہلے بزرگ تھے، جنھوں نے لاہور کے شہر میں جہاں وہ ۴۴۸ھ میں آئے تھے، وعظ کیا۔ ان کی مجلس وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز صدہا لوگ خلعت اسلام سے مشرف ہوتے تھے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں لکھا ہے: "از عظمائے محدثین و مفسرین بود۔ اول کسے است کہ علم تفسیر و حدیث بہ لاہور آوردہ۔ ہزارہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند۔ در سال چہار صد و چہل و ہشت ہجری در لاہور درگذشت"

خزینۃ الاصفیا کا بیان ہے: "چوں شیخ اسمٰعیل در لاہور تشریف آورد۔ بروز جمعہ ثالث یک ہزار کس در زمرۂ اہل توحید داخل گشتند۔"

شیخ اسماعیل کے علاوہ لاہور میں دوسرے متعدد علما و مشائخ تھے۔ علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں اس شہر کو بابرکت اور کثیر الخیر شہروں میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ یہاں بہت سے علما و صلحا پیدا ہوئے۔ لیکن انھوں نے نام فقط

[بقیہ نوٹ صرم ۷] برنی اور عفیف سے ہوتا ہے)۔ ہندوستان کی ایک مشہور زیارت گاہ ان کی زندگی ہی میں صوبجات متحدہ کے شہر بہرائچ میں قائم ہو چکی تھی۔ یہ حضرت مسعود غازی (جنھیں میاں غازی یا سالار بالا پیر بھی کہتے ہیں) کا مشہد اور مزار تھا۔ انھیں سلطان الشہدا کا لقب بھی حاصل ہے اور چونکہ وہ ہندوستان کے سب سے پہلے شہدا میں سے تھے، اور خاص امتیاز رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی شہید ہوتا ہے تو وہ ان کے متابعین میں گنا جاتا ہے۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے خواہر زادے تھے۔ کئی لڑائیوں کے بعد جن میں آپ کو اور آپ کے والد کو بڑی کامیابی ہوئی۔ آپ بہرائچ کے ہندو سرداروں سے لڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سنہ ۱۰۳۳ء میں شہید ہوئے۔ سلطان محمد تغلق نے آپ کے مزار کو دوبارہ بڑی شان سے تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ آپ سے اور آپ کے مزار سے کئی کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں اور عوام الناس میں آپ کا بڑا اثر ہے۔

(باقی صرم ۷۶ پر)

تین گنائے ہیں۔ جن سے انھیں کسی طرح کا علاقہ تھا۔ ان میں زیادہ مشہور ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری تھے۔ جو ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ محدث بھی تھے۔ اور ان کے فیوض اس قدر عام تھے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بغداد بھی ان سے مستفید ہوا۔ علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے ان سے بذاتِ خود فیض پانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن حافظ ابوالفضل محمدؒ بغدادی کے واسطہ سے میں ان کا شاگرد ہوں۔ ان کے ایک دوسرے شاگرد ابوالفتح عبدالصمد لاہوری تھے۔ جو سمرقند میں درس دیتے تھے۔ اور وہیں علامہ سمعانی نے ان سے شیخ ابوالحسن کی روایتیں سنیں۔ شیخ ابوالحسن کا وصال ۵۲۹ھ میں ہوا۔

لاہور کے شعرا و ادبا کے حالات ہم ارمغانِ پاک کے دیباچہ اشاعتِ ثانی (ii)؟ درج کر چکے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ
۱۰۰۹ء تا ۱۰۷۲ء

شیخ اسمٰعیل سے بھی زیادہ جس بزرگ نے نام پیدا کیا، وہ غزنی کے شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ تھے جو داتا گنج بخش کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ۱۰۰۹ء کے قریب پیدا ہوئے اور مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے بعد سلطان مسعود ابن محمود غزنوی کے اخیر عہدِ حکومت میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵) بھڑائچ میں جہاں آپ کا مزار ہے آپ کا عُرس بڑی دُھوم دھام سے ہوتا ہے اور اس کے علاوہ لاہور، دہلی اور دیگر بڑے شہروں میں بھی آپ کے نام پر عَلم نکالے جاتے ہیں۔

بابا رتن ہندی ایک اور نہایت قدیمی نام شیخ ابوالرضا رتن ہندی کا ہے، جن کا ذکر امام ذہبی۔ علامہ ابنِ حجر جیسے بزرگوں نے تفصیل سے کیا ہے، لیکن جن کے حالات پر روایات کا پردہ چھایا ہُوا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے۔ عہدِ رسالت میں موجود تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے انھیں درازی عمر کی دعا دی۔ چنانچہ وہ کئی سو سال کی عمر پا کر سنہ ۶۰۰ھ کے بعد وفات پا گئے۔ اور بھٹنڈہ میں مدفون ہوئے (ملاحظہ ہو نزہت الخواطر جلد اوّل صفحات ۱۴۷ - ۱۵۴)

دو ساتھیوں کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ کچھ دیر تک درس دیتے رہے۔ پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے، جن میں سے رائے راجو جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا، خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ مسلمان کرنے کے بعد آپ نے اس کا عرف شیخ ہندی رکھا اور اس کی نسل کے لوگ دو چار سال پہلے تک آپ کے مزار کے خدام و مجاور تھے۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ میں یعنی ۱۰۷۲ء کے قریب ہوئی۔

جب داتا گنج بخش پاکستان آئے اس وقت تصوف اپنی تاریخ کے دوسرے دَور میں تھا۔ منصور حلاج، ذوالنون مصری اور خواجہ بایزید بسطامی نے تصوف میں بعض نئی (اور غیر اسلامی) چیزیں داخل کر دی تھیں، لیکن ابھی زہد و اتقا کو تصوف میں نمایاں جگہ حاصل تھی اور داتا صاحب تو شرع اور اصولِ دینی پر پوری طرح عامل تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے صوفی فرقوں کا حال لکھا ہے۔ اس میں حسین فارسی (منصور حلاج) اور ابوسلمان کے حلولی فرقوں کو ملحد اور لعنتی کہا ہے۔ فرماتے ہیں (ترجمہ):۔

"میں نہیں جانتا فارسی کون ہے اور ابوسلمان کون اور انھوں نے کیا کیا اور کیا کہا۔ لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے، اس کو دین میں کچھ نصیب نہیں ہوتا اور جب دین جو اصل ہے مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس کی شاخ ہے کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔"

داتا گنج بخش کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً کشف المحجوب، کشف الاسرار، منہاج الدین، البیان لاہل العیان۔ یہ کتابیں اس وقت لکھی گئیں جب تصوف کی مشہور کتابیں مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور ابنِ عربی کی فصوص الحکم ابھی نہیں لکھی گئی تھیں اور تصوف کی موجودہ تدوین، جس نے بعض باتوں میں اسے شرعِ اسلامی سے ایک مختلف نظام بنا دیا ہے، نہ ہوئی تھی۔

حضرت داتا گنج بخش کی تصانیف میں متاخرین صوفیہ کا غلو یا نیم پختہ عقائد اور خیالات کا طومار نہیں۔ بیشتر دنیا اور دنیا داری سے دور رہ کر مرشد کی پیروی کر کے اللہ اللہ کرنے اور دل کو کبر و حرص سے پاک رکھنے کی باتیں ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے۔ دیوان تو اب نہیں ملتا البتہ نثر کی بعض کتابوں میں اشعار موجود ہیں[۱]

اشتیاقت روز و شب دارم دلا — عشق تو دارم نہان و بر ملا
جاں بخواہم داد اندر کوئے تو — گر مرا آزار آید یا بلا
سوز تو دارم میان جان و دل — میدہم از عشق تو ہر سو صدا
دلبرا از تو ہمے خواہم لقا — کن تو "آرے" دگر مگن ہرگز تو "لا"

اے علی تو فرخی در شہر گو
دہ ز عشق خویشتن ہر سو صلا

کشف المحجوب جسے پروفیسر نکلسن نے انگریزی قالب میں ڈھالا ہے، آپ کا شاہکار ہے۔ اور چونکہ فارسی زبان میں تصوف پر یہ پہلی کتاب ہے اس کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے رفیق ابو سعید ہجویری کی خواہش پر جو آپ کے ساتھ غزنی چھوڑ کر لاہور آ گئے تھے، لکھی اور اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق، اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت، ان کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان، معاصر صوفیوں کے رموز و اشارات اور متعلقہ مباحث بیان کیے ہیں۔ اہل طریقت میں اس کتاب کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ دارا شکوہ کا بیان ہے: "کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را براں سخن نیست و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ[۱]"

کشف المحجوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صوفیا کے درمیان

---

[۱] سفینۃ اولیا ص ۱۶۴

سماع کا رواج ہو گیا تھا۔ داتا گنج بخش صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"کرمان میں ایک دفعہ میں شیخ ابو احمد مظفر کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ سفر کے کپڑے تھے اور پریشان حال تھا۔ مجھے فرمانے لگے: اے ابوالحسن! تمھیں کس چیز کی خواہش ہے۔ مَیں نے کہا: مجھے اس وقت سماع کی طلب ہے۔ انھوں نے ایک قوال کو بُلوایا اور درویشوں کی ایک جماعت بھی جوش و خروش کے ساتھ آئی۔ مجھے سماع کے الفاظ نے مضطرب کر دیا۔ جب وقت گزرا اور میرا جوش کم ہُوا تو شیخ ابو احمد پُوچھنے لگے کہ سماع کا کیا اثر ہُوا۔ مَیں نے کہا: یا شیخ! بڑی مسرت ہوئی۔ فرمانے لگے کہ ایک وقت آئے گا کہ سماع اور کوّے کی آواز میں تیرے لیے فرق نہ رہے گا۔ کیونکہ قوتِ سماع اُس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ جب مشاہدہ حاصل ہوتا ہے سماع کی خواہش مٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور بالآخر آپ نے سماع سے توبہ کر لی اور نہایت صاف طور پر لکھا:۔

"مَیں عثمان جلابی کا بیٹا علی اُس کو دوست رکھتا ہوں جو سماع میں نہ پڑے اور طبیعت کو پریشان نہ کرے کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں۔ اور بڑی آفت یہ ہے کہ عورتیں کسی اُونچے مقام سے سماع کے حال میں درویشوں کو دیکھتی ہیں اور نوجوان اور نوخاستہ ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس آفت سے مجھ پر جو کچھ گزرا ہے گزرا ہے (آیندہ کے لیے) استغفار پڑھتا ہوں اور خدا تعالےٰ سے مدد مانگتا ہوں کہ میرے ظاہر اور باطن کو آفتوں سے نگاہ رکھے۔" (ترجمہ)

داتا گنج بخش کے خیالات کا متاخرین سے مقابلہ کریں تو ان کی اصابت رائے، خلوص اور تقوے کی داد دینی پڑتی ہے لیکن زاہدانہ رنگ جو ابتدائی صوفیوں میں کبھی کبھی رہبانیت کی حد تک جا پہنچتا تھا، ان میں بھی موجود تھا۔ اپنی تصانیف میں اُنھوں نے عورتوں کی خوب خبر لی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدمؑ پر مقدر ہُوا ہے۔ اس کا اصل یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دُنیا میں ظاہر ہُوا یعنی ہابیل اور قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی یہی ذات شریف تھی اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت۔ ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج کے دن (یعنی ۵۶۵ھ کے قریب تک) دینی اور دُنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ یہی عورتیں ہیں۔"

آپ کی ازدواجی زندگی کے متعلق واضح واقفیت نہیں ملتی لیکن کشف المحجوب میں اس مسئلے پر جو اندراج ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔ (ترجمہ)

"مَیں جو کہ علی بن عثمان جلابی ہوں۔ حق تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک شادی کی آفت سے بچائے رکھا۔ پھر تقدیر سے مَیں آزمائش میں ڈالا گیا۔ میرا ظاہر و باطن ایک پری صفت کا اسیر ہُوا۔ بغیر اس کے کہ مَیں نے اسے دیکھا ہو۔ ایک سال تک مَیں اس کے خیالات میں غرق رہا۔ نزدیک تھا کہ یہ چیز میرے دینی معاملات میں خلل انداز ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کمال لطف و فضل سے عصمت کو دل بیچارہ کے استقبال کے لیے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی۔"

آج کل بعض واعظ اور اہلِ مذہب اس امر پر بڑا زور دیتے ہیں کہ ہم بدترین زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ انگریزی تعلیم اور مغربی اثرات نے ہماری خوبیوں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور آج سے پہلے اسلامی حکومت کے دوران میں ہر طرف نیکیوں کا دور دورہ تھا۔ تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس خوشگوار نظریے میں صداقت کا عنصر کس قدر ہے۔ لیکن یہ دلچسپ نفسیاتی حقیقت ہے کہ راہبانہ طبیعتیں ہمیشہ دُنیا کو دارالشیاطین سمجھتی رہی ہیں۔ داتا گنج بخش اس زمانے کی نسبت جب دُنیا کے سب سے بڑے "بُت شکن" نے ابھی ابھی اپنا کام پُورا کیا تھا لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"خداوند بزرگ و بلند نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب لوگوں نے حرص ولالچ کا نام شریعت اور تکبر و جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم، ریائے خلق کا نام خوفِ الٰہی اور دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم، لڑائی جھگڑے کا نام بحث مباحثہ، ہذیانِ طبع کا نام معرفت، نفسانی باتوں اور دل کی حرکتوں کا نام محبت۔ خدا کے رستے سے منحرف اور بے دین ہونے کا نام فقر۔ حق تعالےٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ اور ترکِ شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔"

امام حسن صنعانی لاہوریؒ

جو مرتبہ قدیم مشائخ میں داتا گنج بخشؒ کا تھا، قریب قریب وُہی مرتبہ اس دَور کے علماء و محدثین میں محدث امام رضی الدین ابو الفضائل حسن صنعانی لاہوری کا تھا۔ ان کے والد ماوراء النہر سے آکر ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے۔ امام صنعانی لاہور میں ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ یہیں نشوونما پائی۔ مولنا عبدالحی ندوی نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں کہ سُلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور کی قضاۃ پیش کی، لیکن انھوں نے قبول نہ کی۔ اور مزید علوم کی تحصیل کے لیے وطن سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے غزنی آئے۔ پھر عراق پہنچے۔ جہاں علوم وفنون کی تکمیل کی۔ اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے۔ بغداد میں آپ نے خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے لیے اپنی مشہور و معروف کتاب مشارق الانوار لکھی۔ جس کے صلہ میں ان کو خلعت عطا ہُوا۔ پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ جب بغداد واپس آئے تو خلیفہ نے انھیں وہ اہم فرمان دے کر سلطان شمس الدین التمش کے پاس بھیجا، جس میں موخر الذکر کی مستقل حکومت اور خود مختاری تسلیم کی تھی۔ آپ ایک عرصہ ہندوستان رہے۔ پھر حج کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ وہاں سے بغداد میں آکر پھر درس و تدریس شروع کیا۔ خلیفہ بغداد کی طرف سے سفیر بن کر وہ سُلطانہ رضیہ کے عہد میں پھر ہندوستان آئے اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرکے پھر

بغداد گئے اور ۶۵۰ھ میں وہیں وفات پائی۔ آپ کا جسدِ خاکی حسبِ وصیت مکہ معظمہ منتقل کیا گیا۔

آپ نے لغت، حدیث اور فقہ میں متعدد کتابیں لکھیں۔ بعض کتابیں نہایت طویل اور مفصل تھیں۔ مثلاً فنِ لغت میں ایک کتاب بیس جلدوں میں تھی اور دوسری بارہ جلدوں میں۔ لیکن شاید سب سے زیادہ مقبولیت مشارق الانوار کو حاصل ہوئی، جس میں احادیث کی ترتیب ابتدائی الفاظ کی بنا پر تھی۔ اس کتاب کو ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ایک عرصے تک ہندوستان میں علمِ حدیث میں فقط یہی کتاب رائج تھی۔ اور "عالمِ اسلام کے ممتاز علما نے ڈھائی ہزار سے زیادہ شروح و حواشی لکھے"۔ (بزمِ مملوکیہ)

کتابوں کے علاوہ آپ کا فیض آپ کے شاگردوں نے عام کیا۔ جن میں مولنا برہان الدین محمود بلخی کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔

سلطان سخی سرورؒ

حضرت داتا گنج بخش کے بعد جس بزرگ نے پنجاب میں نام پایا وہ سلطان سخی سرور تھے۔ آپ کا نام سید احمد تھا اور سلطان سخی سرور یا لکھ داتا کے لقب سے مشہور ہیں۔ مضافاتِ ملتان میں ایک موضع کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے اور لاہور میں مولوی محمد اسحٰق لاہوری سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی۔ مشہور ہے کہ تصوف میں آپ نے اپنے والد کے علاوہ حضرت غوثِ اعظمؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد لاہور سے کوئی ساٹھ ستر میل شمال مغرب کی طرف وزیر آباد کے پاس موضع سودھرہ میں اقامت اختیار کی۔ اور یادِ الٰہی اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ آپ کو خدا نے بڑی قبولیت دی۔ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ حصولِ مراد کے لیے آپ کے پاس آتے اور کوئی نامراد نہ جاتا۔ اس لیے آپ سلطان سخی سرور کے لقب سے مشہور ہیں۔ بعد میں آپ مقام دھونکل[1] میں کئی سال رہے۔ اس کے

[1] دھونکل میں اب تک آپ کی درگاہ موجود ہے۔ جہاں ہر سال اساڑھ کی پہلی جمعرات کے روز

بعد وطن کی محبت دامنگیر ہوئی اور ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں میں جسے اب شاہ کوٹ کہتے ہیں، واپس تشریف لے گئے۔ وہاں بھی آپ کو بڑا فروغ ہُوا۔ حاکم ملتان نے اپنی بیٹی آپ سے بیاہ دی لیکن اس سے حاسدوں کی آتش حسد بھی تیز ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے یکجا ہو کر آپ کو اور آپ کے بھائی اور بیٹے اور اہلیہ محترمہ کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۱۸۱ء کا ہے۔ مزار شاہ کوٹ کے قریب ہے۔

سلطان سخی سرور کے ساتھ صُوفی تذکرہ نگاروں نے بڑی بے اعتنائی برتی ہے۔ لیکن پنجاب میں آج بھی ان کا اثر دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے صاحبِ سطوت بزرگ تھے۔ بالخصوص پنجاب میں شاید ہی کوئی مسلمان اہل اللہ ہو گا جس کے اس کثرت سے ہندو معتقد ہوں۔ آپ کے ہندو معتقدوں کو سلطانی کہتے ہیں۔ اور مشرقی پنجاب بالخصوص جالندھر ڈویژن کے تمام زراعت پیشہ جاٹ ہندو جو سکھ نہیں ہو گئے، سلطانی ہیں۔ ضلع جالندھر کے سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے: "اجمالی طور پر ہندو آبادی دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ گرو کے سکھ یعنی 'سکھ' اور سلطانی جو ایک مسلمان پیر کے جسے سلطان سخی سرور یا لکھ داتا بھی کہتے ہیں۔ پیرو ہیں" (ص ۱۲۱) آگے چل کر لکھا ہے "زراعت پیشہ ہندوؤں میں سلطانیوں کی اکثریت ہے اور ان میں کئی چمار بھی ہیں۔ ان کا بیان ہو چکا ہے۔ اگر وہ گوشت کھائیں تو صرف حلال کیا ہُوا گوشت کھاتے ہیں۔ وہ سکھوں کے خلاف حُقّہ کثرت سے پیتے ہیں۔ اور سر کے بال جس طرح چاہیں رکھتے ہیں۔

(بقیہ نوٹ صہ۸۲) شاندار عُرس منایا جاتا ہے۔ جس میں بے شمار سلطانی جو پیر بھائی بھی کہلاتے ہیں، بال بچّوں سمیت قافلہ در قافلہ شامل ہوتے ہیں اور جب یہ قافلے یا سنگ دھونکل جاتے ہوئے دریائے راوی کے پار مقبرہ شہنشاہ جہانگیر میں قیام کرتے ہیں تو یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ جو میلہ پار کے نام سے مشہور ہے۔ یہ میلہ دو تین روز تک رہتا ہے۔ جس میں ہزاروں افراد حصّہ لیتے ہیں۔ لہ (۱۹۴۰ء میں لکھا گیا)

ان کے دیہات میں گاؤں سے باہر سلطان کی زیارتیں ہوتی ہیں۔ آٹھ یا دس فٹ کے قریب اُونچی، چوڑی اور لمبی، جن کے اُوپر ایک گنبد ہوتا ہے اور چار کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہوتے ہیں۔ ہر جمعرات کو یہ زیارت صاف کی جاتی ہے اور رات کو چراغ جلائے جاتے ہیں۔ جمعرات کو اس زیارت کا نگہبان جو مسلمان اور بھرائی قوم کا فرد ہوتا ہے، گاؤں میں ڈھول لے کے جاتا ہے اور نیاز اکٹھی کرتا ہے۔" (ص ۱۲۴) ضلع لدھیانہ کے گزیٹیر میں بھی اسی طرح کا اندراج ہے۔ "ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ سلطان سخی سرور سے عقیدت مندی اس ضلع میں کب شروع ہوئی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جاٹ گزشتہ تین چار سو سال میں یہ عقائد اپنے ساتھ لائے۔ یہ امر اغلب ہے کہ سلطانی عقائد پندرھویں سولھویں صدی کے درمیان مغربی پنجاب سے مشرق کی طرف پھیلتے گئے اور گورو گوبند سنگھ کے زمانے میں قریباً سبھی جاٹ سلطانی تھے۔ کیونکہ جو ہندو سکھ ہوئے تھے وہ بھی سلطانیوں میں سے تھے۔ سلطانی ظاہرا عام ہندوؤں کی طرح شو یا دیوی کے پجاری ہیں۔ لیکن جمہور کے ہندو مذہب کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ پیر اور اس کے پیرخانہ نے محسوس ہونے کی بنا پر دیوتاؤں کو بالکل نکال دیا ہے۔"

سلطانیوں کی سب سے بڑی رسم سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے جو وسط فروری کے قریب شروع ہوتی ہے اور بھرائی اپنے اپنے دیہات سے قافلے لے کر ڈیرہ غازی خاں کا رُخ کرتے ہیں۔ سکھوں کے عہد حکومت میں دیوان ساون مل نے جو ملتان کا گورنر تھا یہ جاترا بند کرنے کی کوشش کی اور تمام ہندوؤں کو جو سلطان سخی سرور کی زیارت کو جاتے تھے فی کس سو روپیہ جرمانہ کیا۔ لیکن اس سے بھی معتقد نہ رکے اور انیسویں صدی کے اخیر تک، جب لدھیانہ اور جالندھر کے گزیٹیر مرتب ہوئے۔ سلطانی ہندو اپنے عقاید میں مستحکم تھے۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ اب کچھ عرصے سے ان میں باقاعدہ سکھ ہو جانے کا

رجحان زوروں پر ہے اور شاید جالندھر۔ لدھیانہ اور دوسرے مشرقی اضلاع میں ان کی تعداد کم ہو گئی ہو!

بزرگانِ دیگر!

ان کے علاوہ لاہور کے کئی علما و مشائخ کے نام ملتے ہیں۔ مثلاً سید احمد توختہ ترمذی ثم لاہوری۔ آپ کا وطن ترمذ تھا۔ لیکن وہاں سے تشریف لاکر محلہ چہل بیبیاں لاہور میں اقامت اختیار کی۔ "ہزارہا طالبانِ حق را بحق رسانید و خلقِ کثیر ازاں پیر روشن ضمیر بہرہ مند دُنیا و آخرت شد۔" آپ ۶۰۲ھ میں انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کا نام بھی ملتا ہے۔ آپ ۵۳۵ھ میں ترکستان سے لاہور تشریف لائے۔ اس زمانے میں بہرام شاہ غزنوی ہندوستان کا بادشاہ تھا اور لاہور کا حاکم طغرل تھا۔ وہ آپ کا بڑا معتقد ہو گیا اور بہت سے لوگ آپ کے مُرید ہو گئے۔ مشہور ہے کہ جب خواجہ بزرگ تشریف لائے اور لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر معتکف ہوئے تو ان کے اور سید یعقوب کے درمیان بڑی دوستی پیدا ہو گئی۔ آپ کی وفات ۶۰۴ھ میں ہوئی۔

ایک اور بزرگ شیخ عزیز الدین مکی لاہوری تھے۔ آپ کا وطن بغداد تھا۔ لیکن بارہ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس لیے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے ۵۷۴ھ میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت لاہور میں غزنویوں کی حکومت تھی۔ لیکن سلطان محمد غوری پنجاب میں آ گیا تھا اور لاہور کا محاصرہ کر رہا تھا۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے آپ سے دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی چند سال تمھیں امان ہے۔ اس کے بعد لاہور میں غوریوں کی حکومت

ہو جائے گی - چنانچہ ایسا ہی ہوا - سلطان شہاب الدین لاہور کا محاصرہ ترک کر کے سیالکوٹ کی طرف متوجہ ہوا - اور چھ سال کے بعد پھر لاہور آ کر اس مقام کو فتح کیا - شیخ عزیز الدین چھتیس سال تک مصروفِ ہدایت رہے اور بڑی خلقت آپ سے فیضیاب ہوئی - آپ نے ۶۱۲ھ میں رحلت کی -

اسی زمانے میں حضرت سید مٹھا لاہوری کے والد خوارزم سے لاہور تشریف لائے اور مقبولِ عام ہوئے - ان کی وفات کے بعد حضرت سید مٹھا ان کے جانشین ہوئے - ان کا اصلی نام سید ابنِ عقار تھا لیکن آپ کی زبان میں اس قدر شیرینی اور حلاوت تھی کہ لوگ آپ کو سید مٹھا یعنی شیریں کلام سید کہتے تھے - چنانچہ جس محلے میں آپ رہتے تھے، وہ محلہ بھی سید مٹھا کے نام سے مشہور ہو گیا ہے - آپ نے ۷۱۱ھ میں وفات پائی -

---

دورِ توسیع واشاعت

سنہ ۱۱۸۶ء سے سنہ ۱۳۲۱ء تک

(الف) توسیعِ حکومت

(ب) اشاعتِ اسلام

دورِ توسیع واشاعت

توسیعِ حکومت

سلطان معزالدین محمد غوریؒ

سندھ اور ملتان کا علاقہ تو مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری کے اندر فتح کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد ان کی رفتارِ ترقی سست پڑ گئی اور فتح ملتان سے فتح دہلی تک کوئی پونے پانسو سال کا عرصہ لگا۔

محمد بن قاسم کے قریباً تین سو سال بعد سلطان محمود غزنوی نے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور فتح و نصرت کے گھوڑے دُور دُور تک دوڑائے لیکن محمود کی نگاہ کو بتکدوں کے زر و جواہر نے خیرہ کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی شان دار فتوحات سے سوائے جمع اموال کے کوئی ٹھوس فائدہ نہ اُٹھایا اور گجرات، کچھ، قنوج، کالنجر، کانگڑہ کے راجاؤں کو پامال کرنے کے باوجود شمالی ہندوستان میں وسیع اسلامی حکومت کی داغ بیل نہ ڈالی۔

محمود کے والد امیر سبکتگین نے فتح ہندوستان کا راستہ ایک حد تک صاف کر دیا تھا اور راجا جے پال کو شکست دے کر کابل اور پشاور میں اسلامی حکومت قائم کر دی تھی۔ محمود کی حیرت انگیز کامیابیوں کا عملی نتیجہ فقط اتنا ہُوا کہ لاہور اور اس کا گرد و نواح غزنوی حکومت کے زیرِ نگین آ گیا۔

محمود کی مسلسل فتوحات نے راجپوتوں کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا تھا۔ شروع شروع میں تو جے پال کی حمایت میں سارے ہندوستان کے راجے مہاراجے

جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد میں جس مہاراجے کے خلاف سلطان چڑھائی کرتا اسے کسی طرف سے مدد نہ ملتی اور بعض جگہ تو سلطان کا ایسا رُعب چھایا ہُوا تھا کہ اس کی آمد کی خبر سُن کر ہی راجا دارالسلطنت چھوڑ کر فرار ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اسلامی حکومت قائم کرنا آسان تھا۔ لیکن یہ نہ ہُوا اور محمود کے آخری حملے اور سلطان محمدؒ غوری کی آمد تک دو صدیاں گزریں۔ ان میں راجپوتوں کو ایک بار پھر اپنا نظام مُستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک دفعہ تو ان کی اتنی ہمّت بڑھی کہ انھوں نے لاہور پر حملہ کر کے غزنوی حکمران کو نکالنے کی کوشش کی اور جب ۱۱۹۳ء میں سلطان معزالدین غوری نے دوسری مرتبہ پرتھوی راج سے جنگ کی تو اس کے مُقابلے میں ایک سو پچاس راجپوت راجے مہاراجے تھے!

جس مردِ مجاہد نے شمالی ہندوستان کے عسکری نظام کو پھر درہم برہم کیا اور صرف تخریب پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس کی جگہ اسلامی نظامِ حکومت کی مُستحکم بُنیادیں قائم کیں، اس کا نام محمدؒ غوری[1] تھا۔ وہ محمُود غزنوی جیسا کامیاب سپہ سالار نہ تھا لیکن کیرکٹر کی مضبوطی اور عقل و سمجھ میں اس سے بڑھ کر تھا۔ اسے کئی دفعہ ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ان سے ہراساں نہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بلند ہمتی اور قابلیت قابلِ دید تھی ؎

گر بہ پستی برسی اَپست نگردی مردی!

اس کی ہمّت اور خوش تدبیری شکست کو فتح میں بدل دیتی اور اپنی مُشکلوں کے باوجود

---

[1] سلطان کا نام محمدؒ تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے معزالدین کا لقب اختیار کیا۔ اس لیے صحیح طور پر اس کا نام سلطان معزالدین محمدؒ غوری ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ اسے ایامِ شاہزادگی میں شہاب الدین بھی کہتے تھے اور مملکت ہند میں اس کی اکثر فتوحات اس زمانے میں ہوئیں جب وہ ابھی شاہزادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا نائب تھا۔ اس لیے اسے بعض تاریخوں میں شہاب الدین غوری بھی کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری کا ترجمہ از میجر ریوٹی ص ۴۴۶)

اس سنے اس قدر ٹھوس اور پائیدار کام کیا جس کا عشرِ عشیر بھی محمود سے جسے کبھی
ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑا تھا، نہ ہو سکا۔

سلطان معز الدین غوری نے شروع سے ہندوستان میں حکومت قائم
کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ اس مقصد کے لیے سرحد پر جو مسلمان ریاستیں تھیں،
ان پر قبضہ جمانا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی کی فتح کے بعد ملتان، اچہ اور
لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھٹنڈہ کا قلعہ فتح[1] کر کے یہاں اپنی طرف سے
حاکم مقرر کیا۔ وہ اس فتح کے بعد غزنی واپس جا رہا تھا کہ سرحد کے سردار کی
عرضی پہنچی کہ اجمیر اور دہلی کا راجا بے شمار فوج کے ساتھ بھٹنڈہ کو مسلمانوں سے
چھڑانے کے لیے آ رہا ہے۔ اس کا تدارک لازم ہے ورنہ جو مسلمان وہاں مقیم ہیں،
مارے جائیں گے۔ سلطان کے پاس پوری فوج نہ تھی۔ لیکن بھٹنڈہ کے مسلمانوں
کا خیال کر کے اس نے فوراً لشکر کو روک کر اس طرف کا رخ کیا۔ ادھر سے
پرتھوی راج آ رہا تھا۔ تھانیسر سے چودہ میل دور ترائن (موجودہ تراوڑی) کے
قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ راجپوتوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ مسلمانوں
کی صفیں بکھر گئیں اور افغان اور خلجی سپاہی میدان سے بھاگ نکلے۔

سلطان نے رہی سہی فوج کو سمیٹ کر پھر حملہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر
اس جگہ جا پہنچا جہاں پرتھوی راج کا سپہ سالار کھانڈے راؤ ہاتھی پر سوار، فوج
کی کمان کر رہا تھا۔ سلطان نے نیزے کا ایک ایسا وار کیا کہ کھانڈے راؤ کے
کئی دانت گر گئے۔ لیکن اس نے بھی جوابی حملے میں پھرتی اور تیزی دکھائی۔ سلطان
کو زخم کاری لگا اور ڈگمگا کر گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا کہ ایک باوفا غلام لپک کر
پیچھے جا بیٹھا اور گھوڑے کو اڑا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ پیچھے کچھ مسلمان سپاہی

---

[1] سلطان معز الدین بھٹنڈہ کو بچانے میں ناکام رہا۔ لیکن مسلمانوں کی ہمت اور قابلیت کا اندازہ اس سے
لگایا جا سکتا ہے کہ جب پرتھوی راج نے ترائن کے میدان میں فتح پانے کے بعد بھٹنڈہ کا محاصرہ کیا
تو قلعہ کے حاکم قاضی ضیاء الدین نے ۱۳ مہینے تک اس کا مقابلہ کیا اور تب جا کر قلعہ خالی کیا۔ (کیمبرج ہسٹری)

لاہور میں جمع ہوئے اور سلطان بھی وہاں کئی ہفتے صاحبِ فراش رہا۔
شمالی ہندوستان کی لڑائیوں میں یہ پہلا اہم معرکہ تھا جس میں مسلمانوں کو ہزیمت نصیب ہوئی تھی۔ محمدؐ غوری کو اس کا بڑا رنج ہُوا۔ اس نے غزنی پہنچ کر اُن امرائے غور و خلج پر جو میدانِ غزا سے بھاگ گئے تھے۔ بڑا عتاب کیا۔ ان کی گردنوں میں جَو سے بھرے ہوئے توبرے لٹکائے اور شہر غزنی میں انھیں مثل گدھوں کے تشہیر کیا۔ خود بھی اس نے اپنے لیے خواب و خور حرام کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک سال تک نہ تو اس نے نئے کپڑے پہنے اور نہ ہی شبستانِ عیش میں داخل ہُوا۔ سال بھر دوسرے حملے کی تیاری کرتا رہا۔ جب ہندوستان روانہ ہونے کا وقت آیا تو اُن اُمرا کو جن سے برسرِ عتاب تھا اور جن کو دربار میں آنے کی ممانعت کر دی تھی بُلا کر سمجھایا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھے اور اُنھوں نے قسمیں کھائیں کہ اب میدان میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ چنانچہ محمدؐ غوری پوری تیاری اور ساز و سامان کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ سواروں کو لے کر ہندوستان روانہ ہُوا۔
ایک بار پھر ترائن کے مقام پر حرب و ضرب کا میدان گرم ہُوا۔ اس وقت پرتھوی راج کے ساتھ سارے شمالی ہندوستان کے راجپوت راجے اور ان کی بے شمار فوجیں تھیں اور وہ مارنے یا مر جانے کی قسمیں کھائے ہوئے تھے۔ لیکن غوری کی شاندار قیادت کام آئی۔ ایک تو اس نے مخالف فوج پر اس وقت حملہ کیا جب وہ ابھی تیار بلکہ حوائج ضروریہ سے فارغ نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جب راجپوت اس ابتدائی سراسیمگی کے بعد میدان میں آگئے اور لڑائی شروع ہوئی تو سلطان کے حکم کے مطابق اس کی فوج پیچھے ہٹتی گئی۔ جتنے کہ رائے پتھورا کی فوج کو فتح کا یقین ہو گیا اور تعاقب کے جوش میں ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اس وقت مسلمانوں نے پلٹ کر پھر راجپوتوں پر حملہ کیا۔ ادھر کچھ تازہ دم فوج جو اب تک لڑائی سے علٰحدہ تھی میدانِ کارزار میں آئی

اور راجپوتوں پر اس زور کے حملے ہوئے کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور میدان غوری کے ہاتھ رہا۔

اس فتح نے شمالی ہند کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیے اور دہلی اور اجمیر کی حکومت سلطان محمد غوری کے ہاتھ آگئی۔ (شروع میں تو خراج گزاری کے عوض یہ ریاست برقرار رکھی گئی۔ لیکن جب ۱۱۹۳ء میں راجا نے انحراف کیا تو ریاست کا الحاق کر کے اسے مقبوضاتِ اسلامی میں شامل کر لیا گیا) ترائن کی لڑائی کے بعد سلطان غزنی واپس چلا گیا اور ہندوستان میں قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا۔ جس نے فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور مفتوحہ علاقے میں نظم و نسق قائم کیا۔ دو سال کے بعد سلطان پھر آیا اور قنوج کے طاقتور راجا جے چند کو شکست دی۔ اس دوران میں قطب الدین ایبک نے گجرات، گوالیار، بیانہ اور بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر دیے۔ ۱۲۰۶ء میں کھوکھروں[۱] نے بغاوت کی اور سلطان نے

---

[۱] یہ قوم بقول فرشتہ دریائے نیلاب (سندھ) اور شوالک کی پہاڑیوں کے درمیان رہتی تھی لیکن ان کی تاخت و تاراج کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ مسلمانوں سے انھیں خاص طور پر عداوت تھی جو مسلمان انھیں ملتا اسے طرح طرح کی تکالیف دے کر مار ڈالتے۔ بالخصوص ان مسلمانوں کو جو سلطان کی طرف سے پشاور اور اس کے گرد و نواح میں مامور تھے، وہ اتنا تنگ کرتے کہ وہ بفراغت پنجاب کی طرف آمد و رفت نہ کر سکتے تھے۔ کھوکھروں کا کوئی دین و مذہب نہ تھا۔ دختر کشی ان میں عام تھی۔ جب کسی کے گھر بیٹی پیدا ہوتی تو وہ اسے اپنے دروازے پر لا کر آواز دیتا کہ کوئی ہے جو اس دختر کو اپنی زوجیت میں قبول کرے۔ اگر کوئی شخص قبول کرتا تو اسے لڑکی دے دیتا۔ ورنہ اسے ہلاک کر دیتا۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے اور قاعدہ تھا کہ جو شوہر اس عورت کے پاس جاتا وہ دروازے پر اپنا نشان چھوڑ جاتا تاکہ دوسرے شوہر یہ نشان دیکھ کر پلٹ جائیں۔ یہ

(باقی اگلے صفحے پر)

خود ہندوستان آگر انھیں شکست فاش دی۔ یہ بغاوت فروکر کے سلطان واپس جارہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک اسمٰعیلی فدائی نے اسے شہید کر دیا۔
طبقاتِ ناصری کا مصنّف اس سانحہ پر لکھتا ہے:۔

”شہادتِ آں پادشاہ در تاریخ شش صد و دو بود۔ ہمدریں سال اوّل قیامت علامت ظاہر شد۔ و آں خروج چنگیز خاں مغل بود و خروج ترک پس معلوم شد کہ آں پادشاہ در دُنیا در بند محکم اسلام بود چوں او شہادت یافت در قیامت باز شد۔“

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۳) جماعت مسلمانوں کی عقوبت کو ثواب عظیم کا ذریعہ مانتی تھی۔ لیکن سلطان محمدؒ غوری کے آخری ایام میں ایک مسلمان ان کے دستِ ظلم میں گرفتار ہوا اور اس نے اہلِ اسلام کے طور طریقے اس طرح بیان کیے کہ اس قبیلے کے سردار کو پسند آئے اور اُس نے اس مسلمان سے پوچھا کہ اگر میں سلطان محمدؒ غوری کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو جاؤں تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس مسلمان اسیر نے کہا کہ یقین ہے کہ وہ مراعاتِ شاہانہ روا رکھے گا اور اس کوہستان کی حکومت تمھیں سونپ دے گا۔ چنانچہ اس اسیر نے ایک خط اس سردار کی عرضداشت کے ساتھ سلطان کی خدمت میں بھیجا۔ وہاں سے خلعتِ فاخرہ اور کمر بند مرصع اس رئیس کے لیے ارسال ہوئے۔ اس پر وہ سردار سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطاعت اختیار کر کے اس کوہستان کی حکومت کا فرمان حاصل کیا۔ خود بھی مسلمان ہوا اور دوسرے کھوکھروں کو بھی مسلمان کیا لیکن جو لوگ دُور کے علاقوں میں رہتے تھے، اپنے پُرانے طریقوں پر قائم رہے۔ بلکہ غوری کے اور بھی جانی دشمن ہو گئے۔ (ملخص از فرشتہ جلد اوّل ص ۵۹ - ۶۰)

تاریخ الفی میں لکھا ہے کہ جب ۶۰۱ھ میں سلطان محمدؒ غوری کو خوارزم میں شکست ہوئی تو شمال مغربی ہندوستان میں مشہور ہو گیا کہ وہ لڑائی میں کام آیا ہے۔ چنانچہ کھوکھروں نے بغاوتیں شروع کیں اور ان کا راجا جو مسلمان ہو گیا تھا، پھر سے غیر مسلم ہو گیا۔

کھوکھر اور گکھڑ، جو بعض تاریخوں میں خلط ملط ہو گئے ہیں، دو مختلف قبیلے ہیں۔ اب کھوکھر زیادہ تر خوشاب کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

سلطان محمدؒ غوری کی وفات سے اسلامی ہندوستان کو جو نقصان پہنچا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن اس مُلک میں سلطان کا کام ایک حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ جب سلطان شہید ہُوا اس وقت قریب قریب سارے شمالی ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ اور قطب الدین ایبک۔ محمدؒ بن بختیار خلجی۔ التتمش۔ ناصرالدین قباچہ اور دوسرے افسروں کا سلطان ایک ایسا منتخب گروہ چھوڑ گیا تھا جو اس کا کام جاری رکھ سکتے تھے۔

سلطان کے اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط ایک لڑکی تھی۔ جب اس کے درباری اس بات پر تاسف اور سلطان سے ہمدردی کا اظہار کرتے تو وہ مُسکرا دیتا اور کہتا کہ میرے اتنے غلام ہیں جنھیں مَیں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور جن کی تعلیم و تربیت پر مَیں نے بے حد محنت کی ہے۔ وہ سب فرزندوں کی طرح میرا نام روشن کریں گے!

خدائے تعالےٰ کی نظروں میں سلطان کی محنت اور دُور اندیشی مقبول ہوئی اور اس کے دلی منصوبے پُورے کرنے میں اس کے غلاموں نے وہ کارہائے نمایاں کیے جو بیٹوں سے بھی بن نہیں آتے۔ انھوں نے خاندانِ غلاماں کی بُنیاد ڈالی اور ہندوستان میں سلطان کا کام جاری رکھا۔

سلطان کی اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ اس کے دو وصف خاص طور پر تعریف کے لائق ہیں۔ وہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کے خلاف اس کے دل میں عناد۔ حقارت اور تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس نے بہت سی لڑائیوں میں ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر کام کیا۔

پنجاب کی اکثر لڑائیوں میں جموں و کشمیر کا ہندو راجا اس کے ساتھ تھا۔ ہندو تاریخ نگار لکھتے ہیں کہ ترائن کی دوسری لڑائی میں جب پرتھوی راج کو شکست فاش ہوئی تو قنوج کا طاقتور راجا جے چند سلطان محمد غوری کے پہلو بہ پہلو

صف آرا تھا۔ سلطان نے اپنی فتوحات کے بعد بھی یہاں کے ہندو خاندانوں سے دوستی اور مہر و مروّت کا سلوک کیا۔ پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد سلطان نے اجمیر کی حکومت پرتھوی راج کے بیٹے کو سونپ دی۔ لیکن جب اس کے چچا نے جو ترائن کی شکست کے بعد الور کی پہاڑیوں میں جا چھپا تھا اجمیر پر حملہ کر کے اپنے بھتیجے کو نکال دیا تو سلطان کے نائب قطب الدین ایبک کو پھر سے اجمیر فتح کرنا پڑا اور اس وقت وہاں ایک مسلمان گورنر مقرر ہوا۔

ہندو تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ترائن کے معرکے میں جے چند جس کی پرتھوی راج سے عداوت تھی، مسلمانوں کا شریکِ کار تھا۔ لیکن یہی تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کے چند سال بعد وہ قطب الدین ایبک کے خلاف حملہ کرنے والا تھا کہ محمد غوری اور ایبک نے اس پر حملہ کر کے اسے شکست دی لیکن قنوج اس کے بعد بھی ایک مدت تک راجا جے چند کے خاندان کے پاس رہا۔

ڈاکٹر تارا چند اپنی "مختصر تاریخ اہلِ ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ قنوج کے راجا کو محمد غوری نے شکست دی لیکن جے چند کے وارث التمش کے وقت تک اس شہر پر حکمران رہے وہ مسلمان شہریوں سے ایک طرح کا جزیہ لیتے تھے، جسے ترشکا ڈنڈ کہا جاتا تھا۔"

سلطان محمد غوری کی معتدل مزاجی اور محمد بن قاسم کی طرح ملکی رسوم و آئین کے پاس کی ایک دلچسپ یادگار اس کے بعض سکے ہیں۔ جن پر حروف اور عبارت ہندی زبان میں ہے اور جن میں سے بعض سکوں پر سلطان کے ساتھ پرتھوی راج کا نام درج ہے!

سلطان کی دوسری بڑی خوبی اس کی وفاداری تھی۔ ہندوستان میں اکثر فتوحات اُس زمانے میں ہوئیں جب افغانستان کے تخت پر اس کا بھائی سلطان

ؔ ملاحظہ ہو طبقاتِ ناصری کے انگریزی ترجمہ پر میجر ریورٹی کا حاشیہ

غیاث الدین غوری متمکن تھا۔ اور محمدؒ غوری ایک طرح سے اس کا نائب اور سپہ سالار تھا۔ اگر خود مختاری کی ہوس اسے للچاتی یا ضد اور غصہ طبعیت پر غالب آجاتا تو محمدؒ غوری کے لیے اپنی بادشاہت کا علم بلند کرنا مشکل نہ تھا۔ (اور سلطان محمود غزنوی کے بیٹے اور بعد میں مغل شاہزادے بھائی بھائی ہونے کے باوجود جس طرح آپس میں لڑے ہیں اسے دیکھ کر کسی کو اس فعل پر حیرت نہ ہوتی!) لیکن محمدؒ غوری کا رویہ ایک وفادار جرنیل اور محبت بھرے بھائی کا رہا۔ اس نے ہمیشہ اپنے بڑے بھائی کے مرتبے کا خیال رکھا۔ تمام مہموں اور ملکی امور میں اس کی خواہش کی پیروی ہوتی۔ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا، اس میں سب سے قیمتی تحفے (مثلاً فرمانروائے قنوج کے ہاتھی) سلطان غیاث الدین غوری کو نذر ہوتے۔ غیاث الدین ہندوستان کبھی نہیں آیا۔ لیکن اس کے بھائی نے اس ملک میں اس طرح اس کا بھرم رکھا ہوا تھا کہ قطب مینار پر سلاطینِ ہند و دہلی کی جو فہرست کندہ کی گئی۔ اس میں سب سے اوپر اسی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ جب غیاث الدین کی وفات ہوئی اور سلطان محمدؒ غوری اس کا جانشین ہوا تو نئے بادشاہ نے اپنے بھائی کے لواحقین اور قبیلہ داروں کا پورا پورا خیال رکھا۔ سلطنت کے وسیع خطے انھیں نیابت اور حکمرانی کے لیے دیے اور ان کا وہی ادب و احترام قائم رکھا جو سلطان غیاث کی زندگی میں انھیں حاصل تھا۔

سلطان محمدؒ غوری کے اس وصفِ وفاداری اور اخلاقی شرافت کا نتیجہ تھا کہ اس کے امیر اور جرنیل بھی اس پر جان دیتے تھے اور جس طرح ایک سعادت مند بیٹا اپنے باپ سے اور ایک عقیدت مند مرید اپنے پیر سے ارادت و عقیدت رکھتا ہے۔ اسی محبت و عقیدت سے وہ اپنے بادشاہ کو دیکھتے۔ بلکہ اپنی کامیابیاں اور فتوحات کو سلطان کی کرامات سمجھتے اور اپنی شکست کو یُمنِ سلطانی سے محروم ہو جانے کا نتیجہ۔ اس کی ایک دلچسپ مثال محمدؒ بن بختیار خلجی کے حالات میں نظر آتی ہے جو اپنے زمانے کا شاید سب سے من چلا جرنیل تھا۔ اس نے بہار اور بنگالہ

کے وسیع علاقے اسلامی حکومت میں شامل کیے۔ بنگالے کی راجدھانی اس نے فقط اٹھارہ سواروں کی مدد سے فتح کی۔ ایک دفعہ سلطان قطب الدین ایبک کے سامنے اس نے مست ہاتھی پر گُرز کا ایک ایسا وار کیا کہ ہاتھی کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ لیکن یہ دلیری بالآخر اُسے پُرخطر منزلوں میں لے گئی۔ بہار اور بنگالہ کی فتح کے بعد اس نے پہلے آسام میں کامروپ کا علاقہ فتح کیا[1] اور پھر اس راستے سے تبت پر چڑھائی کی۔ لیکن راہ کی دُشوار گزاری۔ پہاڑی قبیلوں کی مزاحمت اور ساتھیوں کی آرام طلبی کی وجہ سے یہ مہم بالکل ناکام رہی اور محمدؐ بن بختیار خلجی تھکا ٹوٹا فقط چند ہمراہیوں کے ساتھ واپس لوٹا۔ شکست کے احساس اور مسلمان سپاہیوں کے اتلافِ جان کا خلجی سردار کو بڑا صدمہ ہُوا اور وہ بالآخر اسی غم میں گُھل گُھل کر (مشرقی بنگال میں مقام دیوکوٹ پر) وفات[2] پا گیا۔ لیکن تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ

---

[1] عام کتبِ تواریخ میں محمدؐ بن بختیار خلجی کی فتح کامروپ کا ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں آسام کے ایک انگریز افسر نے ۱۸۴۰ء میں ان مقامات کی توضیح کی تھی جہاں سے محمدؐ بن بختیار خلجی کا لشکر گزرا تھا اور ثابت کیا کہ یہ سب کچھ کامروپ کو زیر کرنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد یہ افسر لکھتا ہے کہ اگر اس بات کا خیال کریں کہ اس زمانے میں ابھی گولہ بارود کی ایجاد نہ ہوئی تھی اور اسلحہ کے لحاظ سے حملہ آوروں کو مقامی باشندوں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ تو باوجودیکہ تبت کی مہم ناکام رہی۔ لیکن جس طریقے سے کامروپ کی پہاڑیوں اور دُشوار گزار راستوں سے خلجی اپنا لشکر لے کر گیا۔ اسے دیکھ کر ہندوستان کے ابتدائی مسلمان فاتحین کی خوش تدبیری، مُستعدی اور ہمت پر آفرین کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔" (جلد نہم شمارہ دوم)

[2] آج محمدؐ بن بختیار خلجی کا مزار تلاش کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ لیکن دیوکوٹ میں اس کے مرشد عطاءاللہ کا مزار برقرار ہے۔ اور وہاں ایک قدیم مسجد پر ۱۲۹۳ء کا ایک کتبہ بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:
[Studies in Indo Muslim History by Hodi wala P209]

ان سخت مایوسیوں کی گھڑی میں بھی کہا کرتا تھا کہ کیا ہُوا کہ مجھ پر بدقسمتی اِس طرح غالب آ رہی ہے۔ کیا خدانخواستہ سلطان محمدؒ غوری کو کوئی کسی طرح کا حادثہ پیش آیا ہے؟

"دوراںِ حادثہ بسیار بر زبان او رفت کہ مگر سلطان غازی معزالدین والدنیا محمدؒ سام را حادثہ اُفتاد کہ بخت ما برگشت۔"

اور امرِ واقعی بھی یہی تھا کہ سلطان محمدؒ غوریؒ نے اُسی زمانے میں شہادت پائی!

خاندانِ غلامان

غوری کی وفات کے بعد اس کے ترک افسروں نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ منتخب کیا۔ وہ محمدؒ غوری کا غلام تھا اور خاندانِ غلامان کا بانی۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے پہلے الپتگین اور سبکتگین بھی غلام تھے، لیکن اُنھوں نے ہندوستان میں کبھی حکومت نہ کی۔ ہندوستان کا پہلا خود مختار بادشاہ قطب الدین ایبک تھا، جو ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہُوا۔ اس نے فقط چار سال حکومت کی اور ۱۲۱۰ء میں ایک حادثے سے وفات پا گیا۔ اس کا مزار لاہور میں انار کلی بازار کی پچھلی جانب "زندہ دلانِ لاہور" کی بے حسی کا شکار ہے[۱]۔

اس وقت تک دہلی کی بادشاہت ابھی موروثی نہ ہوئی تھی بلکہ جس طرح رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہ نے خلفا انتخاب کیے۔ دہلی کے بھی پہلے بادشاہ اسی طرح منتخب ہُوا کرتے تھے۔

قطب الدین ایبک کی وفات پر اس کا لڑکا آرام شاہ تخت کا دعویدار ہُوا، لیکن اُمرا نے اس عہدے کے لیے التمش کو چُنا اور ۱۲۱۰ء میں وہ

---

[۱] سلطان محمود غزنوی کے مشہور غلام اور پنجاب کے "پہلے مسلمان گورنر ایاز کی (جو کشمیری النسل تھا) قبر لاہور کی رنگ منڈی کے متصل اب تک موجود ہے۔" آئینۂ حقیقت نما (از مولینا اکبر شاہ خان نجیب آبادی) حصہ اوّل ص ۱۸۰

تخت نشین ہوا۔ التتمش خدا ترس، قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس کے زمانے میں منگولوں نے ایران اور عراق میں تباہی مچانی شروع کی۔ التتمش نے ان کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کو اس مصیبتِ عظمیٰ سے بچائے رکھا۔ اس نے سلطنت دہلی کی بنیادیں مستحکم کیں۔ بغداد کے عباسی خلیفے سے ہندوستان کی بادشاہی کا خطاب حاصل کیا اور جب وہ ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں چل بسا تو قریباً سارا شمالی ہندوستان اس کے قبضے میں تھا۔ اس کی وفات کے بعد دس سال تک پھر ملک میں بدانتظامی رہی اور یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ ہوئے۔ ان میں سے ایک التتمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ تھی۔ اس کے عہدِ حکومت میں قرمطیوں نے دہلی پر یورش کی، لیکن کشت و خون کے بعد شاہی فوج اور مسلمانانِ دہلی نے انھیں مار بھگایا۔

سلطانہ رضیہ ہندوستان کی تنہا تاجدار خاتون تھی جو تختِ دہلی پر (نورجہاں کی طرح کسی سرپرست کے سہارے نہیں، بلکہ) خودمختارانہ تخت نشین ہوئی۔ اس مسئلے پر عوام الناس کی جو رائے تھی۔ وہ عصامی کی فتوح السلاطین میں دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ حقوقِ نسواں کے حامیوں کا ہی نہیں، بلکہ "نصفِ ملت" کے متعلق شریفانہ طرزِ خیال چاہنے والوں کا کام کس قدر مشکل ہے!

زناں جملہ در دام اہرمن اند | بہ خلوت ہمہ کارِ شیطاں کنند
نگر دن تواں بر زناں اعتماد | نشاید بر آہرمنان اعتماد
نیاید وفا از زناں ہیچ گاہ | وفا مرد شد ہم ز مرداں بخواہ
زناں در ملا خوشتر از گلشن اند | ولے در خفا بدتر از گلخن اند
چو شورید نفسِ زنِ پارسا | بہ خلوت دہد باسگے ہم رضا
بہ زن مرد اگر دستبندی کند | بر آں مرد زن ریشخندی کند
نشانِ خطر شد بہ ہر جا زن است | خصوص آنکہ ہم خیمۂ اہرمن است
نزیبد بہ زن تاج و تختِ شہاں | لحد شد مملکت قسمِ کار آگہاں

جہاں داری از زن نیاید نکو | کہ در اصل ناقص شدست عقلِ او
زن آں بہ کہ با چرخہ سازد مدام | کہ مستش کند مسندِ احترام
حریمش سزد پنبہ، غم ساغرش | خوش است غنچہ، دوکِ خنیاگرش
گلہ بر سرِ زن خردزاں نکرد | کہ شد وضع خاص از پئے فرقِ مرد
زنے کو طرب جوید و جاہ ہم | زشہوت تواند بد آزاد کم!
زن آں بہ کہ در پردہ باشد مدام | بہ محنت کند خوئے ہر صبح و شام
ہر آں زن کہ در پردہ خندد بلند | سرش زود بر خاک باید فگند

۱۲۴۶ء میں اُمرا نے ناصر الدین محمود کو تخت نشین کیا۔ وہ ایک درویش طبع بادشاہ تھا۔ سرکاری خزانے کو ہاتھ نہ لگاتا اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا۔ سلطنت کا نظم و نسق اس نے اپنے قابل وزیر (اور سُسر) غیاث الدین بلبن کو سونپ رکھا تھا۔ ناصر الدین محمود کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اولیا و صلحا کے نمونے پر تھی۔ انتظام سلطنت بلبن کے سپرد کر کے اسے کہہ رکھا تھا کہ میں نے تمھیں تمام اختیار دے دیے ہیں تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے کل کو حضرتِ بے نیاز کے حضور میں تمھیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ وہ خود اپنا اکثر وقت حجرے کے اندر عبادت اور تلاوتِ کلام مجید میں صرف کرتا اور مشہور ہے کہ دربارِ عام کے وقت وہ شاہی لباس زیب تن کر لیتا تھا۔ اور اس کے بعد خلوت میں جا کر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے رہتا اپنا گزارہ وہ کلام مجید نقل کر کے کرتا تھا۔ اور اس امر کی بھی بڑی احتیاط کرتا کہ اس کے لکھے ہوئے نسخے معمولی نرخ پر فروخت ہوں اور کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ وہ بادشاہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بدایونی کہتا ہے:۔

"وحکایاتِ دیگر غریب کہ مشابہ احوالِ خلفاے راشد باشد از و نقل می کنند"

سلطان ناصر الدین کی زندگی میں ہی امورِ سلطنت کی باگ ڈور اس کے باہمت وزیر بلبن کے ہاتھ میں تھی اور جب اس نے ۱۲۶۶ء میں وفات پائی تو

بلبن بغیر کسی مزاحمت کے بادشاہ ہوگیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن

اسلامی ہندوستان کے بادشاہوں میں بلبن ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ ہوا ہے۔ بلبن اصل میں ایک ترک امیرزادہ تھا۔ چنگیز خانی حملے میں گرفتار ہوا اور بغداد میں بطور ایک غلام کے بکا۔ وہاں ایک بزرگ جمال الدین بصری نے اسے خریدا اور تربیت کی۔ پھر وہ دہلی میں آیا۔ شروع میں ایک معمولی سپاہی بلکہ بہشتی اور فراش کا کام کیا۔ رفتہ رفتہ میر شکار اور امرائے چہل گانی کے زمرے میں داخل ہوا اور پھر تو نائب الممالک بن کر پوری سلطنت پر حاوی ہوگیا۔ اس کے عہدِ حکومت تک بادشاہ فقط امرا کا سرگروہ ہوتا تھا۔ لیکن بلبن کا بادشاہت اور ملوکیت کی نسبت ایک خاص نقطۂ نظر تھا جو اس کے پیشروؤں بالخصوص درویش مزاج اور سادہ طبع ناصر الدین محمود (بلکہ صوفی منش التمش[1]) کے طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا اور اس نے بادشاہ کو اس کے امراسے بہت بالا و برتر ایک جداگانہ ہستی بنا دیا۔

بلبن کا قول تھا کہ نبوت کے بعد خلقِ خدا کی خدمت کا سب سے عمدہ ذریعہ بادشاہت ہے۔ اس کے حقوق کا پاس ضروری ہے اور جو بادشاہ اپنا جاہ و حشم، رعب و دبدبہ قائم نہیں رکھتا وہ اپنے فرائض پوری طرح بجا نہیں لاسکتا۔ اور اس کی رعایا بغاوت اور دوسری خرابیوں میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

"رعایا در عصرِ بادشاہ بے حرمت و حشمت و ہول و ہیبت زند قرباد آورد و تمرد

---

[1] سلطان شمس الدین (التمش) بارہا بر سرِ جمع بگفتے کہ من چگونہ توانم خدائے تعالیٰ را شکر گزیم کہ مرا با عوان و انصار بزرگ گردانید کہ ایشاں ہزار بار بہ از من اند و ہر بار کہ ایشاں .... در دربار پیشِ من ایستادہ مے شوند من از بزرگی و سروری ایشاں شرمندہ میشوم و میخواہم از تخت فرود آیم و دست و پائے ایشاں بہ بوسم (برنی)

وطغیان رونماید۔ ہندوان سرتابی ہا کنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور و بسیاری زنا و لواطت و شراب خوردن و ناکردنی ہائے دیگر بدبخت شوند

(تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۴)

بعض پرانے امیروں کا قول بار بار نقل کیا کرتا تھا۔

"ہر بادشاہے کہ حرمت و حشمت خود در ترتیب بار و کوکبہ و سواری و نشستن و برخاستن بآداب و رسوم اکاسرہ محافظت نہ نماید و در جمیع احوال و اقوال و افعال و حرکات و سکنات او حشم پادشاہی مشاہدہ نشود رعب او در دل رعایا و ممالک او منقش نشود۔ ۔ ۔ و آنچہ بادشاہان را از محافظت حرمت و حشمت بادشاہی و ہول و ہیبت بار و سواری، ایتمار رعایا و انقیاد متمردان دست دہد از مہر و سیاست دست نہ دہد۔ تا رعب و حشمت و ہول و ہیبت بادشاہ در دل عوام و خواص و دور و نزدیک بلاد ممالک او منقش نہ شود حق رموز جہانبانی و مصالح جہانداری۔ چنانچہ باید و شاید گزاردہ نشود"۔

(تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۳۔۳۴)

وہ خود اپنی سواری و دربار اور جشن و جلوس میں بڑا اہتمام کرتا اور مورخین لکھتے ہیں کہ عہد بلبن میں جب کوکبہ شاہی نکلتا تو سو سو دو دو سو میل سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے۔ سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، سوار اور پیادے، ملوک اور امرا ساتھ چلتے۔ زابل و سیستان کے دیو پیکر نوجوان ننگی تلواریں لے کر بادشاہ کے گرد و پیش ہوتے۔ قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند ہوتی کہ بازار اور جنگل گونج اٹھتے بلکہ برنی کا بیان ہے کہ دربار شاہی میں وہ رعب و اہتمام ہوتا کہ باریاب ہونے والے سفیر اور ہندوستان کے رئیس و راجا بسا اوقات خوف سے گر پڑتے اور بے ہوش ہو جاتے!

بلبن اپنی خانگی زندگی میں بھی رعب و وقار کا بڑا خیال رکھتا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ بلبن اپنی تمام مدت بادشاہی میں کسی مجلس میں قہقہہ مار کے

نہیں ہنسا۔ اور نہ کسی کو جرأت ہوئی کہ اس کے سامنے قہقہہ مار کے ہنسے بلکہ وہ اپنے نج کے نوکروں اور خواجہ سراؤں سے بھی پورا تکلف اور اہتمام برتتا اور اس کے کسی خانگی نوکر نے بھی اسے کسی وقت کلاہ یا موزہ یا جوتے کے بغیر نہیں دیکھا!

جب بلبن تخت نشین ہوا تو شمس الدین التمش کے چالیس غلام تھے۔ جو سلطنت کے سیاہ و سفید پر حاوی تھے۔ وہ چہل گان یا خواجہ تاش کہلاتے تھے اور بادشاہ کے انتخاب و تعین میں ان کا ہاتھ ہوتا۔ خود بلبن ان میں سے ایک تھا۔ لیکن اس کا بادشاہت کی نسبت جو نظریہ تھا اس کا تقاضا تھا کہ بادشاہ امرا میں سے نہ گنا جائے بلکہ ان سے بہت بلندی پر ہو۔ چنانچہ بلبن نے ان کے اقتدار کو توڑ دیا اور جو امیر بادشاہ کے لیے کسی خطرے کا باعث تھا، اسے جاہ و منصب سے محروم کر دیا۔

اس جمہوری دور میں بلبن کے نظریہ بادشاہت سے اختلاف کرنے والے کئی ہوں گے (اور صحیح یہ ہے کہ بعض باتوں میں اس نے انتہا پسندانہ روش اختیار کی) لیکن اُس وقت ہندوستان کی اسلامی حکومت جن دو بڑے خطرات سے دوچار تھی ان کے مقابلے کے لیے ایک جری اور پُر ہیبت بادشاہ اور ایک مضبوط، دلیرانہ پالیسی کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ بلبن کو بادشاہ کے فرائض کا بھی اسی طرح احساس تھا، جس طرح اس کے حقوق کا۔

بلبن کا پہلا بڑا کام مُلک کا اندرونی نظم و نسق اور سلطنت کا باطنی استحکام تھا۔ یُوں تو اس کے نام کی اتنی ہیبت تھی کہ سوائے بنگالہ کی بغاوت کے (جو شروع سے بغاوتوں کی کثرت سے بلغاکپور کہلاتا تھا!) اسے کسی اندرونی مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا۔ لیکن مُلک کے عام انتظام میں بڑی اصلاح کی ضرورت تھی۔ ابتدائی اسلامی حکومت میں نئے حکمرانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ کھُلے میدان میں تو ان کے سامنے کوئی نہ ٹھہرتا۔ لیکن راجپوت، جاٹ، میواتی، کھوکھر

جب ذرا بھی موقع پاتے لُوٹ مار سے دریغ نہ کرتے۔ طبقاتِ ناصری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین محمود کے عہدِ حکومت میں ہر سال کوئی نہ کوئی اس طرح کا معرکہ ہوتا اور شہر دہلی کے گرد و نواح میں میواتیوں نے اس طرح بدامنی مچا رکھی تھی کہ ان کے ڈر سے شہر کے دروازے شام کو بند کر دیے جاتے اور کسی کو ہمت نہ پڑتی کہ شام کے بعد کسی بزرگ کی زیارت کے لیے ہی شہر سے باہر جا سکے بلکہ بعض اوقات تو میواتی شہر میں گھس کر وہاں بھی لُوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرتے۔

بلبن نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پہلا پُورا سال میواتیوں کے قلع قمع پر صرف کیا۔ جو ڈاکو ہاتھ آئے، انھیں عبرت ناک سزائیں دیں۔ شہر کے گرد جن جنگلوں میں وہ چھپ جاتے تھے، ان کا صفایا کیا۔ سڑکیں بنوائیں۔ گوپال گڑھ میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ شہر کے گرد جا بجا تھانے قائم کیے۔ جن میں افغان تھانیدار علاقے کا انتظام کرتے۔

اس فتنے کے انسداد کے بعد بادشاہ نے ملک کے دوسرے حصّوں کی طرف توجہ کی۔ اور دوآبہ کے علاقے پٹیالی، میرٹھ اور دوسری جگھوں میں وہی عمل دُہرایا جو دہلی کے گرد و نواح میں کامیاب رہا تھا۔

بلبن کا دوسرا بڑا کام منگولوں کا سدِّ باب تھا۔ اس کے پیشرو ناصر الدین محمود کے زمانے میں منگول کئی بار ہندوستان آئے تھے۔ لاہور کو اُنھوں نے کئی بار لُوٹا اور وہاں کے قلعہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس زمانے کا سب سے اہم مسئلہ یہی تھا۔ کیونکہ اب خطرہ فقط منگولوں کے مُنتشر دستوں اور ان کے منچلے سرداروں سے نہ تھا بلکہ ہلاکو خاں کی آنکھیں بھی ہندوستان کی طرف اُٹھتی تھیں، لیکن بلبن کے سلیقۂ جہانگیری کے سامنے اس کی ہمت نہ پڑی کہ ادھر قدم بڑھائے۔

بلبن نے فوج کی باقاعدہ تنظیم کی۔ عہدہ داروں اور امیروں کو مجبور کیا کہ وہ سپاہی اور سوار اور ان کا ساز و سامان باقاعدہ رکھیں سلطنت کی شمال مغربی

سرحد پر جا بجا قلعے تعمیر کرائے ۔ لاہور کے قلعہ کو دوبارہ پختہ کیا اور مغربی پنجاب میں اپنے سب سے قابل اور معتمد جرنیل معین کیے تاکہ وہ سرحد کی حفاظت کریں ۔

بلبن نے اپنی حکومت کی توسیع کی کوشش نہ کی ۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب اصل کام حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنا ہے ۔ اسے گجرات اور مالوے پر لشکر کشی کا مشورہ دیا گیا ۔ لیکن اس کا جواب یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میں یہاں سے جاؤں اور دہلی کا وہی حال ہو جو مغلوں کے ہاتھوں بغداد کا ہوا ہے[۵] !

بلبن نے توسیع حکومت کی کوئی کوشش نہیں کی ، لیکن اسے شکار کا بڑا شوق تھا اور اس میں وہ بڑا اہتمام کرتا ۔ سردی کے موسم میں وہ ہر روز ہزار سواروں کے ساتھ شکار کو جاتا اور دہلی سے ریواڑی تک بلکہ اس سے پرے گھوڑ دوڑ اور شکار کے بعد واپس آتا ۔ کسی نے ہلاکو خاں سے بغداد میں بلبن کے شکار کا ذکر کیا تو ہلاکو خاں نے کہا کہ بلبن ایک پختہ کار بادشاہ ہے ۔ بظاہر تو وہ شکار کے لیے جاتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد سواری ، نشانہ بازی اور سخت محنت کی مشق جاری رکھنا ہے تاکہ جب لڑائی کا موقع آئے تو وہ اور اس کے سوار اور ان کے گھوڑے تیار بر تیار ہوں ۔

اندرونی امن وامان اور خارجی حملہ آوروں سے ملک کے بچاؤ کے علاوہ بلبن کے نزدیک بادشاہ کا بڑا فرض عدل وانصاف کی ترویج تھا ۔ اور اس کا وہ سختی سے اہتمام کرتا ۔ اس کے زمانے میں جن امرا نے غریبوں پر ظلم کیے ، بلبن نے انھیں سخت سزائیں دیں ۔ بدایوں کے ایک جاگیردار نے ایک نوکر کو اتنا پٹوایا کہ وہ مر گیا ۔ جب بلبن بدایوں گیا اور مقتول کی بیوہ نے فریاد کی تو بلبن نے جاگیردار کے ساتھ بالکل وہی سلوک کیا جو اس نے اپنے نوکر کے ساتھ کیا تھا ۔ اور جس سرکاری خبر رساں نے اس واقعہ کی خبر بادشاہ کو نہ دی تھی ،

---

[۵] کیمبرج ہسٹری صہ ۷

اسے بھی عبرت ناک سزا دی۔ اس کے زمانے میں اس طرح کے کئی واقعات ہوئے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے بیٹے ایسا کریں گے تو میں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا۔

مذہب کی نسبت بھی بلبن کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا وہ باقاعدہ نماز پڑھتا۔ روزے رکھتا۔ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھتا۔ سفر و حضر کی حالت میں اپنے ورد و وظیفے جاری رکھتا۔ ہمیشہ باوضو رہتا۔ اس کے کھانے پر علما و مشائخ مدعو ہوتے اور طعام کے وقت مسائل دینی پر بحث ہوتی۔ نماز جمعہ کے بعد وہ سارے کوکبۂ شاہی کے ساتھ مولانا برہان الدین بلخی اور دوسرے علما کے مکان[1] پر جاتا۔ زیارتیں کرتا۔ جب کوئی عالم یا شیخ وفات پاتا تو اس کی نماز جنازہ پر حاضر ہوتا اور اس کے ورثا کو کپڑے اور تحفے دیتا۔

بلبن ایک متدین اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ لیکن امورِ ملکی میں وہ علما کے مشورے اور شرع کے فیصلے پر نہ چلتا بلکہ اپنی رائے اور ملکی مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا۔ برنی لکھتا ہے:-

"سلطان بلبن باآں چندیں شفقت و مہربانی و دلوہی و انصاف ستانی و روزہ و نماز بسیار کہ ذکر آں کردہ شد در سیاست بغی و طغیان ملکی قہارے و جبارے بودہ است و در باب طغات اصلا محابا نہ کردے و از جرم بغی لشکرے و شہرے برانداختے و در قسم سیاستِ ملکی سرِ سوزنے از رسوم جابرہ فرو نگزاشتے و در حالتِ قہر و سطوت پادشاہی خدا ناترسی را کار فرمودے و در کشتن و بستن بلغاکیان و سرتابان صلاحیت و دین داری را پشت دادے[2]۔"

وہ علانیہ کہتا تھا کہ امورِ ملکی سیاسی مصلحتوں کے پابند ہیں نہ کہ شرعِ فقہا کے۔ برنی لکھتا ہے:-

---

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۲۳۱ پر بلبن کی نسبت حضرت سلطان المشائخ کا ارشاد۔
[2] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۷

"و آنچہ صلاح ملک چند گاہ خود دانستے خواہ مشروع خواہ نامشروع آں را درکار آوردے[1]"

اس کے علاوہ اگرچہ وہ علما و فضلا کا قدردان تھا لیکن وہ ان کے عام طریقۂ تعلیم کو شاہزادوں اور امیر زادوں کے لیے موزوں نہ سمجھتا۔ جب اس کے بیٹے خانِ شہید اور بغرا خان ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور اتالیقوں نے آن کر پوچھا کہ شاہزادوں کو اب "نحو و صرف و فقہ" میں کن باتوں کی تعلیم دی جائے اور کونسے اُستادان کے لیے متعین ہوں تو بلبن نے جواب دیا کہ اب تم ان کے پہلے اُستادوں کو جامہ و انعام دے کر رخصت کرو۔ میرے بیٹوں کو آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں پڑھواؤ اور ان کی تعلیم و تربیت ان تجربہ کار بوڑھوں کے سپرد کرو جو تاریخ اور احوالِ بزرگان میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور امورِ ملکی میں شاہزادوں کی مناسب تربیت کر سکتے ہیں۔

بلبن ایک معاملہ فہم، باتدبیر اور قابل بادشاہ تھا۔ بلکہ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اسلامی ہندوستان کے سب سے اہم چار بادشاہ کون سے گزرے ہیں اور اگر سلطان محمد غوری قدس سرہ کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے کہ ع

شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

تو علاء الدین خلجی، جلال الدین اکبر اور اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ ساتھ ہمارے ذہن میں چوتھا نام بلبن کا آتا ہے۔ جس نے اپنے چالیس سالہ زمانِ اقتدار میں (پہلے ناصر الدین محمود کے وزیر خود مختار کی حیثیت سے اور پھر تختِ شاہی پر بیٹھ کر) ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس کا ہماری تاریخ میں ایک خاص مرتبہ ہے، لیکن اتنا ضرور ماننا پڑتا ہے کہ وہ سخت گیر تھا۔ اور "زمانہ سخت گیراں را سخت گیرد"۔ اس کا انجام بڑا حسرت ناک ہوا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۴۷

بلبن کے دو[1] بیٹے تھے۔ خان شہید اور بغرا خان۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ خان شہید نہایت قابل اور ہونہار لڑکا تھا۔ باپ کی ساری امیدیں اس سے وابستہ تھیں۔ اسے سلطنت کی اہم ترین مہم یعنی منگولوں کی روک تھام سونپی گئی تھی۔ اور انھی فرائض کی بجا آوری میں شہزادہ شہید ہُوا۔

خان شہید کی وفات نے بلبن کی کمر توڑ دی۔ وہ تن برضائے قضا دے کر امورِ سلطنت میں مشغول رہتا اور اپنا دردِ نہانی لوگوں پر ظاہر نہ کرتا۔ لیکن راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بے اختیار روتا اور کہتا ؂

زگلبن ریختہ گلبرگِ خنداں	چرا بر من نہ گردد باغ زنداں
پریدہ از چمن کبکِ بہاری	چرا چوں ابر نخروشم بزاری
فرو مُردہ چراغِ عالم افروز	چرا روزم نگردد شب بدیں روز

چند دنوں کے بعد بادشاہ نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خاں کو بنگالے سے بُلا بھیجا کہ اب تخت کا وارث تیرے سوا کوئی نہیں۔ تیرا بیٹا کیقباد اور خانِ شہید کا بیٹا کیخسرو کم سن ہیں اور امورِ ملکی سنبھالنے کے ناقابل۔ تم ہی آ کر امورِ سلطنت میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ بغرا خاں بنگالے سے دہلی آیا۔ لیکن جب اس نے یہاں آ کر دیکھا کہ بلبن ابھی چند روز اور جئے گا تو شکار کے بہانے لکھنوتی واپس چلا گیا۔ بیٹے کی اس بے رُخی نے بلبن کی صحت کو اور بھی تباہ و برباد کیا اور وہ بالکل نحیف و بے جان

---

[1] بلبن کو ملکی مصلحتوں کی جُزئیات کا اتنا خیال رہتا تھا کہ اس نے خود ان کی بنا پر اپنی اولاد کی تعداد بڑھنے نہ دی۔ برنی کی کتاب میں اس کا بیان نقل ہُوا ہے۔

من میتوانم از زنان و کنیزگان پسران و دختران بسیار بزایم ولیکن از بزرگانِ دین و دولت شنیدہ ام کہ بادشاہ را پسران و دختران بسیار نشاید چہ اگر....

اس کے بعد وہ مصلحتیں دی جن سے تاریخ مغلیہ کے جاننے والے بخوبی واقف ہیں، لیکن مقامِ عبرت ہے کہ بلبن نے سوچا کیا تھا اور ہُوا کیا!

ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ چونکہ بغرا خاں بلادِ مشرق کو چھوڑنا نہیں چاہتا، میرے بعد خانِ شہید کا بیٹا کیخسرو تخت نشین ہو، لیکن اس کی وفات[1] کے بعد وزیرِ سلطنت نے اس وصیت پر عمل نہ کیا اور کیخسرو کی بجائے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔

کیقباد تخت نشینی کے وقت اٹھارہ سال کا نوجوان تھا۔ اب تک اس کی تربیت بلبن کے زیرِ اثر بڑے ضابطے اور پابندیوں کے ساتھ ہوئی تھی تخت نشین ہونے کی بھی اسے کوئی امید نہ تھی۔ اب جو یکبارگی اس پر سے یہ پابندیاں ہٹیں، اور عیش و آزادی کے سارے سامان میسر آئے تو اس نے دل کھول کر دادِ عیش دینی شروع کی۔ اور عیش و عشرت میں وہ دسترس بہم پہنچائی کہ محمد شاہ "رنگیلا" بھی اس کے سامنے طفلِ مکتب نظر آتا ہے۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے "و از خبرِ غلبۂ عیش و عشرت سلطان معز الدین لولی و مسخرہ و مطرب و مطربہ از اطراف و جوانبِ عالم رُو بدرگاہِ او آوردند۔ و چوں ایں طائف را در ہند اقسام بسیار است، کارِ لہو و لعب رواجِ عظیم پیدا کرد و ابوابِ فسق و فجور مفتوح و نامِ غم و اندیشہ از دلِ خلق محو و منسی گشت و دائم مجلس سلطان از خوبرویان و خوش آوازان و مردم ظریف و ندمائے شیریں کلام مملو و معمور بود۔ و یک ساعت بے عیش و کامرانی نگزرانیدے"۔

کیقباد کی عیاشیوں سے ایک دو سال ہی کے اندر نظامِ سلطنت میں خلل آنے لگا۔ اس پر اس کے باپ بغرا خاں نے اسے نصیحت آمیز خط لکھے لیکن جب وہ بے اثر ثابت ہوئے تو خود فوج لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا تاکہ بیٹے کو سمجھائے۔ کیقباد بھی فوج لے کر مقابلے کو تیار ہوا۔ لیکن خوش قسمتی سے جنگ کی

---

[1] بلبن کا جو دبدبہ اور احترام تھا، اس کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ (بقول برنی) اس کی وفات کے چالیس روز بعد تک اس کے امرا اس کے مزار کے پاس فرشِ زمین پر سوتے رہے اور کوتوالِ دہلی فخر الملک نے تو یہ عمل چھ مہینے تک جاری رکھا۔

نوبت نہ آئی اور سمجھ دار اور فرض شناس اُمرا (مثلاً شمس الدین دبیر) نے باپ اور بیٹے کی ملاقات کا انتظام کیا۔ جس کے دوران میں بغرا خاں نے بیٹے کو سمجھایا کہ اپنے طور طریقے بدل دے ؂

نشاید بادشاہ را مست بُودن	نہ در عشق و ہوس پیوست بُودن
بود شہ پاسبانِ خلق پیوست	خطا باشد کہ باشد پاسباں مست
شباں چوں شد خراب از بادۂ ناب	رمہ در معدۂ گرگاں کند خواب
در آئینے کہ رسمِ ملک داری ست	ثباتِ کار ہا در ہوشیاری ست

اسی پند و نصیحت کے دوران میں بغرا خان نے کیقباد کو مذہبی امور کے متعلق بھی مشورے دیے۔ اور چونکہ ان سے اس زمانے کی مذہبی حالت علما کی روش اور بلبن کی مذہبی باقاعدگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم برنی کے متعلقہ اقتباس کا ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں۔

بغرا خاں نے بیٹے سے کہا: "مَیں نے سُنا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتے اور ماہ رمضان میں روزے نہیں رکھتے اور ایک حیلہ گر عالم (حیلہ گرے از دانشمندانِ بے دیانت نا مسلمان) نے درہم و دینار کے طمع میں تم کو روزے ناغہ کرنے کی اجازت دے دی ہے اور تم سے کہہ رکھا ہے کہ اگر تم ایک روزے کے بدلے ایک غلام آزاد کر دو یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو تو تم کو روزے کا ثواب پہنچ جائے گا۔ تم نے یہ بات مان لی ہے، لیکن ایمان داروں کی یہ بات نہیں سُنی کہ جو شخص ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا وہ جوانی میں ہی چل بستا ہے۔

میرے بیٹے! تمھارا دادا (سلطان غیاث الدین بلبن) اکثر کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں بلکہ تمام مسلمانوں کو علمائے آخرت پر اپنا اعتقاد و عمل رکھنا چاہیے اور حیلہ گر تاویلیوں کو اپنے سامنے ہی نہیں آنے دینا چاہیے اور نہ ہی ان کے حیلہ و تاویل کو اپنا اساسِ کار بنانا چاہیے۔

"مَیں نے اپنے والد سے بارہا سُنا ہے کہ علما کے دو طبقے ہیں ایک تو علمائے آخرت،

جنھیں خدا تعالٰے دُنیا اور اس کی محبت اور حرص و لالچ سے بچائے رکھتا ہے اور دوسرے علماے دُنیا' جو دُنیا کی محبت اور طمع و لالچ میں کُتوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ امرا کے مکانوں پر جاتے ہیں اور ان کا کام حیلہ و تاویل اور قضا و بلا بن جاتا ہے۔ سمجھ دار اور دیندار بادشاہ وہ ہوگا جو علماے دنیا کے کہنے پر عمل نہ کرے۔ اور ان علما کے ہاتھ میں جنھیں دُنیا جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اوامر و احکام شرعی نہ دیدے۔ دینی مسئلے بھی ان حریصوں اور لالچیوں سے جو فی الحقیقت دُنیا کی پرستش کرتے ہیں' نہیں پوچھنے چاہئیں۔ اور اگر دینی اور دنیوی فلاح کی خواہش ہے تو احکامِ شرعی کی تعمیل ان علما کے حوالے کرنی چاہیے جنھوں نے دُنیا کی طرف اپنی پُشت کر دی ہے۔ اور درہم و دینار کو سانپ بچھو کی طرح سمجھتے ہیں۔ مذہبی مسائل بھی انھیں علما سے پُوچھنے چاہئیں۔

میرے بیٹے! تم اپنے دادا' بلبن کی خدمت میں رہے ہو اور دیکھا ہے کہ وہ روزہ و نماز' فرائض و نوافل میں کس قدر مشغول رہتا تھا۔ کسی عالم اور کسی شیخ کو اس طرح نماز و روزہ کی طاقت نہ ہوئی ہوگی۔ اگر سلطان بلبن کو پتا چلتا کہ ہم دو بھائیوں (یعنی خان شہید اور بغرا خاں) سے ایک نماز فوت ہوگئی ہے یا ہم سوئے رہے ہیں اور فجر کی نماز با جماعت نہیں پڑھی تو وہ مہینا بھر ہم سے بات نہ کرتا۔ اور اگر دوسرے کسی سے بھی ایک نماز فوت ہو جاتی اور وہ بادشاہ کی خدمت میں جاتا تو وہ مُنہ پھیر لیتا۔

"اور میں نے بہت سے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ جو کوئی رمضان میں روزے نہیں رکھتا وہ جوانی میں مر جاتا ہے۔ اور جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ (اس ارتداد پر) اس کا خون مُباح ہو جاتا ہے۔

میرے بیٹے! موت کا وقت سخت ہوتا ہے۔ بالخصوص بادشاہوں کا جنھوں نے اِتنی نعمتوں سے حظ اُٹھایا ہوتا ہے۔ اور ان میں جوان بادشاہ کی موت اور بھی عذاب ناک ہوتی ہے جو تمام دُنیا کی حسرتیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

"میری آخری نصیحت یہ ہے کہ رمضان میں روزے رکھو اور جس طرح بھی ہو سکے نماز پڑھو اور ایک خدا طلب عالم کو اپنے پاس سے دُور نہ کرو۔ کیوں کہ اتنے ہزار لوگ غم دُنیا میں ہلاک ہوتے ہیں۔ اور وہ تمھارے دین کا فکر کرتا ہے۔"
(ص ۱۵۲۔ ص ۱۵۶)

اِس نصیحت و تلقین کے بعد بغرا خان نے بڑی محبت سے بیٹے کو الوداع کہا اور خود بلادِ شرقی کا رُخ کیا۔ کیقباد بھی چند روز تک باپ کی نصیحت پر عامل رہا اور شراب نوشی اور عیش کوشی سے اجتناب رکھا۔ جو اربابِ نشاط اس کے دربار سے وابستہ تھیں وہ روز بن سنور کر اور زیب و زیور سے آراستہ ہو کر اس کے سامنے آتیں کہ شاید متاعِ حسن دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگے لیکن چند دن بادشاہ نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور توبہ کا قصر برقرار رہا۔ اتنے میں ایک دن ایک منچہ جو دوسروں کی نسبت زیادہ قبول صورت تھا اور تیز و طرار بھی۔ ہنگام کوچ چترِ سلطانی کے سامنے آیا اور بڑی خوش الحانی سے یہ شعر پڑھا ؎

گر قدم بر چشمِ ما خواہی نہاد
دیدہ در رہ می نہم تا مے روی

اور ساتھ ہی کہا کہ اس غزل کا مطلع موقع کے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن سوءِ ادبی کے ڈر سے پڑھ نہیں سکتا۔ بادشاہ کا دل اس شوخ کے ناز و کرشمہ سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا اور توبہ کے گنبد میں دراڑ پیدا ہو گئی تھی، فرمایا:
"بخواں و مترس"۔ اُس نے پڑھا ؎

سرو سیمینا بصحرا مے روی
نیک بد عہدی کہ بے ما مے روی

سُلطان اس ماہ پیکر کی حرکاتِ دلفریب اور اس نشاط انگیز شعر کے اثر سے سکتے میں آگیا۔ باپ کی نصیحتیں یک قلم فراموش کیں اور بے اختیار ہو کر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ محفلِ نشاط آراستہ کی اور اسی منچہ کو ساقی بنایا۔ اُس نے

شرائط تواضع بجالا کر جام شراب مئے ارغوانی سے لبریز کر کے سلطان کے ہاتھ میں دیا۔ بادشاہ نے شعر پڑھا ؎

اگر ساقی تو خواہی بُود مارا
کہ میگویند کہ مے خوردن حرام است[1]

اور پیالہ نوش فرمایا۔ باقی امرا اور عمائد بھی اپنے اپنے خیموں میں مجالس عشرت آراستہ کر کے لہو و لعب میں مشغول ہوئے۔

دوسرے روز وہاں سے کوچ کیا۔ اب منزل بمنزل مجلس نشاط ترتیب دی جاتی حتےٰ کہ دہلی جا پہنچے۔ شہر دہلی کے رہنے والے سلطان کی آمد سے بڑے خوش ہوئے۔ ہر گلی کوچے میں جشن ہوئے اور عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا۔ برنی لکھتا ہے: "در دہلی از شادی رسیدن سلطان قبہ ہا بستند و گلہا آراستند و سرود گویان خوبرو و پاکوبان صاحب جمال از قدیم و جدید از سرود گفتن و پاکوفتن در قبہ ہا بالاے بر آوردند و خلق شہر بر جمال ایشاں عاشق تر و دیوانہ تر گشتہ۔"

کئی مہینے یہی حال رہا۔ لیکن ان ناعاقبت اندیشیوں کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ سلطان کثرت خمر اور عیاشی کی بدولت لاغر و ضعیف ہُوا۔ اور جلد ہی مرض فالج میں مُبتلا ہو کر حرکت کرنے سے عاجز ہو گیا۔ اس حالت میں چند ترکوں نے جن کے عزیز کیقباد کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، خلجی اُمرا کے اشارے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ ملک جلال الدین فیروز خلجی جو بااثر امیر تھا۔ اپنے مخالفوں کو قتل کروا کے تخت شاہی پر متمکن ہُوا۔ اور خاندان غلامان کا خاتمہ ہُوا۔

---

[1] ملاحظہ ہو برنی کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۵۸-۱۶۴)

عہدِ غلامان میں علم و ادب

عہدِ قطبی

ہم غزنویہ خاندان کے شعرا اور نثر نگاروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے آخری ایام میں لاہور اور ملتان علم و ادب کے دو اہم مرکز بن رہے تھے، لیکن جب سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو سر کیا اور اسے تمام مقبوضات ہند کا دار السلطنت قرار دیا تو یہ شہر بھی اسلامی علوم کا ایک بڑا مرکز بن گیا قطب الدین ایبک کے زمانے میں ہی یہاں مدرسوں کے قیام کی اطلاع ملتی ہے۔ افسوس ہے کہ ان مدرسوں کے نام باقی نہیں۔ اور یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس درجے کے تھے۔ لیکن عہدِ التتمش میں دو بلند پایہ مدرسوں معزیہ اور ناصریہ کے نام آتے ہیں۔ ان کا انتظام قاضی منہاج سراج مصنف طبقات ناصری کے سپرد تھا۔ اور جب سلطانہ رضیہ کے زمانے میں ملاحدہ اور قرامطہ نے دہلی پر حملہ کیا تو ان کے ایک گروہ نے مدرسہ معزیہ کو کافی نقصان پہنچایا۔ عجب نہیں کہ یہ مدرسہ سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں قائم ہوا ہو اور اس سے سلطان معز الدین غوری کی یادگار باقی رکھنا مقصود ہو۔

سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں ایک اور دور دراز ملک میں مدرسے قائم ہونے کا ذکر آتا ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمد غوری کے مشہور سپہ سالار بختیار خلجی نے بنگالہ اور بہار فتح کیا۔ تو اس نے شہر رنگ پور بسایا اور وہاں اور دوسرے شہروں میں کئی مدرسے تعمیر کرائے۔

سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں ایک دو شاعروں کے نام اور ان کا کلام ملتا ہے۔ ایک شاعر ملک الکلام بہاءالدین اوشی تھے جو بعد میں اوش چلے گئے اور وہاں کے شیخ الاسلام بنے۔ انھوں نے سلطان کی سخاوت کی ایک رباعی میں تعریف کی تھی:-

اے بخشش لک تو در جہاں آوردہ — کاں را کف تو کار بجاں آوردہ

از رشک کف تو خون گرفتہ دلِ کاں — وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ

دوسرے اہلِ قلم تاج المآثر کے مصنف تھے، جنھوں نے ہندوستان میں اقامت اختیار کی۔ ان کا نام نظام الدین حسن نظامی نیشاپوری تھا۔ تاج المآثر میں چھبیس[۲۶] سال کے حالات درج ہیں۔ اور قطب الدین ایبک اور شمس الدین کے عہدِ حکومت کے واقعات (بڑے انشاپردازانہ رنگ میں اور پیچ در پیچ طریقے سے) بیان ہوئے ہیں۔ مولانا حسن نظامی شاعر بھی تھے اور تاج المآثر میں موقع بہ موقع انھوں نے اپنا عربی و فارسی کلام درج کیا ہے۔

اس دور کے ایک اور قابلِ ذکر مصنف فخر الدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر غزنوی ہیں۔ جن کی ساری عمر ہندوستان میں گزری۔ ان کی کتاب سلسلۃ الانساب سلطان قطب الدین ایبک کے نام پر معنون ہے۔ شروع میں عہدِ قطبی کی مختصر تاریخ ہے جو تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے طبع بھی ہو گئی ہے۔ فخر مدبر کی دوسری اہم کتاب آداب الحرب ہے جو فارسی زبان میں فنونِ جنگ پر بہترین کتاب ہے۔ اور التتمش کے نام پر لکھی گئی۔

ناصر الدین قباچہ کا دربار

اسی زمانے میں سندھ کے گورنر ناصر الدین قباچہ کے زیرِ حکومت (۶۰۲ھ سے ۶۲۵ھ تک) ملتان اور اُچہ کی علمی محفلیں بھی رونق پر تھیں۔ ان دنوں کھوکھروں کے ظلم و تعدی کی وجہ سے افغانستان و ترکستان سے آنے والوں کے لیے شمال مغربی پنجاب کی راہ بند تھی۔ اس لیے اکثر قافلے ملتان اور اُچہ کے راستے آتے۔ اور جو اہلِ علم فتنۂ چنگیزی سے بچنے یا سیر و سیاحت کے لیے ہندوستان کا رُخ کرتے وہ اپنے قدوم سے پہلے ان شہروں کو مشرف کرتے۔ چنانچہ مولانا منہاج سراج مصنف طبقاتِ ناصری اور سدید الدین محمد عوفی جو ناصر الدین قباچہ کی شکست و وفات کے بعد شمس الدین التتمش کے پاس دہلی گئے۔ پہلے قباچہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عوفی نے فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ دربارِ قباچہ میں تصنیف کر کے قباچہ کا نام زندہ جاوید کر دیا۔ قباچہ کے عہدِ حکومت میں ہی اُچہ کے ایک اہلِ قلم نے

سندھ کی پہلی تاریخ چچ نامہ ایک قدیم عربی کتاب سے ترجمہ کی۔ قباچہ کا وزیر عین الملک اشعری ادب کا بڑا قدردان تھا۔ عوفی اسے نظام الملک اور اسمٰعیل عباد کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ اس کی معارف نوازی کی وجہ سے دربار میں علما اور فضلا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء میں التمش نے قباچہ کو شکست دے کر سندھ کی خودمختار حکومت کا خاتمہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اُچہ اور مُلتان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

التمش کی علم دوستی سلطان قطب الدین ایبک کے عہدِ حکومت میں ہی کئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ہندوستان آگئے تھے لیکن سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ان میں بہت اضافہ ہُوا اور اس کی ایک وجہ حملۂ چنگیزی تھا۔ جس کے ڈر سے ترکستان، ایران اور افغانستان کے کئی امرا و علما اپنے وطنِ عزیز سے ہجرت کر گئے۔ اور چونکہ اس طوفان کے مقابلے میں خطۂ ہند و پاکستان اسلامی دُنیا کا سب سے بڑا ملجا و ماویٰ تھا اس لیے وہ کثرت سے اس سرزمین میں تشریف لائے۔ عہدِ شمسی کی نسبت طبقاتِ ناصری میں لکھا ہے:-

"و از اوّل عہد دولت و طلوع صبح مملکت در استجماع علمائے با نام و سادات کرام و ملوک و امرا و صدور و کبر زیادت از ہزار لک ہر سال بذل فرمود و خلائق اطرافِ گیتی را بر حضرت دہلی کہ دار الملک ہندوستان است و مرکز دائرہ اسلام و محیطِ اوامر و نواہیِ شریعت و حوزۂ دین محمدی و بیضۂ ملتِ احمدی و قبۃ الاسلام مشارق گیتی صانہا اللہ عن الانہاء و الآفات احضرہا السادات جمع آورد و این شہر بکثرت انعامات و تموّل کرامات آں بادشاہ دین دار محطِ رحال آفاق گشت۔ و ہر کہ از حبائل حوادث بلادِ عجم و نکبات کفار بفضلِ ایزدی خلاص یافت۔ ملاذ و ملجا و مہرب و مامن حضرت جہاں پناہ آن بادشاہ ساخت۔ و الیٰ یومنا ہذا آن قواعد امن و امان ممہد و مستحکم است و تا ابد چنیں باد۔" (ص ۱۶۶)

عہدِ شمسی کا ذکر کرتے ہوئے عصامی لکھتا ہے:-

غرض چوں کہ خورشیدِ روئے زمیں | شد التمش آں شمسِ دنیا و دیں
بہ دہلی چناں تخت گاہے بساخت | سپاہش در اقصائے آں ملک تاخت
دراں شہر یک رونقے شد پدید | بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیدانِ صحیح النسب | رسیدند در وے ز ملکِ عرب
بسے کاسبانِ خراساں زمیں | بسے نقشبندانِ اقلیمِ چیں
بسے عالمانِ بخارا نژاد | بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک و ہر جنس صنعت گراں | ز ہر شہر و ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدانِ جواہر شناس | جواہر فروشاں برون از قیاس
حکیمانِ یوناں، طبیبانِ روم | بسے اہلِ دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہرِ فرخندہ جمع آمدند | چو پروانہ بر نورِ شمع آمدند

یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد
دیارش ہمہ دارِ اسلیم شد

یہ عمل سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں اور بھی قوی ہو گیا جو عالی خاندان لوگ مغلوں کے حملوں سے بچ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے، بلبن نے ان کی بڑی قدر کی اور ان سے استحکامِ حکومت میں مدد لی۔

تاریخ فیروز شاہی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ شمس الدین التمش نے نہ صرف بیرونِ ہند کے علما کی قدر دانی کی بلکہ وہ بیرونِ ہندوستان سے اچھی اچھی کتابیں بھی منگواتا تھا اور اس ملک کے علمی خزائن کو مالا مال کرتا تھا۔ یہ اندراج سلطان غیاث الدین بلبن کے فرزند بغرا خاں اور پوتے کیقباد کی مشہور ملاقات کے متعلق ہے۔ بغرا خاں اپنی تعلیم و تربیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے والد کو یاد کر کے کہتا ہے:۔

"جب میں اور میرے بڑے بھائی (خان شہید) نے خطاط کے سامنے مفردات لغت اور نوشت و خواند ختم کر لی تو شاہی ملازم سلطان غیاث الدین بلبن

کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ اب شہزادے صرف و نحو اور فقہ میں سے کس چیز کی تعلیم حاصل کریں اور کونسے اُستاد اس مقصد کے لیے مقرر ہوں۔ بادشاہ نے جواب دیا خطاط کو خلعت اور انعام دے کر رخصت کیا جائے اور میرے بیٹوں کو دانا، مورخین اور سمجھدار اُستاد آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں جو بغداد سے سلطان شمس الدین التمش کے بیٹوں کے لیے لائی گئی تھیں، پڑھائیں اور اس کے بعد میرے بیٹے ان تجربہ کار اور کارشناس بوڑھوں کی صحبت میں رہیں، جو علمِ تاریخ اور احوالِ بزرگان میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور کم ہمت، گدا طبع لوگ ان کے قریب نہ آئیں۔ جو علم وہ جانتے ہیں اور سکھاتے ہیں وہ میرے بیٹوں کو امورِ مملکت میں مفید نہ ہوگا۔ اور جہاں تک نماز، روزہ، وضو کا تعلق ہے انھیں سکھانا لازمی ہے۔ لیکن اس قدر تو وہ سیکھ چکے ہیں۔" (ترجمہ از تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۴۔۱۴۵)

اس طویل اقتباس سے بلبن جیسے پابندِ مذہب بادشاہ کے ان خیالات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کے "نحو و صرف و فقہ" پر زیادہ زور دینے کے متعلق تھے!

سلطان التمش کے عہد میں نہ صرف آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں باہر سے منگائی گئیں بلکہ ہندوستان میں بھی کئی بلند پایہ کتب تصنیف یا ترجمہ ہوئیں۔ ایک معرکۃ الآرا کتاب آداب الحرب تھی جو سلطان شمس الدین کے نام پر تاریخ مبارک شاہ کے مصنف نے لکھی۔ عہدِ شمسی کا ایک اور فاضل ہوید جرجانی تھا۔ جس نے بادشاہِ وقت کے نام پر حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی احیاءالعلوم کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ التمش کا بیٹا رکن الدین فیروز ایک ناکام بادشاہ تھا، لیکن علم و ادب میں اس نے بھی دلچسپی لی اور امام رازی کی تالیف سرِ مکتوم کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ اردو بابت جنوری۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" پر علامہ حافظ محمود شیرانی کا فاضلانہ ریویو ص ۹۵

تاج الدین سنگریزہ

التمش کے عہد میں کئی شاعر اور ادیب تھے۔ ایک شاعر تاج الدین تھا جو اپنی کوتاہ قامتی کی وجہ سے ریزہ یا سنگریزہ کہلاتا تھا۔ وہ سلطان شمس الدین اور اس کے جانشین سلطان رکن الدین کے عہد میں دبیر الملک کے جلیل القدر منصب پر مامور تھا۔ اور اس نے مختلف قلعوں کی تسخیر یا اس طرح کے دوسرے موقعوں پر بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ۶۲۶ھ میں جب خلیفہ المستنصر باللہ کا سفیر بغداد سے سلطان کے لیے خلعتِ فاخرہ اور اسپِ تازی لے کر پہنچا تو سلطان نے ایک شاندار دربار منعقد کیا اور بڑے فخر سے خلعت کو زیب تن کیا۔ اس واقعہ کو شعرا نے یادگار کے طور پر قصائد میں نظم کیا۔ تاج الدین نے اس موقع پر جو قصیدہ لکھا اس کا مطلع ہے ؎

مژدہ عالم را از عالم آفریں آوردہ اند
زانکہ شہ را از خلیفہ آفریں آوردہ اند

جب التمش کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین جانشین ہوا تو تاج الدین نے بھی مدحیہ اشعار لکھے ؎

مبارک باد ملکِ جاودانی	ملک را خاصہ در عہدِ جوانی
امین الدولہ رکن الدیں کہ آمد	درش از یمن او رکنِ یمانی

مجمع الفصحا میں اس کے چند اشعار منتخب ہوئے ہیں ؎

چہ زلف است آں بیں بر روئے جاناں	کزو گردد پریشانی پریشاں
بہ مہر و ماہ طے خواہد ہمے جنگ	رخش پوشیدہ زاں از زلفِ خفتاں
چو شمشیر سش بخندد خصم گرید	بلے از خندۂ برق است باراں
کند عرش بنات النعش را جمع	چناں قہرش ثریا را پریشاں

وہ ہندوستانی ہونے پر فخر کیا کرتا تھا۔ کہتا ہے ؎

مولد و منشا ببیں در خاکِ ہندوستاں مرا
نظم و نثرم بیں کہ با آبِ خراساں آمدہ است!

امیر رُوحانی عہد شمسی کا ایک اور شاعر روحانی تھا۔ اس کا وطن بخارا تھا۔ لیکن جب یہ شہر چنگیز خاں کے ہاتھوں برباد ہُوا تو وہ ہندوستان آگیا اور سلطان شمس الدین کے خوانِ نعمت سے فیضیاب ہُوا۔ جب بادشاہ نے رنتھنبور اور مندور کے قلعے فتح کیے تو امیر روحانی نے لکھا ؎

خبر بہ اہلِ سما بُردہ جبرئیل امیں	ز فتح نامۂ سلطان عہدِ شمس الدیں
کہ اے ملائکہ قُدسِ آسمانہا را	بدیں بشارتے بندید کلۂ تزئیں
کہ از بلادِ ملاحد شہنشۂ اسلام	کشاد بارِ دگر قلعۂ سپہر آئیں
شہِ مجاہد و غازی کہ دستِ تیغش را	روانِ حیدرِ کرار میکند تحسیں

اس کے اور بھی کئی اشعار بدایونی نے نقل کیے ہیں ؎

قصۂ خویش از زبانِ قلم	کردہ ام یاد در بیانِ قلم
رقمِ رنج گوئیا بودہ است	بر خطِ عمر من نشانِ قلم
با قلم تا قریں شدم بجہاں	روزِ من گشت در جہانِ قلم

شعرائے دیگر ان کے علاوہ اور بھی کئی شعرا عہد شمسی میں موجود تھے۔ ایک شاعر ناصری تھا۔ جس کے ایک قصیدے کا ذکر فوائد الفواد میں ہے۔ یہ قصیدہ التمش کی تعریف میں تھا۔ مطلع تھا ؎

اے فتنہ از نہیبِ تو زنہار خواستہ
تیغِ تو مال و فیل ز کفّار خواستہ

اس پر بادشاہ کی طرف سے گراں قدر انعام ملا۔ ناصری کا ایک اور قطعہ آتشکدہ میں نقل ہُوا ہے ؎

از دُود دلت ہمہ دراست ماتم	وز درد آمدن ہمہ شب ماتمِ دگر
ترسم اگر حکایتِ غمہائے خود کنم	غمگیں شوی ازیں غم و آں غمِ دگر

دوسرا شاعر بہاء الدین علی تھا جو صدر کے عہدے پر مامور تھا۔ اور پھر ترقی کرتا کرتا بڑے مدارج پر پہنچ گیا۔ وہ ایک کامیاب سپاہی بھی تھا۔ اور

خوش طبع شاعر بھی۔

تیسرا شاعر اُستاد الشعرا شہاب مہمرہ تھا۔ جسے آج کل بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن جس کی اپنے زمانے میں اتنی شہرت تھی کہ امیر خسرو اپنے اشعار میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس طرح مرزا غالب اپنے اشعار میں میر تقی میر کا ؎

در بداؤں مہمرہ سرمست برخیزد زخواب
گر برآید غلغلہ مرغانِ دہلی زیں نوا!

بدایونی نے اس کے تین قصائد نقل کیے ہیں۔ لیکن ان میں زبان و بیان کی بڑی اُلجھنیں ہیں۔ ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الفم بلوح ہستی ہمہ ہیچ در نشانی	بہ بقائے غیر قائم زوجودِ خویش فانی
صفتِ الف ندارم کہ الف کجی ندارد	ہمہ نقش من کج آمد ز صحیفۂ امانی
دم مُلبل است و گل خوش من بے خبر چو سوسن	چو الف زباں ندارم چہ کنم بہ دہ زبانی
چُوں نگیرم آرمیدہ چہ دوم پس دویدہ	چو نہ بینم آشکارا چہ روم رہ نہانی
نہ چو آبم از طراوت نہ چو آتشم ز رفعت	نہ چو بادم از لطافت نہ چو خاکم از گرانی

اس دور کے کئی شعرا مہمرہ کے شاگرد تھے۔ اور مشہور شاعر عمید بھی ان میں شامل تھا۔

دوسرے اہلِ قلم یہ شعرا اور ادبا تو وہ تھے، جو زیادہ تر دربارِ شاہی یا سلطنت کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ لیکن ابتدا سے ہی ہندوستان میں فارسی ادب کی ایک ایسی شاخ نشو و نما پانے لگی جس کی آبیاری بادشاہوں کی سرپرستی سے نہیں بلکہ اہل اللہ کی مسیحا نفسی سے ہوتی تھی۔ ہندوستان میں قدیم صوفیہ نے نہ صرف اشاعت اسلام کا کام اپنے ذمہ لیا بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی وہ سب سے آگے تھے۔ ان کی اکثر تصنیفات کی قدر و قیمت آج اس درجہ کم ہو گئی ہے کہ حقیقت و معرفت کے جن مسائل کو اُنھوں نے اپنا موضوعِ قلم بنایا تھا۔ ان سے عہدِ حاضر کی مادی دُنیا کو بہت دلچسپی نہیں۔ لیکن ان تصانیف

کی دلچسپی ادب اور مذہب کے مورخ کے لیے برقرار ہے۔ ہندوستان میں شاید فارسی نثر کی سب سے پہلی تصنیف حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کی کشف المحجوب تھی اور اس کے بعد صوفیہ تصانیف کا یہ سلسلہ برقرار رہا۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مُبتینہ کلام کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔ ان کے ایک خلیفہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین صوفی ناگوری (متوفی ۱۲۷۴ء) تھے، جن کے مکتوبات مشہور ہیں اور اس فن انشا کی ہندوستان میں شاید پہلی مثال ہیں جس میں صُوفیہ عام اربابِ ادب سے بھی بازی لے جانے والے تھے۔ ان کی اور تصانیف بھی تھیں۔ جن میں اصُول الطریقہ کی شیخ عبدالحق محدث بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ملفوظات سرور الصدور بھی موجود ہیں۔ اس زمانے کے ایک اور اہل قلم (اور بالجملہ ایک مجموعہ اضداد بزرگ) قاضی حمید الدین ناگوری تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مُرید تھے، لیکن دہلی پہنچ کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے اور ان کے پائیں مزار دفن ہیں۔ وہ سماع کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں علما کی مخالفت کے باوجود بادشاہِ وقت سے اس کی اجازت لی۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں طوالع الشموس زیادہ مشہور ہے۔ اس میں اسمائے حسنہ کی شرح تصوّف وطریقت کی زبان سے لکھی ہے۔ ان کا ایک اور رسالہ عشقیہ جس میں عشق الٰہی کے مضامین شاعرانہ نثر میں بیان ہوئے ہیں، شائع ہو چکا ہے۔ جمالی نے لکھا ہے کہ طوالع الشموس کو سوائے "اہلِ کمال اور صاحب حال" لوگوں کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہی کیفیت عشقیہ کی ہے!

عہدِ ناصری کے اہل قلم

سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد چند روز سلطان رکن الدین اور پھر رضیہ سُلطانہ نے حکومت کی۔ اس کے بعد سلطان ناصر الدین محمود ابن سلطان شمس الدین تخت نشین ہُوا۔ اس کی سادہ زندگی اور درویش طبعی کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے زمانے کا

ایک مشہور شاعر اور شعرا کا سرپرست شمس الدین دبیر تھا۔ جسے حضرت سلطان المشائخ کے اُستاد ہونے کا فخر حاصل ہے اور جو دبیری، منشی گری، ندیمی، ملکی کے مراتب طے کر کے ایک زمانے میں "مستوفی ممالک ہندوستان" (یعنی وزیر خزانہ) ہو گیا تھا۔ تاج الدین سنگریزہ نے اس موقعہ پر لکھا تھا ؎

صدرا کنوں بکامِ دلِ دوستاں شُدی
مستوفیٔ ممالکِ ہندوستاں شُدی

بدایونی اس کی نسبت لکھتا ہے "آثارِ فضائل و کمالاتِ او از حدِ بیان بیرون از توصیف و تعریف مستغنی است۔"

بلبن نے جب اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم باختیار مقرر کیا تو دربارِ دہلی کے بعض ذی لیاقت اور قابلِ اعتماد لوگوں کو بھی اس کی ملازمت میں ساتھ دیا۔ ان میں شمس الدین دبیر تھا۔ جسے "منشی مملکتِ بنگالہ و کامرود" مقرر کیا گیا۔ منتخب التواریخ میں اس کا ایک قصیدہ درج ہے ؎

ایں ہمہ کارِ دلم از تو بنادانی خام	دادہ دوش مرا وعدہ جہانی خام
پختہ کردم بہ ترب چشم بدانستم کاں	طمعے بود ازاں گونہ کہ میدانی خام
پختہ دارم دل از اندیشۂ روئیت چو اُست	رنگِ تو پختہ ہمیں فقرہ پیشانی خام

یہ قصیدہ بغرا خاں کی تعریف میں ہے۔ اس میں والیٔ بنگالہ سے کہتے ہیں ؎

خسروا! شمس دبیر است قوی پختہ سخن	نیست چوں دفتریاں سوختہ دیوانی خام
ہست آویختہ شعرش چو زر ریختہ و نیست	تخنش ہچوں سخن پختہ مخاقانی خام

اس زمانے میں ایک اور شاعر عمید تھا۔ جس کا پورا نام ملک الکلام امیر فخر الدین عمید سنامی تھا۔ وہ ہندوستان کے تمام صُوبوں کا دیوان ہو گیا تھا۔ اس کے اشعار میں گرمی اور زور اور صفائی زیادہ ہے۔ حمد میں کہتا ہے ؎

برخیز عمید ار نہ فسردہ است دل تو	بگذر ز غزل حمد خداوندِ جہاں گو
مداحی درگاہِ خدا کن کہ برافراشت	بے زحمتِ آلات بلسے گنبدِ مینو

دو شاہ رواں کرد بریں طارمِ ازرق — پس دادہ ز سیارۂ شاں خیل زہر سو
صد شاہدِ اختر بگہ و شام نمودہ — مشاطۂ صنعش ز پسِ پردہ نہُ تو

ایک نعتیہ قصیدے کے اشعار ہیں ؎

اے زہیبِ حکمِ تو خم زدہ قامتِ فلک — خطبۂ کبریاے تو وحدہٗ لاشریک لک
ملکِ تو ملکِ ثابتست ملکِ تو ملکِ راستیں — ملک نہ ملکِ منقلب، ملک نہ ملک مشترک
پرتوِ نورِ قدسِ تو چہرہ کشاے صورمہ — گوشہ نشینِ ملکِ تو اوجِ سماک تا سمک

ایک اور قصیدے میں کہتا ہے ؎

مراست دیدہ محیط و خیالِ جاں کشتی — بر آبِ دیدہ، ز غم میکند رواں کشتی
در آبِ دیدہ شب ورزم و چگونہ بود — فراز و شیب ز خیلِ موج و در میاں کشتی
مرادِ دل چہ طمع دارم از جہانِ خسیس — چگونہ رانم بر روے ناوداں کشتی!

اس کا ایک حبسیہ قصیدہ بہت مشہور ہے ؎

منکہ چوں سیمرغ در یک گوشہ مسکن کردہ ام
ماوراے مرکزِ خاکی نشیمن کردہ ام

ہندوستان میں اسلامی فقہ کا آغاز

برِصغیر پاکستان و ہند میں فقہی مسائل کا آغاز اسی وقت سے ہوگیا تھا جب محمدؐ بن قاسم اور اس کے رفقاے کار کے بابرکت قدم اس سرزمین میں پہنچے۔ نئی مملکت میں نو واردوں کو جو مسائل حل کرنے پڑے۔ ان میں سب سے اہم غیر مسلم آبادی کی نسبت نئی حکومت کا نقطۂ نظر تھا۔ مقامی سندھی یا ہندو تھے یا بدھ مت کے ماننے والے۔ بہرکیف سارے بُت پرست تھے اور مصر، شام کے باشندوں کی طرح اہلِ کتاب نہ تھے۔ اس کے متعلق اسلامی قانون میں ایک واضح (اور روادارانہ) طریقِ کار

معین ہو گیا تھا لیکن عرب فاتح نے مقامی ہندوؤں اور بودھوں کو وہ تمام رعائتیں دیں، جو اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کو شریعتِ اسلامی میں حاصل تھیں ۔ مقامی عبادتگاہوں کے متعلق فتوح البلدان میں محمدؐ بن قاسم کا قول درج ہے کہ یہ بُت خانے ہمارے لیے" عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوسیوں کے آتش کدوں ہی کی طرح ہیں"۔ چچ نامہ میں بھی ایک جگہ یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں بلکہ یہ بھی وضاحت ہے کہ یہ احکام حجاج بن یوسف سے استصواب کے بعد جاری کیے گئے ۔ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ داہر کے دار السلطنت کے بُت خانے کی نسبت مقامی باشندوں نے درخواست کی کہ ہمارا بُت خانہ مسمار ہو گیا ہے ۔ امیر عادل ہمیں اجازت دیں تاکہ اس کی تعمیر کریں اور اپنے معبود کی عبادت کریں۔ " وایں بُت خانۂ ما خراب شدہ است ۔ و از خدمت اصنام بماندہ ایم ۔ امیر عادل ما را بفرماید تا عمارت تعمیر کنیم و در عبادتِ معبودِ خود باشیم ۔ (چچ نامہ ص ۲۱۳) چونکہ معاملہ نہ صرف بُت پرستی کی اجازت کا' بلکہ" خراب شدہ" بُت خانے کی تعمیر کا تھا۔ اس لیے امیرِ لشکر نے حجاج بن یوسف کو لکھ بھیجا ۔ وہاں سے جو جواب آیا' اس سے عربوں کے اس طریقِ کار پر جو اُنھوں نے پہلی صدی ہجری میں (یعنی ائمہ اربعہ کی تدوینِ فقہ سے بہت پہلے) اختیار کر رکھا تھا' روشنی پڑتی ہے ۔ حجاج نے لکھا:

" مکتوبِ عزیز پہنچا ۔ احوالِ مندرجہ سے آگاہی ہوئی ۔ برہمنا باد کے سربرآوردہ لوگوں نے اپنے مندر کی تعمیر اور اپنی قوم کے متعلق التماس کیا ہے ۔ (مقدمانِ برہمنا باد بجہتِ عمارت بدہ و ملت خود التماس می نمایند) ۔ جب ان لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے اور دار الخلافہ کی (طے کردہ) رقوم کی ادائگی کا ذمہ لیا ہے تو پھر ہمارا ان پر مزید حق نہیں رہتا ۔ اس لیے کہ اب وہ ذمی ہو گئے ۔ اور ان کے جان و مال میں ہمارا کوئی تصرّف نہیں ۔ اس لیے اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں اور کسی شخص کو اس کے مذہب کے متعلق ممانعت اور تنبیہ نہ ہو تاکہ وہ اپنے گھروں میں اپنی رائے کے مطابق رہیں سہیں۔"

[نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو]

چچ نامہ میں بعض احکام کی نسبت صراحت ہے کہ حجاج نے ان کے جاری کرنے سے پہلے "علمائے کوفہ و بصرہ" بلکہ خلیفۂ وقت (صہ ۲۲۸) سے استصواب کیا تھا۔ عجب نہیں کہ سندھ کے بُت پرستوں کو ذمیوں کا درجہ دینے سے پہلے یہی عمل روا رکھا گیا ہو!

سندھ میں محمدؒ بن قاسم کی واپسی کے بعد بھی ملکی معاملات میں یہ طریق کار جاری رکھا گیا۔ فقہی اور دینی نقطۂ نظر سے بعد میں یہاں کافی کشمکش شروع ہو گئی۔ امویوں کے جانشین عباسی تھے۔ ان کے زمانے میں ان کے مخالف فاطمی خلفا نے یہاں اپنی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے باب میں ذکر کیا ہے، بالآخر وہ کچھ عرصے کے لیے ملتان اور منصورہ پر قابض ہو گئے۔ اور وہاں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سندھ میں محدثین کی کافی تعداد تھی۔ جن کا ہم ذکر کر چکے۔ فقہا میں قاضی ابو محمد منصوری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جو اپنے مذہب ظاہری (داؤد ظاہری) کے امام سمجھے جاتے تھے۔ صاحب تصنیف تھے اور منصورہ کا عہدۂ قضاۃ ان کے سپرد تھا۔

عہد غزنوی کے علما کی نسبت ہماری معلومات بہت مختصر ہیں۔ لیکن ہنود کی نسبت (لڑائیوں کے زمانے کو چھوڑ کر) اب بھی وُہی طریق کار رہا۔ جس کی محکم مثال محمدؒ بن قاسم نے قائم کی تھی اور انھیں ذمیوں کا درجہ ملتا رہا۔ سلطان محمود کی فوج میں بھی ہندو دستے تھے۔ اور امیر مسعود کے تو کئی ہندو جرنیلوں کے نام ملتے ہیں۔ البتہ اس عہد میں دو اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ ایک تو سلطان محمود غزنوی نے ملتان اور منصورہ کی اسمٰعیلی حکومتوں کا خاتمہ کر کے اہلِ سُنت والجماعت کے طریقوں کو تقویت بہنچائی۔

---

[1] اصل عبارت کے لیے ملاحظہ ہو چچ نامہ مرتبہ ڈاکٹر داؤد پوتہ صہ ۲۱۳ یا دربار ملی صہ افسوس کہ اس مکتوب کا جو ترجمہ مولنا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے اپنی قیمتی کتاب تاریخ سندھ کے صہ ۹۳ پر دیا ہے۔ وہ کئی لحاظ سے غلط ہے۔

دوسرے لاہور کے غزنی کے تابع ہونے سے اس علاقے میں سیاسی اور فقہی امور میں مرکزی ایشیا سے روابط کا آغاز ہوا۔

محمد بن قاسم کی مثال اور عہد غزنوی میں اس کی پیروی سے ہندوؤں کے متعلق وہ روادارانہ طرزِ عمل قائم ہو گیا تھا۔ جس کی تائید فقہ اسلامی کے ائمہ اربعہ میں سے کم از کم تین کے طریقِ کار سے نہیں ہوتی تھی۔ جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ اور بالخصوص چنگیز خاں کے ظلم وستم سے پناہ لینے کے لیے التمش کے زمانے میں بے شمار علما و فقہا دہلی میں جمع ہو گئے (اور منگولوں کی لرزہ خیز چیرہ دستیوں سے کفر و اسلام کی کشمکش کا سوال نہایت خوفناک صورت میں سامنے آگیا) تو ہندوؤں سے طریقِ کار کا سوال پھر سے اُٹھایا گیا۔ برنی نے اپنی کتاب صحیفۂ نور محمدی میں اس واقعہ کی تفاصیل دی ہیں[1]۔ وہ لکھتا ہے کہ اب بہت سے علما نے کہنا شروع کیا کہ نہ تو ہندو اہلِ کتاب ہیں اور نہ اہلِ ذمہ۔ ان کے لیے تو ایک ہی حکم ہے کہ یا وہ اسلام قبول کریں یا زندگی سے دست بردار ہوں۔ چنانچہ وقت کے معتبر ترین علما سلطان شمس الدین التمش کے پاس پہنچے اور اس مسئلے کو شرح وبسط سے بیان کیا اور کہا کہ دینِ حنیفی کا تقاضا ہے کہ ہندوؤں سے فقط خراج و جزیہ پر اکتفا نہ کی جائے اور ان کے لیے "اما القتل و اما الاسلام" کا حکم جاری ہو۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ بات چیت کی اور پھر اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو حکم دیا کہ وہ علما کا جواب دے۔ اور عقل و مصلحت کی رُو سے جو طریقِ کار موزوں نظر آتا ہے۔ اس کی وضاحت کرے۔ چنانچہ وزیر نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی اور کہا کہ اگرچہ ہندو اہلِ کتاب نہیں اور نہ ہی اہلِ ذمہ ہیں، لیکن اس وقت ہندوستان میں ابھی ابھی ہماری حکومت قائم ہوئی ہے اور ہندوؤں کی تعداد اتنی ہے کہ مسلمان ان کے

---

[1] متعلقہ اقتباس دربارِ ملی کے ص ۷۸ - ۸۰ پر دیا گیا ہے۔

درمیان آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اگر ہم "اما القتل واما الاسلام" کا حکم جاری کریں تو عجب نہیں کہ سارا معاملہ دگرگوں ہو جائے اور ہر طرف ایک فتنہ برپا ہو جائے۔ وزیر کا جواب سننے پر علما نے بادشاہ سے کہا کہ اگر ہنود کے قتل کا حکم جاری نہیں ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہو کہ ہنود کی عزت آپ کے دربار میں نہ ہو۔ نہ ہی ہندوؤں کو یہ اجازت ہو کہ وہ مسلمانوں کے درمیان رہیں اور دارالسلطنت اور مسلمانوں کے قصبوں میں اس امر کا اہتمام ہو کہ وہاں کفر و بت پرستی کے احکام جاری نہ ہوں۔ چنانچہ بادشاہ اور وزیر نے یہ تینوں شرائط قبول کر لیں اور ہندوؤں کے قتل کا حکم جاری نہ ہوا۔

شیخ نورالدین مبارک غزنویؒ
سنہ ۱۲۳۴ء

سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں بے شمار علما و فقہا دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ بعض کے نام محفوظ ہیں۔ مثلاً قاضی فخر الائمہ قاضی (و شیخ) حمید الدین ناگوری، شیخ نظام الدین ابوالمؤید غزنوی، قاضی قطب الدین کاشانی، نجم الدین صغرا وغیرہ۔ لیکن ان میں سرفہرست سید نورالدین مبارک غزنوی کا نام ہے جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی است۔ مقتدا و شیخ الاسلام دہلی بود۔ و در زمان سلطان شمس الدین (التمش) او را امیر دہلی مے گفتند" (اخبار الاخیار ص ۲۸)

سید نورالدین مبارک غزنوی شریعت اور طریقت کے جامع تھے۔ وہ حسینی سید تھے۔ غزنی میں پیدا ہوئے۔ پہلے غزنی میں اپنے ماموں سے تعلیم پائی۔ پھر بغداد جا کر شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا۔ سلطان محمد غوری ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے ان کو شیخ الاسلام مقرر کیا تھا۔ لڑائیوں سے پہلے ان سے دعا کا طالب ہوتا تھا۔ (نزہت الخواطر ص ۲۰۲) غزنی سے وہ ہندوستان آئے۔ سلطان شمس الدین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ اور اپنی مہموں سے پہلے دعا کا طالب ہوتا۔

برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ایک طویل وعظ شیخ نورالدین مُبارک سے منسوب کیا ہے، جس سے ان کے اندازِ فکر بلکہ اس ابتدائی دَور کی ذہنی کشمکش پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ وعظ سلطان شمس الدین التتمش کی مجلس میں کیا گیا۔ اور اس میں بادشاہوں کے فرائض کا تفصیلی ذکر ہے۔ [برنی صہ ۴۱-۴۴] وعظ میں سیّد مبارک الدین غزنوی نے کہاکہ بادشاہوں کے جو طور طریقے ہیں "جس طریقے سے وہ کھاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ جو کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح وہ اُٹھتے بیٹھتے اور سواری کرتے ہیں۔ تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو اپنے سامنے بٹھاتے اور سجدے کراتے ہیں۔ خدا کے باغی قدیم ایرانی (اکاسرہ) حکمرانوں کے مراسم کی رعائت کرتے ہیں"۔ یہ دینِ مُصطفےٰ کے خلاف ہیں۔ بادشاہوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اسلام کے لیے "دین پناہ" بنیں۔ اور اس کے چار لوازمات ہیں۔ اوّل یہ کہ اسلام کی محبت کو برقرار رکھیں۔ اور اپنے زور و قوّت کو اعلاے کلمۃُ الحق اور شعارِ اسلام کو بلند کرنے اور امرِ معروف ونہیِ مُنکر میں صرف کریں۔ دوسرے، ان پر فرض ہے کہ اہلِ اسلام اور اسلامی شہروں اور قصبوں کے درمیان فسق وفجور اور گناہ و معصیت کو قہر وسطوت کے ذریعہ بالکل ختم کردیں۔ تیسرے یہ کہ احکام دینِ محمدی کے اجرا کے لیے صرف اہلِ تقویٰ، زاہد، خدا ترس اور دیندار لوگ مقرر کیے جائیں۔ اور بددیانت، دُنیا پرست لوگوں کے ہاتھ میں اختیار نہ دیا جائے۔ چوتھی ضرورت عدل وانصاف کی ہے۔ بادشاہ کی نجات اسی میں ہے کہ عدل وانصاف میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ اور ظلم وتعدّی اس کے مُلک میں بالکل نہ ہو۔

سیّد نورالدین مُبارک غزنوی کی وفات التتمش کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے ستمبر ۱۲۳۴ء میں ہوئی۔ حوضِ شمسی کے مشرق میں دفن ہوئے۔

صدرُالصُدور قاضی منہاج سراج جرجانی

اس زمانے کا ایک قابلِ ذکر عالم جس کی زیادہ شہرت بطور ایک ادیب اور مورّخ

کے ہے ۔ لیکن جس نے وقت کے فقہی رجحانات پر بڑا اثر ڈالا ۔ قاضی منہاج الدین بن قاضی سراج الدین بن منہاج الدین جُرجانی ہے ۔ اس کا ستارہ التتمش کی وفات کے بعد چمکا ۔ لیکن عہدِ شمسی میں بھی وہ ذمّہ دار عہدوں پر مامور رہا ۔

منہاج کے آباؤ اجداد جُرجان کے رہنے والے تھے اور اپنے علم وفضل کی بدولت بڑا مرتبہ رکھتے تھے ۔ اس کے دادا کے دادا امام عبدالخالق جُرجانی ایک خواب کے زیرِ اثر جُرجان چھوڑ کر غزنی آئے ۔ یہاں ان کی شادی سلطان ابراہیم غزنوی کی بیٹی سے ہوئی ۔ سلاطین غور بھی اس خاندان کے قدردان تھے ۔ بلکہ ان سے بھی اس خاندان کی قرابت داری قائم ہو گئی ۔ منہاج کے والد لاہور میں پیدا ہوئے ۔ اور جب لاہور پر سلطان محمد غوری کا قبضہ ہوا تو اُس نے اُنھیں وہاں کا قاضی مقرر کیا ۔ منہاج خود غوریوں کے دارالحکومت فیروز کوہ میں ۵۸۹ھ میں پیدا ہوا ۔ وہیں تعلیم پائی ۔ اور پینتیس سال کی عمر میں چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے متاثر ہو کر برِصغیر کا رُخ کیا ۔ وہ ۱۲۲۷ء میں اُچہ میں پہنچا اور ناصرالدین قباچہ نے اسے درسگاہِ فیروزی کا صدر معلم مقرر کیا ۔ لیکن ایک ہی سال بعد التتمش نے قباچہ کو شکست دی اور اُچہ اور ملتان پر قبضہ کر لیا ۔ واپسی پر منہاج التتمش کے ساتھ دہلی آگیا ۔ چار سال بعد وہ گوالیار کے محاصرہ پر موجود تھا ۔ گوالیار کی فتح کے بعد وہاں کا قاضی مقرر ہوا ۔ ۱۲۳۸ء میں وہ یہاں سے چلا آیا ۔ ۱۲۴۱ء میں بہرام شاہ نے اسے شہر دہلی کا قاضی اور صدرالصدور مقرر کیا ۔ لیکن بہرام شاہ کو تخت سے اُتار دیا گیا ۔ اور منہاج الدین نے بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ۔ اس کے بعد وہ دو تین سال لکھنوتی میں مقیم رہا اور رجب ۱۲۴۴ء میں دہلی واپس آیا تو اسے مدرسۂ ناصریہ کا مہتمم اور جامع مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا ۔ ۱۲۴۶ء کے شروع میں سلطان ناصرالدین محمود تخت نشین ہوا اور اب منہاج کا ستارہ پوری درخشانی سے چمکنا شروع ہوا ۔ سلطان ناصرالدین محمود اور بلبن دونوں اس کے قدردان تھے ۔ اور بالآخر انھوں نے اسے صدرِ جہاں کا خطاب دے کر تمام

سلطنت کا قاضی مقرر کر دیا۔

منہاج نے اپنی کتاب طبقاتِ ناصری ۶۵۹ھ / ۱۲۶۰ء کے قریب ختم کی اور اسے سلطان ناصر الدین محمود (متوفی ۱۳۲۶ء) کے نام منسوب کیا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً بہتر سال کی تھی۔ اپنی کتاب میں جا بجا اس نے اپنے متعلق تھوڑا بہت ذکر کیا ہے۔ لیکن ۱۲۶۰ء کے بعد اس کے متعلق کوئی اندراج نہیں ملتا۔ اور اس کی تاریخِ وفات کا بھی پتا نہیں۔

طبقاتِ ناصری دنیا کی عام تاریخ ہے جس کا ایک معقول حصہ ہندوستان کے متعلق ہے۔ اس میں سلاطینِ غزنہ سے لے کر سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے تک کے حالات اور ان برگزیدہ امرا و حکام کا تذکرہ ہے جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر متعین ہوئے۔

منہاج ایک باا ثر خطیب اور واعظ بھی تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں گوالیار کا محاصرہ ہوا تو مسلمانوں کو بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ گوالیار کا راجا ایک بہادر اور تجربہ کار جرنیل تھا۔ قلعہ بڑا مضبوط اور اس کے اندر بڑا ساز و سامان جمع تھا۔ گیارہ ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران میں علمائے اسلام (بحکمِ سلطانی) وعظ و تذکیر سے مجاہدانِ اسلام کا دل بڑھاتے تھے۔ چنانچہ منہاج سراج نے اس موقع پر ۹۵ مرتبہ وعظ کیا۔ بالآخر مسلمانوں کی ہمت اور استقلال کے سامنے راجے کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اس طرح جب التمش کے بیٹے بہرام شاہ کے عہدِ حکومت میں ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے لاہور پر حملہ کیا اور شہر فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو اس خبر سے دار الخلافہ میں بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ چنانچہ قصرِ ابیض میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں منہاج نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس سے بڑا جوش پیدا ہوا۔ اور جو لوگ بادشاہ سے بددل تھے انھوں نے بھی قومی خطرے کے مقابلے کے لیے ازسرِ نو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔

اس زمانے میں وعظ و تذکیر کا عام رواج تھا۔ اور منہاج بڑے با اثر خطیبوں میں سے تھا۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ مَیں ہر سوموار کو منہاج کا وعظ سُننے جایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے یہ رُباعی پڑھی ؎

لب بر لبِ لعلِ دلبراں خوش کردن   وآہنگ سرِ زلف مشوّش کردن
امروز خوش است لیک فردا خوش نیست   خود را چو خسے طعمۂ آتش کردن

سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ یہ اشعار کچھ اس طرح پڑھے گئے کہ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ اور بڑی دیر تک مَیں بے خود رہا۔

منہاج فقط قاضی، مورخ، شاعر اور خطیب نہ تھا بلکہ اس کے خاندانی تعلقات، وسیع علمیت اور مذہبی رنگ نے اسے ایک مُلکی اور سیاسی مدبّر (Elder statesman) کا درجہ دے دیا تھا۔ اور بعض موقعوں پر سلاطین و امرا نے اس سے سیاسی گتھیاں سلجھانے میں بھی مدد لی۔ مثلاً جب سلطان بہرام شاہ ابن التمش نے ایوب نامی ایک درویش کے کہنے پر ایک نامور فقیہ (قاضی شمس الدین) کو قتل کرا دیا اور وزیرِ سلطنت اور امرا اس کے مخالف ہو گئے تو اس نے منہاج کو، جسے اس نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا۔ باغیوں کو سمجھانے کے لیے بھیجا (گو منہاج اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہُوا) اسی طرح جب بہرام کے بعد علاء الدین مسعود بن رُکن الدین فیروز شاہ بادشاہ ہُوا اور والیٔ بنگالہ نے کڑہ مانکپور پر حملہ کیا تو منہاج کے سمجھانے بجھانے پر طغرل اور اس کے ساتھی بنگال واپس چلے گئے۔ اسی طرح اس نے ۱۲۴۵ء میں طغرل حاکمِ بنگالہ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ بنگالے کی حکومت نئے بادشاہ کے نامزد گورنر کے حوالے کر دے۔

منہاج کی زندگی کے کئی پہلو تھے۔ آج زمانہ اسے زیادہ تر بطور ایک مورخ کے جانتا ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں اس کی اصل اہمیت بطور ایک قاضی، عالم اور متکلّم کے تھی۔ اس نے دینی اور فقہی مسائل پر کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی

لیکن ان معاملات میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا، اس کے متعلق نہایت ذمّہ دار معاصرانہ شہادت موجود ہے۔ اور اس امر کا بھی صریح بیان ملتا ہے کہ اس کے نقطۂ نظر نے قومی زندگی کو متاثر کیا۔ اس زمانے میں سماع کا مسئلہ ارباب شریعت اور صوفیہ کے درمیان ایک بنیادی وجہ اختلاف تھا، جس سے ایک اہل الرائے کے اسلوب خیال، مذاق طبیعت، شعر اور موسیقی سے دلچسپی، احتیاط و پابندی اور آزاد خیالی کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ صوفیہ، بالخصوص حضرات چشت سماع کے دلدادہ تھے۔ لیکن اہلِ شریعت اس پر معترض تھے۔ منہاج، بطور قاضی ممالک اور صدر جہاں کے اہلِ شریعت کا امام تھا، لیکن اس کا جو رنگِ طبیعت تھا، اس کا بیان حضرت نظام الدین اولیاؒ کی زبانی سُنیے۔ فوائد الفواد میں جو ان کے ملفوظات کا مشہور مجموعہ اور فی الحقیقت اسلامی ہندوستان کی ابتدائی علمی اور روحانی تاریخ کا ایک بیش بہا مخزن ہے۔ منہاج کی نسبت ان کا بیان نقل ہُوا ہے۔ "کہ وہ صاحب ذوق مرد ہو گزرا ہے۔ ایک مرتبہ اسے شیخ بدر الدین غزنوی کے گھر بلایا گیا۔ وہ دن سوموار کا تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ جب میں وعظ سے فارغ ہوں گا تو آؤں گا۔ الغرض وعظ سے فارغ ہو کر حاضر ہُوا اور سماع شروع کیا تو دستار و جامہ سب کچھ پارہ پارہ کر ڈالا۔" (ص ۱۵۵)

فوائد الفواد میں ہی ہے کہ کسی نے قاضی منہاج الدین سراج سے کہا کہ تم قضا کے لائق نہیں۔ ہاں، اس قابل ہو کر شیخ الاسلام (یعنی صوفیہ کے سرگروہ) بنائے جاؤ۔ (ص ۲۰۵-۲۰۶) لیکن علم و فضل اور دماغی قابلیت نے منہاج کو قضائے مملکت کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ اس سے ان کی افتادِ طبع نہ بدل سکتی تھی۔ البتہ یہ نتیجہ ہُوا کہ دار القضا کے فیصلوں میں ایک آزاد خیالی آ گئی۔ بلکہ حضرت نظام الدین تو بالوضاحت کہتے ہیں کہ دہلی میں سماع کے رائج ہونے کے جو دو اشخاص ذمّہ دار ہیں، ان میں سے ایک قاضی منہاج الدین تھے ——

"فرمایا کہ اِس شہر میں سماع کا سکّہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے جمایا تھا۔

اور قاضی منہاج الدین نے جو قاضیٔ وقت اور سماع کا دلدادہ تھا۔ ان دونوں کی وجہ سے یہ عمل مستحکم ہو گیا۔" (ص ۱۹۵) قاضی حمید الدین نے سماع کی خاطر مباحثے بھی کئے۔ اور اس کے وہ پُرجوش حامی تھے۔ لیکن وہ قاضیٔ ممالک نہ تھے۔ منہاج تھا۔ جس کی خاموش حمایت سے بھی سماع کو بے انتہا سہارا ملتا تھا۔

منہاج سراج فقط ایک "صاحبِ ذوق" مردِ اور سماع کا دلدادہ نہ تھا بلکہ وہ ایک تجربہ کار اور وسیع النظر انسان اور امورِ ملکی میں پوری دسترس رکھنے والا مدبر تھا۔ اس کی اُفتادِ طبع، عملی سوجھ بوجھ اور وسیع النظری کی بدولت دارالقضا کے طریقِ کار میں بھی ایک آزاد خیالی اور وسعتِ نگاہ آگئی، جو شدید مخالفتوں کے باوجود اسلامی ہندوستان کی فقہی روایات کا ایک اہم عنصر رہی ہے۔

طبقاتِ ناصری کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ منہاج کے کئی بااثر مخالف تھے۔ ایک حد تک تو یہ مخالفتیں سیاسی تھیں۔ اس نے اپنے تئیں جلد بلبن سے وابستہ کر لیا تھا۔ (اور یہ انتخاب ہی اس کی معاملہ فہمی کی دلیل ہے) لیکن بلبن کے مخالف اب اس کے بھی مخالف تھے۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذہبی حلقوں میں بھی اس کی شدید مخالفت تھی۔ ایک مرتبہ تو عین جامع مسجد میں بعد نمازِ جمعہ اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ اس میں ایک حد تک تو مخالف وزیر کے ساتھیوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن منہاج صراحت کرتا ہے کہ ان کے ساتھ اس کے ہم پیشہ علما بھی تھے۔ عین صحنِ مسجد میں اس پر تلوار سے حملہ کیا گیا۔ لیکن منہاج بھی کچھ کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بفضلِ الٰہی میرے پاس بھی ایک چھُرا (کارد) اور عصا تھا۔ وہ مقابلے کے لیے اُٹھایا۔ اس کے علاوہ کئی مسلح غلام ہمراہ تھے۔ اس لیے کوئی گزند نہ پہنچا۔

منہاج نے طبقاتِ ناصری میں اپنے بزرگوں کے متعلق چند سطور لکھی ہیں۔ اور اپنے متعلق بھی بعض جزوی واقعات بیان کیے ہیں، لیکن اس نے اپنی اصل شخصیت پر ایک پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس کی اپنی طبیعت کا جو صوفیانہ رنگ تھا،

وہ فوائد الفواد سے ظاہر ہے، لیکن اس نے طبقاتِ ناصری میں (برنی، فرشتہ اور دوسرے مورخین کی طرح) کسی صوفی بزرگ کا تذکرہ نہیں لکھا۔ (چنانچہ گلزارِ ابرار میں اس بات کی شکایت ہے۔ کہ اس نے مشائخ زمانہ کو قطعی یاد نہ کیا)۔ اس کی صیح شخصیت اور کارناموں کا پورا اندازہ طبقاتِ ناصری سے نہیں ہوتا۔ ابتدائی دور میں اس کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ ہماری فقہی روایات کا سنگِ بنیاد رکھنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ قیامِ حکومتِ اسلامی کی پہلی نصف صدی کا اصل مورخ وہی ہے۔ پس پردہ جو کام اس نے کیا۔ اس کی نسبت فقط قیاس ہی ہمارا راہنما ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس اہم دور کی سب سے جلیل القدر ہستیوں میں سے تھا۔ اور شاید اسے التتمش، نظام الملک جنیدی کی طرح حکومتِ اسلامی کے ابتدائی معماروں یا Founding Fathers میں سے سمجھنا چاہیے۔

دار القضا میں معاملہ فہمی، حقیقت پسندی اور ایک فعال طریقِ کار کی جو روایات منہاج نے قائم کیں، انھیں اس کے نواسے صدر الدین عارف نے نباہا، جو ایک مدت تک قاضی ممالک کا نائب رہا۔ اور جسے علاء الدین خلجی نے تخت نشین ہونے کے بعد قضائے مملکت کی مسند سپرد کی۔ برنی لکھتا ہے کہ اگرچہ وہ علوم میں بے نظیر نہ تھا، لیکن مضبوط کیرکٹر کا حامل تھا۔ اور شہر والوں کے مزاج سے اس طرح واقف تھا کہ شہر کے چالاک اچکوں اور حیلہ گروں کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے سامنے مکر و فریب چلائیں۔ "دیوانِ قضا بہ صدرِ جہانی او رونق گرفتہ بود۔"

(ص ۳۵۱)

مولانا برہان الدین بلخی
۱۲۸۸ء

منہاج سراج اور قاضی صدر الدین عارف قضا کی بلند ترین مسند پر بیٹھے۔ ان کی پالیسی اور طریقِ کار نے فقہی روایات پر اثر ڈالا۔ لیکن علم فقہ کی تعلیم و تدریس کی بنیاد اور اس سرزمین کی قانونِ اسلامی کی سب سے زیادہ رائج کتاب ہدایہ کو فروغ دینے کا شرف اس زمانے کے ایک اور عالم کو حاصل ہوا۔ جن کا نام مولانا برہان الدین تھا۔

مولنا برہان الدین محمود بن ابوالخیر السعد بلخی، جو خالص مذہبی علوم میں منہاج سراج سے بہت بڑھے ہوئے تھے، بلخ میں پیدا ہوئے۔ فقہ ہدایہ کے مصنف شیخ برہان الدین مرغنیانی سے پڑھی۔ اور آپ ہی کا اثر تھا کہ ہدایہ اسلامی ہندوستان میں فقہ کی سب سے اہم اور اساسی کتاب ہو گئی۔

حدیث میں بھی آپ کا اُستاد ایک امام فن تھا۔ یعنی امام حسن صنعانی لاہوری۔ آپ نے ان سے مشارق الانوار کی سند حاصل کی۔ پھر ہندوستان میں تشریف لائے۔ اور دہلی میں مشارق الانوار کا درس شروع کیا۔ جس سے اس کتاب کو درسِ حدیث میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

ہدایہ کے مصنف نے آپ کو کم عمری کے زمانے میں دیکھا تھا۔ لیکن انھوں نے پیشین گوئی کی "ایں کودک چناں شود۔ کہ بادشاہاں بر درِ او بیایند"[1] چنانچہ یہی ہُوا۔ برنی لکھتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد بلبن پورے کوکبۂ شاہی کے ساتھ مولنا برہان الدین بلخی کے گھر پر جاتا۔ ان کی تعظیم و توقیر بجالاتا۔

حدیث میں آپ کے سب سے مشہور شاگرد علامہ کمال الدین زاہد تھے۔ جنھوں نے مشارق الانوار کی تحصیل آپ سے کی۔ اور پھر اس کا درس شروع کیا۔ ان کے فخرِ اُستاد شاگرد حضرت نظام الدین اولیا تھے، جنھوں نے آپ سے مشارق الانوار پڑھی۔ بلبن نے علامہ کمال الدین زاہد کو اپنا امام بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔

مولنا برہان الدین محمود بلخی کی شہرت ابتدائی دَور کے سب سے بڑے عالم[2] کے طور پر دیر تک قائم رہی۔ ان کی وفات ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء میں ہوئی۔ مزار حوضِ شمسی کے کنارے

---

[1] فوائد الفواد صر ۱۹۴

[2] مولنا عبدالحی بھی نزہت الخواطر میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان میں ان سے بڑا عالم کوئی دُوسرا نہ تھا۔ نزہت الخواطر جلد ۱۔ صر ۲۳

ایک پُر فضا مقام پر ہے ۔ شیخ عبدالحق محدث تین سو سال بعد لکھتے ہیں کہ لوگ ان کے مزار کی خاک لڑکوں کو اس لیے کھلاتے ہیں کہ ان پر علم و فضل کے دروازے کُھل جائیں !

مولنا برہان الدین بلخی اپنے وقت کے سب سے زبردست عالم تھے ۔ فقیہ اور محدث تھے ۔ لیکن اس سرزمین اور ابتدائی دور کی روایات کا اثر دیکھیے کہ سماع کے معاملے میں وہ بھی آزاد خیال تھے ۔ فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کا ارشاد درج ہے "کہ مولنا برہان الدین بلخی عالم بھی تھے اور صالح بھی ۔ چنانچہ آپ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ مجھ سے کسی کبیرہ کی نسبت باز پُرس نہیں کرے گا ۔ سوائے ایک کبیرہ کے ۔ مولنا سے پُوچھا گیا کہ وہ کونسا کبیرہ ہے ۔ فرمایا ، سماع ۔ جو میں نے سُنا بھی ہے اور اب بھی سُنتا ہوں" !

توسیع علم مولنا برہان الدین بلخی کو فروغ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہُوا ۔ یہ زمانہ تعلیم و تعلّم کی توسیع اور علمِ فقہ کی ترویج کے لیے خاص طور پر سازگار تھا ۔ اسلامی ممالک میں ہلاکو خاں نے تاراج و غارت اور کُشت و خون میں چنگیز خاں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ۔ خود بغداد کی تباہی اس کے زمانے میں ہوئی ۔ ان ممالک سے بے شمار علما و فضلا جان بچا کر ہندوستان آئے ۔ بلبن نے ان کا بڑا احترام کیا ۔ اور ان کے درس و تدریس کے لیے آسانیاں پہنچائیں ۔ عہدِ بلبن میں فقہا کی کثرت تھی ۔ جن میں سراج الدین ابوظفر سنجری ، مولنا شرف الدین ولوالجی ، مولنا بُرہان الدین بزاز ، قاضی جلال الدین کاشانی ، قاضی رکن الدین ساولونی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ فقہ پر اسلامی ہندوستان کی پہلی تصنیف بھی اسی زمانے سے متعلق ہے ۔

فقہا کے علاوہ اور کئی مقتدر علما تھے ۔ مثلاً علامہ نجم الدین ، عبدالعزیز بن محمد دمشقی ، جو امام فخرالدین رازی کے شاگرد اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم تھے ۔ سلطان بلبن ان کی بھی بڑی تعظیم کرتا تھا ۔

ایک مشہور عالم شیخ شمس الدین خوارزمی تھے۔ جن کی نسبت سیر العارفین کا مؤلف لکھتا ہے "دہلی کے اندر فقرا اور عالم بے شمار تھے۔ لیکن سرآمد روزگار اور اجلۂ علمائے کبار شمس الدین خوارزمی تھے۔ جن سے تمام علمائے شہر رجوع کرتے۔ وہ علم اصول و فروع کے جامع اور معقول و منقول میں بے نظیر تھے"۔ (ترجمہ از سیر الاولیاء ص ۵۹-۶۰)
ان کے سب سے مشہور شاگرد حضرت نظام الدین اولیا تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو بڑی محبت سے تعلیم دیتے۔ اگر کسی شاگرد کا ناغہ ہو جاتا اور وہ ناغے کے بعد آتا تو مذاقاً پوچھتے کہ میں نے تمہاری کیا خطا کی ہے۔ جو تم درس سے غیر حاضر تھے!

اس عہد میں کلام مجید اور حدیث پر کافی توجہ تھی۔ تفسیر میں کشاف، ایجاز اور عمدہ کے نام آتے ہیں۔ حدیث میں مشارق الانوار اور ادب میں مقامات حریری بہت مقبول تھیں۔ فقہ میں ہدایہ کا دور دورہ تھا۔ یہ تمام نام فوائد الفواد میں موجود ہیں۔ مصباح الدجیٰ (حدیث) کا بھی اس میں ذکر ہے۔ بعد میں ان کتابوں میں اضافہ ہو گیا۔ حضرت نظام الدین اولیا کے آخری ایام میں جن کتابوں کا ذکر ہے، ان میں بزدوی (اصول فقہ) قدوری اور مجمع البحرین (فقہ) اور کافیہ اور مفصل (نحو) کے نام آتے ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں برنی متعدد کتب کا نام لیتا ہے۔ جن میں احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، قوت القلوب، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، لوائح، لوامع (از قاضی حمید الدین ناگوری) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خاندانِ خلجی

خاندانِ غلامان کے زمانے میں اسلامی حکومت شمالی ہندوستان تک محدود تھی۔ دکن تک ابھی کوئی مسلمان بادشاہ نہ پہنچا تھا اور گجرات اور مالوہ کے راجے خود مختار تھے۔ خلجیوں نے اسلامی حکومت دکن تک پہنچادی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ جلال الدین خلجی رحم دل، سادہ اور انتہا درجے کا متحمل مزاج تھا۔ نیرنگیٔ روزگار نے اسے عین بڑھاپے میں تخت شاہی پر لا بٹھایا۔ اب تک اس نے جنگ و جدل میں پورا حصہ لیا تھا۔ لیکن تخت شاہی پر پہنچ کر اس کی طبیعت میں انقلاب آگیا۔ اور لڑائی بھڑائی سے سخت نفرت

ہو گئی۔ جب اسے پہلی دفعہ شاہی محل میں لے گئے تو وہ پُرانے بادشاہوں کو یاد کر کے بچّوں کی طرح زار زار رونے لگا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو[1] نے چند دوسرے امرا کے ساتھ مل کر بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور شکست کھا کر گرفتار ہُوا۔ جب وہ دربار میں پیش ہُوا تو بادشاہ نے ملک چھجو کی پُوری تعظیم و تکریم کی اور اسے ملتان کے جاگیردار کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا کہ ملک چھجو کو مع اہل و عیال ایک شاندار مکان میں اُتار دو۔ سامانِ عیش و عشرت جس کی وہ خواہش کرے مہیّا کرو۔ خلجی اُمرا کو یہ طرزِ عمل سخت ناگوار گزرا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ یہ لوگ باغی ہیں اور واجب القتل۔ انھیں ان کے جُرم کی پُوری سزا دینی چاہیے۔ اگر خدانخواستہ وہ کامیاب ہو جاتے تو خلجیوں کا نام صفحۂ زمین سے نیست و نابود کر دیتے۔ اگر انھیں سزا نہ دی گئی تو دوسرے لوگ بھی دلیر ہو جائیں گے۔ اور سلطنت میں فتنہ و فساد کا دروازہ کُھل جائے گا۔ سلطان نے جواب دیا کہ تم کہتے سچ ہو اور اصولِ جہانداری کا ایما بھی یہی ہے۔ لیکن مَیں کیا کروں مَیں نے ستّر سال ایک مسلمان کی طرح زندگی گزاری ہے اور کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ اخیر عمر میں مسلمانوں کو قتل کراؤں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ مَیں سلطان بلبن کا نوکر تھا۔ اس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں۔ آج مَیں اس کے تخت پر بیٹھا ہوں۔ اگر اب مَیں اس کے عزیزوں کو تہ تیغ کروں تو یہ بڑی بے مروّتی اور بے انصافی ہوگی۔

بادشاہ کی درویشانہ طبیعت اور حلم و بے آزاری کے بعض لوگ مدّاح تھے۔ لیکن ان سے امورِ مُلکی میں خلل پڑنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ جب بادشاہ کی نرم دلی کی شہرت عام ہوئی تو مُلک بھر میں چوروں، رہزنوں اور ڈاکوؤں نے سر اُٹھا کر فتنہ و فساد شروع کیا۔ جب وہ گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے آتے تو بادشاہ انھیں پیروں اور مشائخوں کی طرح وعظ و تلقین کے بعد چوری اور دوسرے اعمالِ ناشائستہ سے توبہ کروا کے رہا کر دیتا اور وہ واپس جا کر پھر نئے سرے سے

---

[1] ملک چھجو کا مزار شیخ بہاءالدین زکریا کے احاطۂ خانقاہ میں ہے۔

لوٹ مار کا بازار گرم کرتے۔ بادشاہ کہا کرتا تھا کہ میں نے لڑائیاں لڑی ہیں اور میدان میں بڑا اُکشت و خون گوارا کر سکتا ہوں لیکن جو شخص دست و پا گرفتہ میرے سامنے آئے اُسے قتل کرنے کی مجھے ہمت نہیں پڑتی۔ اس کے امیر اور ارکین یہ باتیں دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ بلکہ اُمرا نے عام طور پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ بادشاہ امورِ جہانداری سے ناواقف ہے۔ حکما نے کہا ہے کہ بادشاہت کے دو رُکن ہیں۔ ایک لُطف اور دُوسرا قہر۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک میں خلل پڑے تو حکومت کو زوال آجاتا ہے ؎

تحمّل دلکش است امّا نہ چنداں
شکیبائی خوش است امّا نہ چنداں

چنانچہ بادشاہ کے خلاف جگہ جگہ سازشیں شروع ہوئیں اور خلجی اُمرا یہ کہنے لگے کہ اب بادشاہ سترا بہترا ہو گیا ہے اور حکومت کے ناقابل ہے۔ بہتر ہے کہ اسے معزول کیا جائے اور اس کی جگہ کوئی دُوسرا موزوں شخص تخت نشین ہو۔

سیدی مولہ

اس دوران میں سیدی مولہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس نے حالات کو اور بھی پراگندہ کر دیا۔ قدرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسا بادشاہ جو ایک چیونٹی کو بھی پاؤں تلے روندنا پسند نہ کرتا تھا اور بڑا درویش طبع اور درویش نواز تھا ایک فقیر کی ظالمانہ موت کا باعث ہُوا۔ سیدی مولہ ایک ایرانی النسل درویش تھا جو جُرجان سے ہندوستان کی سمت وارد ہُوا۔ پہلے اجودھن میں جا کر حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ کی صحبت اختیار کی اور پھر چند روز کے بعد دہلی روانہ ہُوا۔ رخصت کے وقت حضرت گنج شکرؒ نے اسے کہا کہ تم دہلی جا کر خلقت سے آمد و رفت رکھو، اس سے میں مانع نہیں۔ لیکن بادشاہ اور اُمرا اور مقربانِ شاہ سے اختلاط نہ رکھنا کہ اس جماعت کی صحبت فقراء کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ دہلی پہنچ کر سیدی مولہ نے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کی۔ اور بھاری لنگر جاری کیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ اس خانقاہ میں کھانے اور

دوسری ضروریات کے لیے آتے - اور کوئی بھی محروم نہ جاتا - چونکہ سیدی مولہ کی آمدنی کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا - اس لیے لوگ کہتے تھے کہ وہ علم کیمیا جانتا ہے اور اس کی مدد سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے - وہ دہلی میں سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں آیا تھا اور خلجیوں کے آغازِ حکومت تک اس کا اثر بہت بڑھ گیا - اس وقت اس نے حضرت گنج شکرؒ کی نصیحت بھلا دی - بادشاہ کا بڑا بیٹا خانِ خاناں خود اس کا مرید اور معتقد ہو گیا اور کئی ایسے امراء جو خاندانِ غلامان کے زمانے میں برسرِ اقتدار تھے اور خلجیوں کے عہدِ حکومت میں اپنی جاگیریں کھو بیٹھے تھے - اس کی خانقاہ میں آ کر مقیم ہو گئے - لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سیدی مولہ ان امرا کی مدد سے تاج و تخت حاصل کرنے کا خواہاں ہے - فرشتہ کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین کاشانی (خلیفہ حضرت سلطان المشائخ) نے سیدی مولہ کو بہکانا شروع کیا کہ خدا نے اتنی قدرت تمھیں اس لیے کرامت فرمائی ہے کہ بادشاہی ظالموں کے ہاتھ سے لوگوں کو نجات دلا کر خود شریعت کا جھنڈا سر بلند کرو - سیدی مولہ پر بھی اس ترغیب و تلقین کا اثر ہُوا اور اس نے اپنے مریدوں کو خطاب و منصب دے کر ان کی تنظیم شروع کی -

جب بادشاہ ان امور سے آگاہ ہُوا تو اُس نے قاضی جلال الدین کاشانی، سیدی مولہ اور اس کے معتقد بلبنی امرا کو بلا بھیجا اور پُرسانِ حال ہُوا - انھوں نے بالاتفاق اپنی بے گناہی کا اظہار کیا - لیکن بادشاہ قائل نہ ہُوا - اور صحرائے بہادر پور میں ایک آتشِ عظیم جلائی گئی - جس کے شعلے آسمان تک پہنچتے تھے - اور سیدی مولہ اور اس کے رفقا سے کہا گیا کہ اس آتش کے اندر چلو - اگر تمھارا بیان سچ ہے تو تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا - اور اگر تمھارا بیان غلط ہے تو تمھیں جُرم کی سزا ملے گی - لیکن علما نے اس طریق کار کی مخالفت کی اور کہا کہ آگ بالطبع ایک جلانے والی چیز ہے - راست گو اور دروغ گو دونوں کو یکساں جلائے گی - یہ امر شریعتِ محمدیہ کے قطعاً خلاف ہے کہ آتشِ سوزندہ کے ساتھ مقدمات فیصل کیے جائیں -

اس پر بادشاہ اس فیصلے سے باز آیا۔ قاضی جلال الدین کاشانی کو بدایوں کی قضا پر بھیج دیا اور دوسرے امرا کو ملک بدر کرنے کا حکم دیا۔ اور خود سیدی مولہ کی طرف متوجہ ہُوا۔ بادشاہ نے اس سے کئی سوال کیے اور اس نے ان کے جواب دیے کہ اتنے میں بادشاہ نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری سے، جو قلندرانِ حیدری کا سرگروہ تھا کہا "اے درویشان دادِ من ازیں ظالم بستانید" اس پر ایک قلندر اُٹھا اور اس نے سیدی مولہ پر کئی وار کر کے اسے مجروح کیا۔ بادشاہ سیدی مولہ کے قتل کے متعلق متامل تھا کہ اتنے میں اس کے دوسرے بیٹے ارکلیخان نے اپنے فیلبان کو حکم دیا کہ سیدی مولہ پر ہاتھی دوڑا کر اس کا کام تمام کر دو۔ چنانچہ اس طرح سیدی مولہ کا خاتمہ ہُوا۔

ضیاء الدین برنی جو اس روز دہلی میں تھا کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ایک سیاہ آندھی اُٹھی جس سے تمام جہان تیرہ و تار ہو گیا۔ اور سیدی مولہ کے قتل کے بعد جلال الدین کی سلطنت درہم برہم ہو گئی۔ اور اس زمانے میں ایسا قحط پڑا کہ کتنوں نے بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے تئیں اور اپنے بچوں کو دریائے جمنا میں ڈال کر خودکشی کر لی (تاریخ فیروزشاہی ص ۲۱۲) لوگوں نے خیال کیا کہ یہ کرشمہ ایک خدارسیدہ انسان کے بے گناہ قتل کی وجہ سے ظہور میں آیا ہے اور بادشاہ جو طبعاً نرم دل بلکہ کمزور دل اور درویشوں کا معتقد تھا۔ اس کی وجہ سے خود سیدی مولا کا قائل ہو گیا۔ [اخبار الاخیار ص ۳۰]

ملک چھجو کے ساتھیوں کے ساتھ سلطان جلال الدین خلجی نے جو رحمدلی کی تھی وہ اسے خاص طور پر مہنگی پڑی۔ سلطان نے چھجو اور اس کے اقارب کو تو ملتان بھیج دیا اور جو لوگ بغاوت میں اس کے شریک ہوئے تھے، انھیں آزاد کر دیا۔ وہ لوگ آزاد ہو کر علاء الدین خلجی کے پاس جو ملک چھجو کی جگہ اضلاع شرقی (کڑہ) کا گورنر مقرر ہُوا تھا، ملازم ہو گئے۔ انھوں نے علاء الدین کو بہکانا شروع کیا کہ اضلاع شرقی کے گورنر کے پاس بڑی فوج ہوتی ہے۔ اگر وہ کہیں سے

زرِ وافر حاصل کرلے جس سے خلقت کے دل خریدے جاسکیں تو اس کے لیے دہلی پر قبضہ پانا کوئی مشکل نہیں۔ علاءالدین سلطان جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا لیکن ساس اور بیوی کی بدسلوکی[۱] سے اس کا ناک میں دم تھا۔ اور روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر وہ چاہتا تھا کہ ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ وہ ان مشوروں کا آسانی سے شکار ہو گیا[۲]۔

اس نے سات سو سواروں کا ایک دستہ فراہم کیا اور اسے لے کر وسطی ہند کے دشوار گزار جنگلوں اور بندھیاچل کی پہاڑیوں کو جن کے پار جانے کی ابھی تک کسی مسلمان سپہ سالار کو ہمت نہ ہوئی تھی، عبور کیا۔ دکن میں دیوگری (دولت آباد)

---

[۱] سلطان علاءالدین از ملکۂ جہاں کہ زنِ سلطان جلال الدین و خشوی او بود آزارِ بسیار داشت و از مخالفتِ حرمِ خود کہ دخترِ سلطان جلال الدین بود بہ جاں رسیدہ و از خوفِ قصد ملکۂ جہاں کہ بر سلطان جلال الدین بہ غایت مستولی بود۔ و از حشمت و عظمت سلطان جلال الدین نمی توانست کہ مخالفت و بے وفائی حرمِ خود پیش سلطان عرض دارد و از ترسِ فضیحت و رسوائی نمی توانست کہ کیفیت درماندگی خود پیش دیگرے کشف کند و دائماً در اندوہ و کاہش مے بود و در کڑہ با محرمان خود مشورت کردے و خواستے کہ سر در جہان گیرد و در دیار دیگر سر بہ اندازد۔"

(تاریخ فیروز شاہی از ضیاءالدین برنی ص ۲۲۱)

عصامی لکھتا ہے ؎

شنیدم ہماں دختِ شاہِ جہاں	کہ بود است در حکمِ آں پہلواں
براندے براں فخر آزادگاں	جفائے بر آئینِ شہزادگاں
براندازِ خوش گفت آں مردِ راہ	کہ "پورِ گدا بہ ز داماد شاہ"

[۲] بقول مولانا مناظر احسن گیلانی "خانگی تلخیوں کے مٹانے کی کوئی تدبیر اب اس (علاءالدین) کے سامنے نہ تھی۔ بجز اس کے کہ اس نمک حرامی اور سنگدلی پر آمادہ ہو جائے، جس کا ذکر عام تاریخ میں ہے۔" (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد ثانی ص ۱۹۲)

ایک نہایت مستحکم قلعہ تھا، جس میں بے شمار دولت جمع تھی۔ علاء الدین اور اس کے من چلے ہمراہیوں نے چالاکی اور حسنِ تدبیر سے اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اور بے شمار مال و دولت لے کر واپس ہوئے۔ کٹرہ پہنچ کر علاء الدین نے مکر و فریب سے اپنے چچا کو بلایا۔ جلال الدین خلجی کے درباریوں نے اسے دعوت کے رد کرنے اور علاء الدین سے بلا اجازت دیوگری جانے کے لیے سخت باز پرس کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن جلال الدین جو بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بے انتہا طامع بھی تھا، دیوگری کا مالِ غنیمت حاصل کرنے کی ہوس میں کٹرہ روانہ ہوا۔ اور بھتیجے کے ایما سے قتل ہوا۔

سکندرِ ثانی سلطان علاء الدین خلجی

علاء الدین کی تند مزاجی

ہم جلال الدین خلجی کی نرم مزاجی اور حلم و تحمل کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس کا جانشین علاء الدین خلجی اس معاملے میں اس کی عین ضد تھا۔ وہ اپنے چچا کے عہدِ حکومت میں دیکھ چکا تھا کہ ایک بادشاہ کی نرم دلی سے تمام ملکی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور ہر کہ و مہ تختِ شاہی کے خواب دیکھنے شروع کر دیتا ہے۔ اس نے جلال الدین کے طریقِ کار کو بالکل بدل دیا اور اپنے دشمنوں اور باغیوں کو وہ عبرت ناک سزائیں دیں کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ جب جالور (راجپوتانہ) میں اس کے

لہ صوفی منش برنی نے نیرنگیٔ روزگار کا تماشہ دکھانے اور بے علم علاء الدین خلجی کی سفاکیاں نمایاں کرنے کے لیے جلال الدین کے قتل کا واقعہ بڑی تفصیل سے اور بالکل ایک ڈرامائی انداز میں لکھا ہے اور علاء الدین کی سیہ کاری کو خوب خوب نمایاں کیا ہے۔ لیکن اسے بھی ماننا پڑا ہے کہ جلال الدین کٹرہ اس لیے گیا کہ اس کی آنکھوں پر حرصِ زر نے پٹی باندھ رکھی تھی لکھتا ہے: "سلطان جلال الدین از طمع مال و پیل کور و کر گشتہ" (ص ۲۳۰)

بعض سپاہیوں نے سپہ سالار ملک نصرت خاں کے خلاف بغاوت کی اور سپہ سالار کے بھائی ملک اعزالدین کو قتل کر دیا تو علاء الدین نے نہ صرف ان باغیوں کو قرار واقعی سزا دی بلکہ ان کے بچوں اور بیویوں کو بھی قید کرنے کا حکم دیا۔ برنی لکھتا ہے کہ سلطنت دہلی میں یہ پہلا[1] موقع تھا کہ کسی کے جرم کے لیے اس کی اولاد اور متعلقین سے مواخذہ کیا گیا ہو۔ (ص ۲۵۳)

علاء الدین کی درشت مزاجی کی ایک اور مثال مغل نومسلموں کا قتل ہے۔ یہ لوگ جلال الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں (۶۹۱ھ) ہندوستان آئے تھے۔ اور اس کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ جلال الدین نے فتح کے بعد ان سے مہربانی کا سلوک کیا۔ کچھ لوگ تو صلح صفائی کے ساتھ "بعد ارسال تحف و ہدایاے طرفین" واپس پلٹ گئے، لیکن چنگیز خاں کا نواسہ الغو خان اور چار ہزار مغل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے اور یہیں بس گئے۔ سلطان جلال الدین نے خود اپنی بیٹی الغو خاں سے بیاہ دی۔ ان لوگوں کو "نومسلم" کہتے تھے۔ علاء الدین کے زمانے میں بعض نومسلموں نے باغیوں کا ساتھ دیا اور ایک دفعہ سلطان کو خبر ملی کہ بعض نومسلم اسے شکار گاہ میں ہلاک کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ اس کی سلطنت میں جہاں کہیں کوئی نومسلم ملے، اسے قتل کر دیا جائے اور اس کی ساری جائداد اس کے قاتل کے حوالے ہو۔ اب لوگوں نے نہ صرف احکامِ سلطانی کی تعمیل کے لیے بلکہ جائداد کی طمع میں نومسلموں کو قتل کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ان کا نام و نشان صفحۂ دنیا سے مٹ گیا۔

---

[1] لیکن ریاض السلاطین (تاریخ بنگالہ) کے مصنف کا بیان ہے کہ بلبن کے عہدِ حکومت میں بنگالہ میں بغاوت ہوئی تو بلبن نے باغی سردار طغرل کے اعوان و انصار کے عزیز و اقارب کو سزا دی "زنان و فرزندانِ ایشاں را بالشہر لکھنوتی بقتل رسانیدند۔ تا آں زماں احدے از پادشاہانِ دہلی زناں و فرزندانِ مردمِ گنہگار را حہ گشتہ بود" (ص ۸۲)

سلطان علاء الدین خلجی کی تند خوئی کی کئی اور مثالیں گنائی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان خصلتوں کا ظہور عموماً اس وقت ہوتا جب کوئی بادشاہ کی مخالفت کرتا اور ملک میں فساد ڈالنا چاہتا۔ سلطان میں اعلٰے حکمرانوں کی خوبیاں بھی کئی تھیں اور تختِ دہلی پر بہت تھوڑے بادشاہ ایسے ہوئے ہوں گے جو اس کی طرح اولوالعزم محنتی اور صاحبِ تدبیر ہوں۔ اس کی فتوحات کی تفصیلات بتانا سعیِ لاحاصل سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان کا جس قدر علاقہ اس کے زیرِ نگیں تھا۔ برطانوی حکومت سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ لیکن علاء الدین فقط ایک بہادر سپہ سالار اور کامیاب فاتح ہی نہ تھا بلکہ نظم و نسق کا بھی اسے بڑا ملکہ تھا اور اکثر معاملات میں وہ بالآخر صائب رائے ہی اختیار کرتا۔ اس کی انتظامی قابلیت اور مدبرانہ کوششوں کی بہترین مثال اصلاحوں کا وہ گورکھ دھندا ہے، جو اس نے اجناس کی قیمتوں کو کم کرنے، ملکی شورشوں کی پیش بندی اور اندرونی حالات کو ٹھیک رکھنے کے لیے جاری کیا۔ اور اپنی محنت اور خوش تدبیری سے کامیاب کر کے دکھایا۔ آج بھی جبکہ اجناس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے اور واقعات و حالات سے خبردار رہنے کے ذرائع بے حد وسیع ہو گئے ہیں، سب کو معلوم ہے کہ اجناس کی نرخ بندی کس قدر مشکل ہے۔ لیکن علاء الدین نے اس کے لیے آج سے سات آٹھ سو سال پہلے قواعد و ضوابط وضع کیے۔ ان کی تعمیل کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں[1] اور اپنے ارادے میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

اس کی ہمت اور محنت کی اور بھی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ ابتدا میں قریب قریب بالکل اَن پڑھ تھا، لیکن جب اس نے اندرونی شورشوں کی روک تھام کے لیے مخبری اور احتساب کا وسیع سلسلہ جاری کیا تو اس نے مخبروں کی خفیہ رپورٹیں

---

[1] مثلاً سرکاری لگان کو بجائے زرِ نقد کے غلّے کی صورت میں وصول کیا۔ تاکہ سرکاری گوداموں میں غلّہ جمع ہو سکے، جو قحط و امساکِ باراں کی صورت میں فروخت یا تقسیم کیا جا سکے۔

پڑھنے کے لیے اخیر عمر میں لکھنے پڑھنے پر توجہ کی اور بڑی محنت کے بعد اتنی استعداد پیدا کرلی کہ شکستہ خط بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ سلطان علاء الدین عالم نہ تھا لیکن اسے صورتِ حالات پرکھنے کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ مختلف مسائل پر سوچ بچار کرکے ان کے حل ڈھونڈتا اور پھر بڑی مستعدی سے ان پر کاربند ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ چتوڑ کی مہم سے ابھی واپس آیا ہی تھا کہ سوا لاکھ منگولوں کے ساتھ مغل سردار ترغی عین دہلی کے سامنے آن پہنچا اور بادشاہ کو مختصر فوج کے ساتھ سری کے قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ منگول تو دہلی فتح کیے بغیر واپس چلے گئے، لیکن اس واقعہ نے علاء الدین کی آنکھیں کھول دیں۔ اب اس نے ایک تو اپنی فوج کو مضبوط اور مستحکم کیا۔ دوسرے شمال مغربی سرحد پر مضبوط قلعے بنائے اور اس کا انتظام غازی ملک کے (جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا) سپرد کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا کہ ملکی فتوحات کے لیے وہ خود دارالسلطنت کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا بلکہ اپنے جرنیلوں کو بھیجے گا۔ بالآخر یہ تدبیریں کامیاب ہوئیں۔ غازی ملک نے منگولوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ جو منگول گرفتار ہوئے انھیں بادشاہ نے ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچلوا دیا۔ چنانچہ اس کے بعد منگولوں نے جب تک سلطان علاء الدین تختِ دہلی پر متمکن رہا، اس طرف کا رُخ نہ کیا۔

علاء الدین کے قہر و ظلم کی نسبت یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہلاکو خاں اور اس کے جانشینوں کا ہمعصر تھا۔ اس زمانے میں رحمدلی اور حلم و تحمل دکھانا مفسدوں اور باغیوں کو جرأت دلانا تھا۔ اس کی ایک مثال منگولوں کے سدِباب سے ملے گی۔ جلال الدین خلجی نے ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا تھا، لیکن نتیجہ یہی ہوا کہ اس کے بعد بھی وہ ہر سال ہندوستان آتے رہے۔ علاء الدین خلجی نے ان کا قتل عام کیا اور ان کے ساتھ وہی درشتی اور سخت گیری روا رکھی جو وہ اپنے مفتوحین سے دوسرے ممالک میں برتتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انھیں ہندوستان آنے کی ہمت نہ پڑی اور جس اہم کام کو بلبن نے شروع کیا تھا اسے علاء الدین نے

تکمیل تک پہنچا دیا۔

سلطان علاء الدین کا بست سالہ عہدِ حکومت تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ پہلا دور ابتدائی فتوحات کا زمانہ ہے۔ جب اس نے منگولوں کو شکست دی اور پٹن (گجرات)، چتوڑ اور رنتھنبور کو فتح کیا۔ دوسرے دور میں اُس کی اپنی توجہ اندرونی اصلاحات پر مبذول رہی، لیکن اس نے ۱۳۰۵ء میں عین الملک مُلتانی کو وسطی ہند کی طرف بھیجا۔ جہاں اس نے اجین، چاندیری، مانڈو کے قلعوں کو فتح کر کے مالوہ اور وسطی ہندوستان کی خود مختار ریاستوں کو دہلی کا محکوم بنایا۔ اگلے سال مُلک کافور نے دیوگڑھ کے راجا رام دیو کو جس نے تین سال سے خراج نہیں دیا تھا، پھر شکست دی۔ راجا نے دہلی آن کر اطاعت قبول کی اور رائے رایان کا خطاب پایا۔ تیسرے دور میں بادشاہ نے شمالی ہند کے معاملات کو بحُسن و خوبی سلجھا کر تسخیرِ دکن کی تکمیل کی اور اس کے سپہ سالار مُلک کافور نے تلنگانہ، معبر اور جنوبی ہند کی دوسری سلطنتوں کو فتح کر کے ہندو راجاؤں کو دہلی کا باجگذار بنایا۔

برکات عہدِ علائی برنی نے علاء الدین کی تند مزاجی پر شدت سے نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن عہدِ علائی کی جو تصویر اس کی کتاب میں کھینچی ہے اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ باغیوں اور نافرمانوں کے لیے علاء الدین قہرِ عظیم تھا لیکن امن پسند شہریوں اور عام رعایا کے لیے اس کا وجود ایک رحمتِ الٰہی تھا۔ برنی نے عہدِ علائی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالاختصار یہ ہیں:-

(۱) غلّے اور سامانِ معیشت کی فراوانی اور ارزانی، جس پر بارش کی کمی بیشی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

(۲) بادشاہ کی غیر معمولی اور مسلسل فتوحات۔

(۳) منگول حملہ آوروں کا قلع قمع۔

(۴) تھوڑے سرمایے والوں کے پاس جاہ و حشمت کی فراوانی۔

(۵) مغرور اور زبردست متکبروں کی طرف سے بادشاہ کی اطاعت اور غریبوں پر شفقت۔

(۶) ملک اور راستوں کا امن و امان۔

(۷) تاجروں اور دکان داروں کی ارزاں فروشی اور قواعدِ شاہی کی پابندی۔

(۸) بے شمار نئی عمارتوں (مثلاً مسجدوں، قلعوں، سراؤں) کی تعمیر۔

(۹) عام رعایا کی رُوحانی اور اخلاقی ترقی [1]۔

(۱۰) ملک بالخصوص دارُالخلافے میں ہر علم کے جید عالموں اور ہر فن کے کامل ماہروں کا ازدحام۔ (ص ۳۲۹ - ص ۳۴۱)

عہدِ علائی میں ضروریاتِ زندگی کی یہ ارزانی و کثرت تھی اور ملک میں اِس قدر امن و امان تھا۔ تو جائے حیرت نہیں کہ علاء الدین کی وفات کے بعد لوگ اس کے عہدِ حکومت کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخؒ کے خلیفہ حضرت چراغِ دہلیؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے (ترجمہ)

"حضرت چراغِ دہلیؒ نے اس وقت کی فراخ سالی اور ارزانی بیان کی جو سلطان علاء الدین کے وقت میں تھی۔ ان دنوں موسم سرما میں ہر فقیر لبادہ پوش ہوتا کافور نامی سردار شاہی اکثر لبادے سلوا کر فقیروں کو تقسیم کرتا۔ بعضے دو دو پاتے" [2]

حضرت چراغِ دہلی کے ملفوظات سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد عوام الناس نے اسے ولی کا درجہ دے دیا اور اُس کی قبر پر جا کر دھاگے باندھتے اور مُرادیں مانگتے :۔

---

[1] "و نہم عجوبہ کہ درد و سال آخر عہد علائی مُشاہدہ شد آں ست کہ دلہائے اغلب و اکثر مسلمانان بر سداد و راستی و دیانت و انصاف و پرہیزگاری میل کردہ بُود و صدق معاملات درمیان مردان ظاہر شدہ بود و در ہندوان انقیاد و اطاعت عام ہدے نمود و مثل آں در ہیچ عہدے و عصرے ندیدہ اند و نمے بینند" [2] ملاحظہ ہو سیر المجالس ترجمہ خیر المجالس ص ۱۸۹

"یہ بادشاہ علاء الدین عجیب رعیت پرور بادشاہ تھا۔ حاضرین میں سے ایک بولا لوگ اس کی قبر پر زیارت کو جاتے ہیں اور اپنی مراد کے ریسمان اس کے مزار پر باندھ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حاجتیں بر لاتا ہے"۔

نرخ بندی اور ارزانی اشیا کے قواعد کی نسبت برنی لکھتا ہے کہ ان کے نفاذ سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ تھوڑے خرچ سے ایک بڑی فوج رکھ سکے۔ اور اس مقصد میں اُسے کامیابی اس لیے ہوئی کہ اس نے اختیاراتِ شاہی کا بڑے تشدد سے استعمال کیا۔ افسوس کہ فاضل مورخ نے (جو طبیعت، فلسفۂ زندگی اور مذہبی اور سیاسی خیالات میں علاء الدین کی عین ضد تھا) اس اہم معاملہ میں علاء الدین سے انصاف نہیں کیا۔ مثلاً ایک تو یہ خیال ہی سرے سے غلط اور معاشیات کے تمام اصولوں کے خلاف ہے کہ کوئی فرمانروا فقط جبر و تشدد سے سالہا سال تک نہ صرف چیزوں کی ارزانی بلکہ ان کی فراوانی کا انتظام کر سکتا ہے۔ دوسرے برنی کے علاوہ اس زمانے کے باقی تمام راوی اس معاملے میں اس کی تردید کرتے ہیں۔ معاصرانہ شواہد کو بغور دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ علاء الدین (اس زمانے کی عام روش کے مطابق) ایک جابر اور تُند خُو بادشاہ تھا لیکن بادشاہت اور فرائض شاہانہ کے متعلق اس کا مطمح نظر بڑا بلند تھا اور اس کے اکثر قواعد و فرامین فلاح رعیت اور مُلکی مصلحت کی خاطر نافذ ہوئے۔

ارزانی اشیا کی نسبت خیر المجالس میں حضرت چراغ دہلیؒ کی زبانی لکھا ہے:-

"قاضی حمید الدین ملک التجار جب ان دنوں اودھ میں گیا تو وہاں دعوت کی۔ مجھ کو بھی بلایا تھا۔ جب بعد دعوت لوگ رخصت ہوئے اور میں اور وہ ایک جگہ بیٹھے تو یہ قصہ بیان کیا کہ ایک بار میں نے سلطان علاء الدین کو دیکھا۔ پلنگ پر بیٹھے ہوئے، سر برہنہ، پاؤں زمین پر، فکر میں غرق۔ مبھوتوں کی سی شکل۔ میں روبرو گیا۔ بادشاہ ایسا فکر میں تھا کہ کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے باہر آکر یہ حال ملک فرید بک سے کہا کہ آج میں نے بادشاہ کو اس طرح دیکھا ہے تم بھی چل کر دیکھو کیا سبب

اِس فکر کا ہے۔ ان کی صدر پر دانگی تھی۔ وہ قاضی کے ساتھ اندر گیا۔ بادشاہ کو باتوں میں لگایا۔ پھر عرض کی کہ امیر المسلمین سے کچھ عرض ہے حکم ہو تو بیان کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ قاضی حمید الدین ملک التجار آگے بڑھا اور قاضی نے کہا میں ابھی اندر آیا تھا ——— حضور کو دیکھا، سر برہنہ پریشاں حال فکر مند ہیں سو آپ کو کس بات کی فکر تھی۔ بادشاہ نے کہا سُنو مجھ کو چند روز سے یہ فکر ہے کہ میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھ کو اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق پر حاکم کیا ہے اب کچھ ایسا کام کرنا چاہیے کہ مجھ سے تمام مخلوق کو نفع پہنچے۔ دل میں سوچا کیا کروں۔ اگر تمام خزانہ اپنا اور سو چند اس کا تقسیم کروں تب بھی خلق کو نفع نہ ہوگا۔ اب ایک بات سوچی ہے۔ وہ تم سے کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تدبیر ارزانی غلّہ کی کروں کہ اس سے مخلوق کو فائدہ پہنچے گا۔ اور ارزانی غلّہ کی یہ تدبیر کی ہے کہ بنجاروں کے نائکوں کو حکم دوں کہ حاضر ہوں وہ جو غلّہ اطراف سے ہزاروں بیلوں پر لاتے ہیں ان کو خلعت دے کر اپنے خزانے سے روپیہ قیمت کا دوں اور خرچ خانگی ان کا الگ دوں کہ بے فکر ہو جائیں۔ اندر میرے نرخ مقررہ کے مواق بیچیں۔ غرض یہی بات قرار داد ٹھہری اور نائکوں کو فرمان جاری ہوئے۔ خلعت اور خرچ اور قیمت خزانہ شاہی سے ملا اور ہر طرح کا غلّہ اطراف سے بکثرت آنے لگا۔ چند روز کے بعد فی من گندم سات جیتل کو آنے لگا۔ اور گھی شکر سب چیزیں ارزاں ہوئیں۔ خلق آسودہ ہوئی۔ سب نے نفع پایا۔[1]

اس روایت کی نسبت ممکن ہے کہا جائے کہ وہ ایک صوفیانہ تذکرے سے لی گئی ہے اور ان تذکروں میں تحقیق و تنقید کا معیار بہت بلند نہیں ہوتا۔ لیکن اس عہد کی تاریخی کتب میں جو تھوڑا بہت مواد ملتا ہے اس سے بھی برنی کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ علاء الدین نے چیزوں کی ارزانی کا انتظام فقط اخراجات خزانہ

---

[1] سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس ص ۱۸۹-۱۹۰

کو کم رکھنے کی غرض سے کیا۔ اور اس میں اسے کامیابی فقط جبر و تشدد کی بدولت ہوئی۔ برنی کی کتاب کی تصنیف کے چند سال بعد شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی لکھی جو فیروز تغلق کے کارناموں کا بیان بلکہ اس کی تعریف میں ایک مسلسل نثری قصیدہ ہے۔ اس کتاب میں عہدِ علائی کی خوبیاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ (بلکہ چونکہ مورخ کا مقصد فیروز شاہ کی برکات حکومت کو نمایاں کرنا ہے۔ اس لیے عہدِ علائی کی تعریف اس کے اصولی مقصد کے خلاف بھی ہے) لیکن اس وقت تک عام لوگ عہدِ علائی کو بادشاہت کی معراج سمجھتے تھے۔ اس لیے عفیف کو طوعاً و کرہاً اس کا ذکر کرنا پڑا ہے۔ اس کا متعلقہ بیان بڑا دلچسپ ہے اور اس سے بھی برنی کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ قواعدِ علائی بیشتر جبر و تشدد کی بنا پر نافذ ہوئے۔ عفیف عہدِ فیروزی کی فراغت و ارزانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"بادشاہ (فیروز تغلق) کے چالیس سالہ دورِ حکومت میں قحط کا نام و نشان تک سنائی نہ دیا اور فیروز شاہی عہد کی برکات کے مقابلے میں تمام اہلِ شہر علائی برکات کو قطعاً بھول گئے۔

عہدِ علائی کی برکات تاریخ میں بے نظیر تھیں۔ لیکن فیروز شاہی عہد کی فراغت نے ان کو بھی گوشۂ دل سے فراموش کرا دیا۔

سلطان علاء الدین نے ارزانی کے لیے جس قدر بلیغ کوشش کی اس کے حالات کتبِ تواریخ میں مفصل مذکور ہیں۔ علاء الدین نے سوداگروں کو رقم عطا کی اور بے شمار زر و دولت ان کے سامنے پیش کیا۔ ان کے وظائف مقرر کیے اور ان کو ہر قسم کے رحم و کرم شاہی سے سرفراز کیا۔ اس وقت اس درجہ ارزانی پیدا ہوئی ہے۔"[1]

ابنِ بطوطہ کے بیان سے بھی جو علاء الدین کی وفات کے چند سال بعد

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از عفیف (اردو ترجمہ شائع کردہ دارالترجمہ حیدرآباد دکن) ص ۲۰۶

ہندوستان آیا۔ عفیف اور حضرت چراغ دہلیؒ کی تائید اور برنی کی تردید ہوتی ہے۔

علاءالدین دارالخلافے میں داخل ہوا اور اس نے بیس برس تک سلطنت کی۔ وہ سب سے اچھے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہلِ ہند اب تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ خود امورِ سلطنت کو انجام دیتا تھا۔ اور ہر روز نرخ وغیرہ کی بابت دریافت کر لیتا تھا..... کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے محتسب سے دریافت کیا کہ گوشت کے گراں ہونے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا کہ گائے اور بکری پر زکوٰۃ (یعنی محصول) لی جاتی ہے۔ بادشاہ نے اسی روز سے کل محصول اس قسم کے معاف کر دیے اور سوداگروں کو بلا کر راس المال اپنے خزانے سے دیا اور کہا کہ اس کی گائے اور بکریاں خرید لاؤ اور ان کو بیچ کر قیمت خزانہ میں داخل کرو اور ان کی کچھ اُجرت مقرر کر دی۔

اسی طرح جو کپڑا دولت آباد سے آتا تھا اس کا انتظام کیا۔ ایک دفعہ غلّہ بہت گراں ہو گیا تو اس نے سرکاری گودام کھلوا دیے اور نرخ سستا ہو گیا۔"

عصامی جو عہدِ علائی میں پیدا ہوا۔ اور جس نے اپنی مثنوی "فتوح السلاطین" میں تاریخی واقعات بڑی احتیاط سے نظم کیے ہیں۔ علاءالدین کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ بلکہ سلطان محمدؒ بن تغلق کے ظلم و ستم کی شکایت کرتے ہوئے اس کے مقابلے میں رعیت پروری کی مثالیں دینے کے لیے اس نے جس بادشاہ کو منتخب کیا ہے، وہ (سلطان ناصرالدین محمود یا التمش نہیں) علاءالدین خلجی ہے۔ (ملاحظہ ہو فتوح السلاطین کا آخری حصہ "صفتِ ملک ہندوستان متضمن مدحت سلطان محمد علاءالدین خلجی نور اللہ مرقدہٗ و مذمت محمد شاہ ابنِ تغلق شاہ) ایک اور جگہ وہ سلطان علاءالدین خلجی کی نسبت لکھتا ہے:۔

بہ عہدش جہاں جملہ آسودہ بود	کسے کم بجز فتنہ فرسودہ بود
ز ارزانیٔ عہدِ آں کامیاب	گلاب و عسل بود ہم نرخ آب
بہ عہدش کسے جز غمِ دیں نخورد	بہ دورش کس از غم شکایت نکرد

غم خلق مے خورد تا زندہ بُود زشاہاں ہمو گوئے عصمت رُبود

سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے مقاصد میں بے نظیر کامیابی حاصل کی اس کا باعث زیادہ تر اس کی اپنی انتظامی قابلیت تھی لیکن اسے حُسنِ اتفاق سے غیر معمولی طور پر سمجھ دار اور تجربہ کار مشیر میسر آئے تھے اور بادشاہ ان کے مشوروں سے پوری طرح مستفید ہوتا۔ برنی کا بیان ہے :۔

"سلطان علاء الدین بارائے زناں خود کہ ہر یکے ازاں بزرگاں بے نظیر و مستثنےٰ بودند، رائے زد و مشورت کرد۔"

ایک اور جگہ بھی مورخ لکھتا ہے :۔

"رائے زناں آصف اوصاف کہ در درگاہ سلطان علاء الدین بودند فکرہائے صافی را در کار آوردند و بعد اندیشہ بسیار..... پیش تخت عرضداشت کردند۔"

علاء الدین کا مزاج سخت تھا اور عام طور پر ویسے بھی شخصی حکومت میں بادشاہ کے درباریوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن علاء الدین اپنے مشیروں کے وہ مشورے بھی جو اسے پسندِ خاطر نہ تھے یا اس کے ذاتی مفاد کے خلاف تھے، گوشِ ہوش سے سُنتا اور اگر وہ فی الواقع صائب اور مفید ہوتے تو انھیں چراغِ راہ بناتا۔

بادشاہ اور علاءُ الملک کی تاریخی گفتگو

ابتدائی ایام میں جب علاء الدین کو پے در پے اہم کامیابیاں ہوئیں تو اس کے طائرِ ہوس نے بلند پروازیاں شروع کیں اور اس کے دل کو طرح طرح کی خواہشات گدگدانے لگیں۔ مثلاً وہ کہتا کہ رسولِ اکرمؐ کو خدا نے چار یار عطا کیے جن کی مدد سے انھوں نے ایک شریعت کا آغاز کیا۔ اگر میں بھی اپنے چار یار یعنی الماس بیگ، الغ خان، ظفر خان، ملک نصرت خاں اور سنجر الپ خاں کی مدد سے ایک نئے دین و مذہب کی بُنیاد ڈالوں تو قیامت تک میرا اور میرے ساتھیوں کا نام صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گا۔ وہ خلوت خانے میں بار بار اس بات کا ذکر کرتا اور پُوچھتا کہ کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جس سے قیامت تک میرا نام باقی رہے

خلقت ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلے ۔

اس کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ چونکہ اس کے پاس بے شمار خزانہ و لشکر اور بے اندازہ ہاتھی گھوڑے ہیں۔ چاہیے کہ وہ دہلی کو ایک معتمد درباری کے سپرد کرکے یونان کے بادشاہ سکندرِ اعظم کی طرح عالمگیر فتوحات کا آغاز کرے۔

چنانچہ جب اسے کئی مسلسل کامیابیاں حاصل ہوئیں تو اس نے خطبہ میں اپنے آپ کو سکندر ثانی کہلوایا۔ سکوں پر بھی یہ لقب کھدوایا۔ وہ اپنے ہر دو ارادوں کی بابت اپنے درباریوں اور حاضرینِ مجلس سے پوچھا کرتا تھا اور چونکہ لوگ اس کی سخت گیری اور بدخوئی سے ڈرتے تھے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ لیکن خوش قسمتی سے بادشاہ کے درباریوں میں سے ایک شخص (ضیاء الدین برنی کا چچا) ملک علاء الدین علاء الملک کوتوال دہلی تھا۔ ایک دن وہ حسبِ معمول بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اپنے دو منصوبوں کی نسبت اس سے بھی پوچھا۔ علاء الملک نے جو مردِ راست گو تھا اور علوم سے بھی باخبر تھا، بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو سامنے سے شراب ہٹا دی جائے اور محفل کو سوائے خاص لوگوں کے باقی سب سے خالی کرا لیا جائے تاکہ جو کچھ اس پر وردہ نعمت کی عقل سمجھ میں آتا ہے عرض کرے۔ بادشاہ نے یہ معروضہ قبول کیا۔ مجلس سے صُراحی و پیالہ اُٹھائے گئے۔ اور حاضرین میں سے بھی سوائے الماس بیگ، الغ خاں، ملک نصرت خاں، ملک الپ خاں اور ظفر خاں کے باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔

علاء الملک نے زمینِ خدمت کو بوسہ دیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت، دین و شریعت کی باتیں انبیاء علیہم السلام سے تعلق رکھتی ہیں اور نبوت کا انحصار وحی آسمانی پر ہے اور یہ بات اب حضورِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی۔ سب خاص و عام، چھوٹے بڑے، نزدیک و دور اس کو جانتے ہیں۔ اگر عام لوگوں کو حضور بادشاہ کے منصوبۂ نبوت کا پتا چلا تو بادشاہ سے یقیناً بددل ہو جائیں گے۔ اور ملک میں فساد اور بدنظمی پھیل جائے گی۔ مصلحتِ ملکی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد

سلطانِ جہاں اس ارادے کو بالکل اپنے صفحۂ دل سے محو کردیں اور پھر کبھی ایسی چیز کا خیال نہ کریں جو اب کسی آدم زاد کو میسر نہیں آسکتی۔ حضورِ پُرنور پر روشن ہوگا کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد نے سالہاسال تک اس امر کی بڑی کوشش کی ہے کہ مذہب اسلام دُنیا سے نابود ہوجائے اور ان کا اپنا دین جو ہزار ہا سال سے ترکستان میں رائج ہے، دُنیا میں عام ہو۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ لیکن ان کی یہ خواہش کسی طرح پوری نہ ہوئی اور بالآخر ان کی اولاد کے دل میں دینِ متین محمدی کی اُستواری ذہن نشین ہوئی۔ اور وہ مسلمان ہوگئے اور اسلام کی تقویت کے لیے انھوں نے کفار سے جنگ بھی کی۔"

سلطان علاء الدین نے بڑی دیر تک علاء الملک کے مشورے پر غور و تامل کیا۔ پھر اس سے کہنے لگا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے درست اور حقیقت کے مطابق ہے۔ خدا تمھارے والدین پر صد ہزار رحمت کرے کہ تم نے نمک حلالی سے ایسا مشورہ دیا۔ آج کے بعد کوئی شخص کسی مجلس میں مجھ سے اس مسئلے پر کوئی بات نہ سُنے گا۔

پھر بادشاہ نے اپنے دوسرے ارادے یعنی فتح ممالک کی نسبت پوچھا کہ وہ ٹھیک ہے یا ناقص۔ ملک علاء الملک نے عرض کیا کہ وہ ارادہ نیک ہے اور جہاں پناہ کی ہمتِ عالی کی دلیل۔ لیکن اس کے متعلق بھی چند امور غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب جہاں پناہ دہلی چھوڑ کر بیرونی ممالک میں جائیں گے تو ہندوستان میں نیابت کے فرائض کون سرانجام دے گا؟ اور جب آپ عرصۂ دراز کے بعد دہلی واپس آئیں گے تو وہ نائب اپنے عہد و پیمان پر قائم ہوگا یا مُنحرف ہوجائے گا؟ حضورِ والا آج کا زمانہ سکندر کا زمانہ نہیں ہے۔ اس کے زمانے میں غدر و بدعہدی شاذ و نادر تھی جس نے ایک دفعہ کوئی عہد باندھا وہ مرتے دم تک اس پر قائم رہا۔ دوسرے سکندر کے پاس ارسطو جیسا وزیر با تدبیر تھا جس نے سکندر کی عدم موجودگی میں سب کو مطیع و تابعدار رکھا۔ اور جب سکندر لوٹ کر گیا تو سلطنت کو محفوظ و درست پایا۔ اگر حضور کے اُمرا اس حد تک قابلِ اعتماد ہیں تو حسبی اللہ! آپ کا

ارادہ مبارک ہے۔"

بادشاہ نے اس بات پر دیر تک غور و خوض کیا اور کہا کہ اگر میں ان مشکلات کا خیال کروں تو مجھے گوشۂ دہلی پر قناعت کرنی پڑے گی۔ پھر میرے سب گھوڑے ہاتھی اور لاؤ لشکر کس کام آئیں گے اور میرے نام کی کس طرح شہرت ہوگی علاء الملک نے پھر پتے کی بات کہی اور عرض کیا کہ ابھی جہاں پناہ کو دو مہمیں اس طرح کی درپیش ہیں کہ تمام خزائن اُن کے لیے درکار ہوں گے۔ ایک تو تمام اقالیم ہندوستان کی تسخیر اور وسطی ہندوستان کے بعض قلعوں مثلاً رنتھنبور، چتوڑ، چاندیری وغیرہ اور مشرقی سمت میں دریائے شور اور شمال میں لمغان و کابل تک کے سب علاقوں کی فتح۔ دوسرے مغلوں کا سدِ باب یعنی دیپالپور اور ملتان اور اس طرح کے جو دوسرے قلعے ان کے رستے میں ہیں۔ ان کا مکمل استحکام۔ جب دونوں مہمیں بخیر و خوبی سر انجام پا جائیں گی تب بادشاہ سلامت کے لیے ممکن ہوگا کہ خود بدولت تو دہلی میں قیام کریں اور امرائے معتمد کو آراستہ فوجوں کے ساتھ اطراف واکناف میں روانہ کریں تاکہ دُور دُور کے ممالک کو فتح کرکے حضور کا نام جہانگیری روشن کریں لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوگا جب بادشاہ سلامت کثرت شراب نوشی، سیر و شکار اور عیش و عشرت سے دست بردار ہو جائیں گے۔

سلطان علاء الدین یہ باتیں سُن کر بہت خوش ہوا۔ علاء الملک کی رائے صائب اور تدبّر کی تعریف کی اور اسے دو گاؤں، گھوڑے اور بے شمار زر و جواہر انعام دیا۔ جو اُمراء اس مجلس میں حاضر تھے، وہ بھی علاء الملک کی باتوں سے خوش و خرّم ہوئے اور ہر ایک نے چند ہزار تنکے اور دو دو تین تین گھوڑے تحفے کے طور پر اس کے پاس ارسال کیے۔ (ملخص و ترجمہ از برنی۔ ص ۲۶۳ تا ص ۲۷۰)

علاء الدین مفید اور صائب مشورے، خواہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ہوں قبول کر لیتا تھا، لیکن وہ ضعیف الرائے اور متلون مزاج نہ تھا اور ہر مشورے کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ مثلاً اسی علاء الملک کو توال دہلی کی نسبت جس کے ایک

خلاف منشا مشورے پر علاء الدین نے اس قدر انعام و اکرام دیا۔ برنی لکھتا ہے کہ جب ایک دفعہ منگولوں کا سردار قتلغ خواجہ ایک لشکرِ جرار لے کر دہلی پہنچ گیا تو علاء الملک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ لڑائی میں فریقین کا معاملہ ترازو کے پلڑوں کی طرح ہوتا ہے جو چند دانوں کی کمی بیشی سے اوپر نیچے ہو جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لڑائی سے پہلو تہی کی جائے۔ اس پر علاء الدین نے اپنے معتمد کوتوال سے کہا کہ اگر میں تمھارے مشورے پر عمل کروں اور اس موقعہ پر جب دشمن میرے سامنے صف آرا ہے، مقابلے سے پہلو بچانے کی کوشش کروں تو میں اپنے حرم کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اور میری سلطنت میں میری کیا عزت و آبرو رہے گی؟ اب تو وہ موقع ہے کہ تمھارے خیر خواہانہ مشورے کو ایک طرف رکھا جائے اور بے جگری سے حریف کا مقابلہ کیا جائے۔

"ایں حالت پیش آمدہ است کہ عقل را در گوشہ مے باید نہاد و جز خونریزی و خون ریختن و از سرِ جان خود برخاستن و تیغ ہا برہنہ کردن و با خصماں در آویختن کارے و اندیشہ دیگرے نے باید کرد!" (ص ۲۵۸)

چنانچہ بادشاہ نے شہر دہلی اور اپنے حرم اور خزانے کو کوتوال کی تحویل میں دیے اور منگولوں کے خلاف اس بہادری اور ہوشیاری سے لڑا کہ انھیں پسپائی ہی میں سلامتی نظر آئی۔

علاء الدین شعرائے عصر کی نظروں میں

عہدِ علائی میں ملک کی خوش حالی اور امن و امان کی وجہ سے ہر قسم کے ماہرینِ فن جمع ہو گئے تھے۔ اور برنی نے علما و مشائخ، مفسرین اور فاضلانِ حدیث، مورخین و شعرا، اطبا اور منجمین، غزل خوانوں اور خطاطوں اور دوسرے اُستادانِ فن کی طویل فہرستیں دی ہیں۔ ان میں سے اکثر کے کارنامے صفحۂ ہستی سے محو ہو گئے ہیں فقط دو شاعروں یعنی امیر خسرو اور امیر حسن سنجری کو شہرتِ پائدار نصیب ہوئی ہے۔ خشک مزاج علاء الدین نے ان فخرِ روزگار شعرا کی بھی خاص قدر

نہ کی۔ لیکن خسرو اور حسن دونوں جانتے تھے کہ وقت کی عام فراغ بالی جس سے وہ بھی دوسروں کی طرح فیض یاب ہوتے تھے، علاء الدین کی مرہونِ منت تھی۔ ان دونوں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھے اور غزلوں کو بھی مدحتِ شاہی کا ذریعہ بنایا۔ بالخصوص میر حسن نے تو بادشاہ کی تعریف میں متعدد مثنویوں اور غزلوں کے علاوہ کوئی ڈیڑھ سو قصائد لکھے۔ ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اور غور کیجیے کہ فوائد الفواد کا مؤلف علاء الدین کے "دین و ملت" پر احسانات کا کس طرح ذکر کرتا ہے ؎

ز فتحِ شاہ عالم را بہار است | بہارِ او فتوحِ روزگار است
نہالِ ملک از زانست تازہ | کہ آن پروردۂ پروردگار است
دریں حضرت ز نو نو غنچۂ فتح | ہمہ ایام گوئی تو بہار است
گلِ نصرت کہ رست از سبزۂ تیغ | ز سرسبزیِ بخت شہریار است
شہنشاہے کہ دائم طالعِ او | بہر عزمے کہ خواہد کامگار است
علاء الدین و الدنیا کہ از وے | بنائے دین و دنیا استوار است
محمد شاہ بحر و بر کہ اسلام | ز تیغِ بیقرارش برقرار است
بحمد اللہ کہ از بارانِ عدلش | ہوائے ملک و دولت برقرار است
نثارِ فتح بر رایاتِ شاہ باد | کہ فتحش دین و ملت را مدار است
دعائش خواستم گفتن بچہ گوئیم | کہ عمرش چوں عطایش بیشمار است

حسن زیں بادشاہِ بندہ پرور
چو دیگر بندگاں امیدوار است

ایک اور قصیدے میں کہتے ہیں ؎

ثباتِ دولت و ملک از بقائے شاہ بادا
بقائے اوست کہ اسلام را مدار آمد

امیر خسرو بھی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

بازم رخِ زیبائے کسے در نظر آمد | عشقے بدل افتاد ہوائے بسر آمد

زیں پس نخورم ہیچ غمے خاصہ کہ از چرخ
برشاہ جہاں مژدۂ فتح و ظفر آمد
آں شاہ علاء الدین اسکندر ثانی
کز لشکر او زلزلہ در بحر و بر آمد
سلطان جہانگیر محمد شہ اعظم
کز داد و دہش ہمچو علیؓ و عمرؓ آمد
از زلزلۂ جیش تو دہلی ز حد خویش
جنبید و زمیں بوس زناں بلبشتر آمد

علاء الدین اور مذہب اسلام

علاء الدین ایک منتظم بادشاہ تھا۔ اس کی فتوحات سے اسلامی حکومت کو وسعت و استحکام نصیب ہوا۔ لیکن فیروز تغلق اور اورنگ زیب عالمگیر کی طرح اسے مذہب اسلام سے براہِ راست کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پوتے شیخ رکن الدینؒ کا معتقد تھا اور حضرت سلطان المشائخ کا بھی وہ تھوڑا بہت پاس کرتا تھا، لیکن اس کی طبیعت کا اسلوب دُنیاوی اور مادی تھا۔ اس نے ایک زمانے میں شراب کی مجلسیں بند کر دیں اور ممالکِ محروسہ میں شراب نوشی کی ممانعت کر دی، لیکن اس کا باعث شرعِ اسلامی کا احترام نہ تھا بلکہ مُلکی مصلحتیں۔ جب بادشاہ کے خلاف چند سازشیں ہوئیں اور اس نے ان کے بارے میں مجلسِ مشاورت منعقد کی تو اس کے مشیروں نے جو چار اسباب ان سازشوں کے بتائے ان میں سے ایک امراو عوام کی شراب خوری تھی جس سے بُری عادتیں زور پکڑتی تھیں۔ امراو عمایدِ مجالسِ شراب میں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو کر خطرناک باتوں پر بھی گفتگو کر کے سازشیں شروع کر سکتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے پہلے تو اپنی مجلسِ شراب بند کی اور پھر عام حکم ہُوا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ اب نہ کوئی شراب پیے نہ بیچے۔ اس حکم پر سختی سے عمل ہُوا۔ لیکن چونکہ اصل مقصد امرا کی دوستانہ مجالس کو بند کرنا تھا۔ بعد میں تنہا شراب پینے کی اجازت دے دی گئی۔

علاء الدین مذہبی قسم کا آدمی نہ تھا۔ لیکن وہ لامذہب بھی نہ تھا۔ برنی لکھتا ہے:۔

"در آتیان تکالیف شرع سخت متعصر بوده است ونماز روزه اورا معلوم نبود کہ
- چہ حال بود۔ ودر اسلام اعتقاد تقلیدی برطرف عامیان راسخ داشت و
دسخن بدمذہبان وکلام بددینان نگفتے ونشنیدے وندانستے۔"

وہ مذہبی عالموں اور قاضیوں کی کوئی قدر نہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ انھیں اتنی لیاقت نہیں ہوتی کہ رموزِ مملکت داری سمجھ سکیں۔ یہ بادشاہ کا کام ہے کہ سلطنت کے لیے قواعد وضوابط نافذ کرے۔ شرع اور اہلِ شرع کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ جھگڑوں اور مقدموں کا تصفیہ اور طریقِ عبادت بتانا قاضیوں اور علما کا کام ہے۔ چنانچہ اصلاحِ ملک کے لیے جس چیز کو وہ مناسب سمجھتا اس پر عمل کرگزرتا خواہ وہ مشروع ہوتی یا غیر مشروع۔ برنی لکھتا ہے:۔

"چوں در بادشاہی رسید در دل او ہمچنیں نقش بستہ کہ مُلک داری وجہاں بانی علٰحدہ کار یست ورو ائت واحکامِ شریعت علٰحدہ امریست۔ واحکامِ بادشاہی بر بادشاہ متعلق است واحکامِ شریعت بر روائتِ قاضیان ومفتیان مفوض است وبرحکم اعتقادِ مذکور ہرچہ در کارِ مُلک داری او فراہم آمدے وصلاحِ ملک دراں دیدے آں کار خواہ مشروع وخواہ نامشروع، بکردے وہرگز در امور جہانداری خود مسئلہ در روائتے نہ پرسیدے۔" (ص ۲۸۹)

بادشاہ اور قاضی مغیث کی گفتگو

بادشاہ نے اپنی اصلاحیں اور ملکی قاعدے اہلِ شرع کا فتوے لیے بغیر جاری رکیے۔ لیکن ایک دن پتا نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے قاضی مغیث الدین بیانوی سے جو اس زمانے کے مشہور عالم تھے، بعض اہم اور پیچیدہ مسئلوں کے متعلق شرع کا حکم پوچھنا شروع کیا۔ چونکہ بادشاہ نے تمام عمر شرع کی طرف توجہ نہ کی تھی اس لیے قاضی صاحب ڈرے اور بادشاہ سے کہنے لگے کہ بظاہر امیری اجل نزدیک آگئی ہے۔ بادشاہ نے وضاحت چاہی تو قاضی صاحب نے کہا کہ میں بادشاہ کے سوالات کا جواب صحیح صحیح عرض کروں گا اور چونکہ وہ بادشاہ کی مرضی کے

خلاف ہوگا۔ اس لیے میرے قتل کا حکم نافذ ہو جائے گا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ تم شریعتِ محمدیہ کے مطابق سچ سچ کہو اور سانچ کو آنچ نہ ہوگی!

پہلا مسئلہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث سے یہ پوچھا کہ شرع کے مطابق کس ہندو کو خراج گزار اور خراج دہ کہا جاتا ہے۔ قاضی نے جواب دیا کہ شرع کے مطابق اس ہندو کو خراج گزار کہا جائے گا جو اس وقت، جب محصل دیوانی اس سے چاندی طلب کرے تو وہ بغیر کسی تامل کے اور پوری تعظیم اور عاجزی کے ساتھ سونا پیش کرے اور اگر محصل اس کے منہ میں تھوکے تو وہ بغیر کسی کراہت کے اپنا منہ کھول دے اور اس حالت میں بھی محصل کی پوری طرح خدمت کرے۔ ("واگر محصل خوے در دہنِ او اندازد او بے ہیچ تنفرے دہن باز کند۔ تا محصل خوے در دہنِ او اندازد و دراں حالت محصل را خدمت کند") اور اس عاجزی اور اس ساری تذلیل کا مقصد ذمی کی انتہائی اطاعت نمایاں کرنا اور دینِ اسلام اور حق کی سربلندی، اور کفر یعنی دینِ باطل کی خواری ہے اور خدا ان لوگوں کی خواری کے متعلق فرماتا ہے۔ "عن ید ھم صاغرون" ان کو تباہ حال رکھو بالخصوص ہندوؤں کی خواری دین داری کے لوازمات میں سے ہے۔ کیونکہ وہ رسولِ اکرمؐ کے بدترین دشمن ہیں اور رسولِ اکرمؐ نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مالِ غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا ان کو قتل کیا جائے یا غلامی میں لیا جائے اور ان کے مال و ملک پر قبضہ کیا جائے۔ سوائے امام اعظمؒ کے، جن کے ہم پیرو ہیں، دوسرے آئمہ کے مذہب کے نزدیک ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنا جائز نہیں اور ان کے نزدیک ہندوؤں کے لیے اسلام کا یہ حکم ہے۔ "اما القتل واما الاسلام" (یعنی یا انہیں قتل کر دو یا وہ اسلام لائیں) سلطان علاء الدین قاضی مغیث کے جواب پر بہت ہنسا اور کہا کہ یہ باتیں جو تم نے کہیں، میں نہیں جانتا۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ خوط اور مقدم (یعنی دیہات کے ہندو نمبردار وغیرہ) اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ ولائتی کمانوں سے تیر اندازی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے

کے ساتھ محاربہ کرتے اور شکار کھیلتے ہیں، لیکن جہاں تک خراج، جزیہ، کری، (مکانوں کے ٹیکس) اور چرائی (یعنی چراگاہوں کے ٹیکس) کا تعلق ہے وہ ایک جیتل[۱] بھی ادا نہیں کرتے۔ وہ دیہات سے اپنی نمبرداری کا حصہ علٰحدہ وصول کرتے ہیں۔ اپنی مجالس منعقد کر کے شرابیں پیتے ہیں، لیکن ان میں بہت سے بُلانے پر یا بغیر بُلائے دیوانِ شاہی میں نہیں آتے اور سرکاری ٹیکس وصول کرنے والوں کی پروا نہیں کرتے۔ اس پر مجھے بڑا غصّہ آیا اور مَیں نے دل میں سوچا کہ مَیں تو یہ ارادے باندھتا ہوں کہ دوسری اقالیم کو فتح کروں اور دوسرے مُلکوں میں اپنا نظم و نسق رائج کروں، لیکن یہ جو سو کوس کی ولایت میرے تابع ہے اس میں بھی میری فرماں برداری کا حق، جیسا کہ چاہیے ادا نہیں ہوتا تو مَیں دوسری ولایت میں اپنی فرماں برداری کیسے کراؤں گا! چنانچہ مَیں نے اب ایسے ایسے انتظامات کیے ہیں اور رعیّت کو اس طرح اپنا فرماں بردار بنایا ہے کہ اگر میرا حکم ہو تو وہ چُوہوں کی طرح بلوں میں گُھس جائیں! اور اب تم بھی کہتے ہو کہ شرع کا بھی یہی حکم ہے کہ ہندو کو پوری طرح اور انتہائی طور پر فرماں بردار بنایا جائے۔" اس کے بعد بادشاہ نے کہا "اے مولنا مغیث! تم لکھے پڑھے آدمی ہو، لیکن تجربہ نہیں رکھتے۔ مَیں ناخواندہ ہوں لیکن میرا تجربہ وسیع ہے۔ تم یاد رکھو کہ ہندو کبھی بھی مسلمان کا فرماں بردار اور مطیع نہ ہوگا جب تک اس کو بے نوا اور بے حیثیت نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے حکم دیا ہے کہ آیندہ رعیّت کے پاس فقط اتنا کچھ رہنے دیا جائے کہ وہ زراعت اور دُودھ دہی کے لیے سال بہ سال سامان کر سکیں، لیکن ذخیرہ جمع کرنے اور جائداد بنانے کا موقع انھیں ہرگز نہ ملے۔"

دوسرا سوال رشوت خور عمّال کی سزا کے متعلق تھا۔ بادشاہ نے پُوچھا کہ کیا ان پر چور کی حدِ شرعی نافذ ہو سکتی ہے؟ قاضی نے جواب دیا کہ اگر سرکاری عاملوں کو

---

[۱] اسلامی حکومت کا روپیہ تنکہ یا ٹنگہ کہلاتا تھا، جس کے چونسٹھ جیتل (پیسے) ہوتے تھے۔

بقدرِ کفاف نہ ملتا ہو تو جو کچھ وہ بطور رشوت لیں ان سے ہر طرح کی سختی اور سزا کے ساتھ واپس لیا جاسکتا ہے، لیکن قطع ید جو مکان محفوظ سے مال چرانے کی سزائے شرعی ہے، ان حالات میں اس کے جواز کے متعلق میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا. (من در کتابے نخواندہ ام) بادشاہ نے کہا کہ میں نے حکم دے رکھا ہے کہ عاملوں اور عہدہ داروں کی اتنی تنخواہ مقرر کی جائے کہ ان کی آبرو سے گزر اوقات ہو جائے۔ اور اتنا جانتا ہوں کہ جس روز سے میں نے اس باب میں بندوبست کیا ہے، اور جب کوئی شخص کسی چیز پر از راہِ خیانت متصرف ہو جاتا ہے تو ہر قسم کی سختی اور عذاب کے ساتھ اس سے وہ چیز واپس لے کر خزانہ شاہی میں داخل کر لیتا ہوں۔ اس روز سے چوری اور خیانت بند ہے اور لالچیوں کی دست برد کم ہو گئی ہے۔

پھر بادشاہ نے پُوچھا کہ ایام بادشاہی سے پہلے جو زر و مال میں نے دیوگری سے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا وہ میرا ہے یا بیت المال کا؟ قاضی نے عرض کیا کہ چونکہ بادشاہ نے یہ مال لشکرِ اسلام کی مدد سے حاصل کیا ہے، اس لیے یہ مال بیت المال کا ہے۔ فقط بادشاہ کا نہیں۔ اس پر بادشاہ برہم ہُوا اور کہا کہ جو مال میں نے اپنی ملکی (گورنری) کے زمانے میں بڑی مشقت سے اُن ہندوؤں سے حاصل کیا ہے، جن کا نام و نشان بھی دہلی میں کوئی نہ جانتا تھا اور وہ خزانہ شاہی میں بھی داخل نہیں ہُوا۔ وہ بیت المال کا حصہ کیسے ہُوا! قاضی نے کہا کہ جو مال بادشاہ نے بہ نفسِ نفیس حاصل کیا وہ اس کا اپنا ہے اور جو مال فوج کی مدد سے حاصل ہُوا اس میں سب شریک ہیں۔ پھر بادشاہ نے پوچھا کہ اچھا بیت المال میں میرا اور میرے متعلقین کا حصہ کس قدر ہے۔ قاضی نے کہا کہ اب بالضرور میری موت آگئی۔ چونکہ بادشاہ سلامت پہلے سوال کے جواب سے ہی آزردہ خاطر ہو چکے ہیں، اس لیے اس سوال کا جواب تو اور بھی ناگوار خاطر ہوگا۔ بادشاہ نے اس کی تشفی کی تو قاضی نے عرض کیا: اس میں تین طریق کار ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ

بادشاہ راہِ تقویٰ اختیار کرے اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چلے۔ اس صورت میں اُسے اس مال میں سے فقط اس قدر لینا چاہیے جس قدر اس کے چاکروں کو ملتا ہے۔ اور جس طرح خداوندِ عالم نے عام سپاہیوں کے لیے دو سو چوبیس ۲۲۴ تنکے مقرر کیے ہیں۔ اسی طرح اپنے اور اپنے حرم کے نان و نفقہ کے لیے اتنی ہی رقم حضور خود بیت المال سے لیں۔ دوسرے اگر میانہ روی منظور ہو تو امرا و اراکینِ سلطنت کے برابر اپنے تصرف میں لائیں۔ یہ دونوں نہیں تو ان علمائے دُنیا کی رائے پر عمل کریں، جو بادشاہ کی عظمت پر نظر کر کے کہتے ہیں کہ بادشاہ بیت المال سے اس قدر لے سکتا ہے جس سے امرا اور اس کے درمیان امتیاز ظاہر ہو جائے۔ لیکن اس سے زیادہ لینا کسی طرح جائز نہیں۔

اس پر بادشاہ غضب ناک ہُوا اور کہنے لگا کہ تم میری تلوار سے نہیں ڈرتے جو یہ کہتے ہو کہ وہ زر و مال جو میرے محل میں جاتا ہے اور بطریقِ انعام اور دوسرے کاموں پر صرف ہوتا ہے سب ناجائز ہے۔ قاضی نے کہا کہ جب حضرت بادشاہ مجھ سے شرعی مسئلہ پُوچھیں تو میرا فرض ہے کہ مَیں شریعت کی کتابوں کے مُطابق عرض کروں، لیکن اگر آپ مجھ سے مُلکی مصلحت کے لحاظ سے سوال کریں تو مَیں یہی کہوں گا کہ جو کچھ بادشاہ کرتا ہے جائز اور قوانینِ مملکت داری کے عین مطابق ہے بلکہ اگر اس سے زیادہ بھی کرے تو بادشاہ کی شان و شوکت کا باعث ہو گا۔ اور اس سے کئی مُلکی فائدے ظاہر ہوں گے۔

اس کے بعد بادشاہ نے پُوچھا کہ مَیں جو ہر اُس سوار سے جو (لڑائی کے وقت) حاضر نہیں ہوتا، گذشتہ تین سال کی تنخواہ وصول کر لیتا ہوں۔ اور باغیوں اور فتنہ پردازوں کی اولاد اور متعلقین کو تہ تیغ کراتا ہوں۔ ان کے مال و اسباب کو خزانے میں داخل کرتا ہوں اور ان کے خاندانوں کو نیست و نابود کرتا ہوں اور دوسری سزائیں جو مَیں نے چوروں، شراب خوروں اور اہلِ زنا کے بارے میں اختراع کی ہیں، تمھارے نزدیک تو یہ سبھی نامشروع

ہوں گی۔ اس پر قاضی مجلس سے اُٹھا اور پلے مجلس میں جاکر زمیں بوسی کر کے کہنے لگا کہ ہاں حضور یہ سب باتیں نامشروع ہیں۔

بادشاہ غضبناک ہوکر حرم سرائے میں چلا گیا اور قاضی بھی جلدی سے اپنے گھر گیا اور اہلِ خانہ کو الوداع کہہ کر اپنی موت کی تیاری کی۔ صدقہ دیا بلکہ غسلِ میّت بھی کر لیا، لیکن مثل مشہور ہے 'سچ کا خدا نگہبان' بادشاہ نے قاضی کو بلا کر اس پر بڑی مہربانی کی۔ اپنا خلعتِ خاص اُتار کر اسے پہنایا اور ہزار تنکہ انعام دے کر کہا کہ تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے، لیکن میں جو کچھ کرتا ہوں مصلحتِ مُلکی اور رفاہِ عامہ کے لیے ہے اور اس کے بغیر اس ملک میں چارہ نہیں۔

"وگفت کہ قاضی مغیث، من اگرچہ علمے و کتابے نخواندہ ام[1] اما از چندیں پُشت مسلمان و مسلمان زادہ ام و از برائے آنکہ بلغا کے نشود کہ در بلغاک چندیں ہزار آدمی کشتہ می شود بہر چیزیکہ درآں صلاحِ ملک و صلاحِ ایشاں باشد بر خلق امر می کنم و مردماں رہ دیدگی و بے التفاتی می کنند و فرمانِ مرا بجانمے آرند۔ مرا ضرورت می شود کہ چیزہائے درشت در بابِ ایشاں حکم کنیم کہ ایشاں بداں فرماں برداری کنند و نمی دانم کہ آں حکم ہا مشروع است و یا نامشروع۔ من در ہر چہ صلاحِ مُلک خود می بینم و مصلحتِ وقت مرادراں مشاہدہ می شود حکم می کنم و نمی دانم کہ خدائے تعالیٰ فردا قیامت بر من چہ خواہد کرد۔" (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۵، ۲۹۶)

اس کے بعد قاضی سے کہا کہ اگر کوئی شخص چوری یا زنا کرے یا شراب پیئے تو مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، لیکن ان باتوں میں پیغمبروں کے احکام ہیں، جن کی تعمیل کراتا ہوں۔ پھر بھی بعض لوگ اتنے بے باک ہیں کہ سخت سزاؤں کے باوجود باز نہیں آتے۔ جب تک یہ لوگ اپنے افعالِ شنیعہ نہیں چھوڑتے میں درشت

---

[1] برنی میں ہے: "منکہ جاہلم و ناخواندہ و نانویسندہ ام و بجز الحمد و قل ہو اللہ، دعائے قنوت و التحیات چیزے دیگر خواندن نمی دانم۔" (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۷)

سزائیں کس طرح ترک کر دوں!!

قاضی شمس الدین محدّث کا سفرِ ہند
۱۳۰۸ء

برنی نے "محدّثِ بے نظیر عالم" قاضی شمس الدین ترک کا ذکر بھی کیا ہے، جو سلطان علاء الدین خلجی کی شہرت سُن کر حدیث کی چار سو کتابوں کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ملتان تک پہنچے۔ یہاں شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پوتے شیخ شمس الدینؒ فضل اللہ کے مُرید ہوئے، لیکن جب انھیں پتا چلا کہ علاء الدین نماز نہیں پڑھتا اور جمعہ کے لیے حاضر نہیں ہوتا تو یہیں سے ایک رسالہ لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور ملتان سے ہی واپس چلے گئے۔ اس رسالے میں علاء الدین خلجی کی کئی خوبیوں کی بڑی تعریف کر کے انھوں نے لکھا کہ میں مصر سے بادشاہ اور اہلِ دہلی کی خدمت کے لیے آیا تھا تاکہ علمِ حدیث کو دہلی میں عام کروں اور انھیں "روایتِ دانشمنداں" (فقہا) سے نجات دلاؤں، لیکن جب یہاں آکر بادشاہ کی مذہب سے عدمِ دلچسپی کا حال معلوم ہُوا اور یہ پتا چلا کہ اس نے قاضی حمید ملتانی جیسے شخص کو، جس کے باپ دادا کا پیشہ ہی رباخوری تھا، قضائے مملکت سپرد کر رکھی ہے اور قاضیوں کی نامزدگی میں احتیاط نہیں کرتا تو میں نے آگے آنا مناسب نہ سمجھا۔

(برنی ص ۲۹۷-۲۹۹)

مولانا اکبر خاں نے وضاحت کی ہے کہ یہ محدث عالم اصل میں مولانا شمس الدین ابن الحریری تھے۔ "جو مصر کے حنفی قاضی اور حضرت امام ابن تیمیہؒ کی حمایت کے سبب سے معزول کر دیے گئے تھے۔ ۷۰۸ھ میں بعہدِ سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان آئے اور حدیث کی چار سو کتابیں ساتھ لائے۔ غالباً یہ سب سے پہلا قابلِ ذکر ذخیرۂ احادیث تھا، جو ہندوستان میں آیا..... (وہ) یہاں مولانا شمس الدین تُرک کے نام سے مشہور ہوئے۔ (اس زمانے میں ہندوستان کے اندر مصری و رومی لوگوں کو حکومت سلجوقیہ کی وجہ سے تُرک کہا جاتا تھا...)" [آئینہ حقیقت نما جلد اول ص ۲۴۲]

برنی نے یہ بھی لکھا کہ علاء الدین کے دبیر نے قاضیِ ممالک کی طرف داری کرتے ہوئے مولنا شمس الدین کا رسالہ وغیرہ سلطان تک پہنچنے نہ دیا۔ بعد میں اسے سعد منطقی نے اس کے متعلق اطلاع دی۔ چنانچہ اس نے رسالہ منگا کر دیکھا مولنا کی واپسی پر افسوس کیا اور دبیر کے خلاف تنفّر کا اظہار کیا۔ (ص ۲۹۹)

خاندانِ خلجی کا خاتمہ

سلطان علاء الدین خلجی میں بعض واضح نقائص کے باوجود کئی بڑی خوبیاں بھی تھیں لیکن مطلق العنان طرزِ حکومت میں جو خرابیاں بالعموم پیدا ہو جاتی ہیں، وہ بالآخر یہاں بھی شروع ہوئیں اور سلطان علاء الدین کا انجام بڑا عبرت ناک ہُوا۔ مسلسل کامیابیوں (بالخصوص دکن میں ملک کافور کی عدیم النظیر فتوحات) نے بادشاہ کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا۔ اب وہ کوئی اختلاف رائے برداشت نہ کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کی مجلس ملک علاء الملک جیسے خیر خواہ اور نمک حلال مشیروں سے خالی ہو گئی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اپنے سپہ سالار ملک کافور کا اتنا والہ و شیدا ہو گیا کہ اس کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتا اور ملک کافور نے اس اثر کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بادشاہ ان دنوں ایک مہلک اور سخت تکلیف دہ بیماری[1] میں مُبتلا ہُوا۔ جس نے اس کی رائے روشن اور عقلِ سلیم پر بھی اثر ڈالنا شروع کیا۔ بقول عصامی ؎

غرض چوں شہنشاہِ پرہیزگار | شُد از زورِ زحمت نحیف و نزار
بدانست "ایں دردِ من لادواست" | ز افزودنِ درد عقلش بکاست
بلے مردم از درد شیدا شود | درو غفلت و سہو پیدا شود

لیکن اس کی بیوی ملکہ جہاں اور ولی عہد خضر خان کو اپنی رنگ رلیوں سے کام تھا ملکہ جہاں کو ان دنوں اپنے پوتوں کے ختنوں اور عقیقہ کے جشنوں کے سوائے جو آئے دن نئے طریقوں سے جاری ہوتے اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

---

[1] سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ علاء الدین مرض استسقاء میں مُبتلا ہُوا۔ (ص ۲۴۵)

شہزادہ خضر خاں بھی سوائے مجلس آرائی و شراب خوری و چوگان بازی و رقص و سرود کے اور کسی طرف توجہ نہ کرتا۔ بادشاہ یہ باتیں دیکھتا اور دل میں رنجیدہ ہوتا کہ اس کی بیماری سے کوئی متاثر نہیں۔ اس سے ملک کافور کو موقع ملا کہ وہ بادشاہ کو اس کے عزیزوں کے خلاف بھڑکا کر اپنے منصوبے پورے کرے۔ چنانچہ اس نے خضر خاں اور ملکہ جہاں کو قید اور ملکہ جہاں کے بھائی الپ خاں کو قتل کرا دیا۔ اور بادشاہ اس اثنا میں آٹھ جنوری ۱۳۱۶ء کو وفات پا گیا۔

علاء الدین کی وفات کے دوسرے روز ملک کافور نے ایک بادشاہی فرمان دکھایا جس کے مطابق خضر خاں معزول ہو کر خورد سال شاہزادہ شہاب الدین عمر بادشاہ ہوا۔ چنانچہ خضر خاں اور اس کے بھائی شادی خاں کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر انھیں اندھا کر دیا گیا اور ایک تیسرے شہزادے مبارک خاں کو اندھا کرنے کے لیے آدمی گئے تھے کہ اس شہزادے نے انھیں اپنے والد کے حقوق یاد دلا کر اور انعام و اکرام کا لالچ دے کر ملک کافور کے خلاف آمادۂ عمل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے واپس جا کر ملک کافور اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا اور شہزادہ مبارک سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی ابتدا اچھی تھی لیکن جلد ہی اس پر نامبارک اثرات غالب آنے لگے۔ جب چند امیروں نے ایک خورد سال شہزادے کو بادشاہ بنا کر بغاوت کا اہتمام کیا تو قطب الدین نے نہ صرف باغیوں اور شہزادے کو سزا دی بلکہ اپنے بھائی خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کروا دیا۔ اور جب تخت کے سارے دعویدار ختم ہو گئے تو بری طرح عیاشی اور ہوا پرستی پر کمر باندھی۔ بادشاہ بالعموم اہلِ نشاط کی محفل میں رہتا۔ گاہے گاہے دربار میں زنانہ کپڑے پہن کر آتا اور درباری مسخرے اور بھاٹ معزز امرا اور درباریوں کا تمسخر اڑاتے۔ قطب الدین نے اپنا دین و ایمان ایک نیچ ذات کے نومسلم غلام خسرو خاں کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ اس نے دربار اور محل میں اپنی قوم کے آدمی بھرتی

کر لیے اور جب یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو تختِ شاہی کی ہوس میں قطب الدین کا خاتمہ کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۴ اپریل ۱۳۲۰ء کا ہے۔ اس کے بعد خسرو اور اس کے ساتھیوں نے محلسرا میں داخل ہو کر خاندانِ علائی کے بچے بچے کو قتل کروا دیا اور من اوّل تا آخر اس خاندان کا صفایا کر دیا۔

عہدِ علائی میں علم و ادب

خاندانِ خلجیہ کی کل مُدتِ حکومت چالیس سال سے بھی کم تھی۔ لیکن جس طرح اس زمانے میں اسلامی حکومت کو انتہائی توسیع نصیب ہوئی۔ اسی طرح دورِ مُغلیہ سے پہلے علم و ادب کو بھی سب سے زیادہ رونق انہی ایّام میں تھی۔

دَورِ خلجی کا پہلا بادشاہ (جلال الدین) خود شاعر تھا اور اسے شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی بلکہ اس کے مخالفین کہا کرتے تھے کہ بادشاہ کو شعر و شطرنج کے سوا کسی اور چیز سے رغبت نہیں اور اب وہ بادشاہت کے قابل نہیں رہا۔ ہندوستان کے اس پہلے شاعر بادشاہ کے کئی اشعار کتبِ تواریخ میں درج ہیں۔ ایک بڑی شوخ رباعی ہے ؎

آں زلفِ پریشانت ژولیدہ نمی خواہم — واں رُوئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی — ہاں بانگِ بلند است ایں پوشیدہ نمی خواہم!

ایک دفعہ جب وہ قلعۂ گوالیار کا محاصرہ کر رہا تھا تو اس نے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی اور اس کے متعلق خود ایک رُباعی لکھی ؎

ما را کہ قدم بر سرِ گردوں ساید — از تودۂ سنگ و گل چہ قدر افزاید
ایں سنگِ شکستہ زاں نہادیم درست — باشد کہ دلِ شکستۂ آساید

برنی نے عہدِ جلالی کی شاعرانہ مجلسوں اور بے تکلف صحبتوں کو بڑی حسرت سے

اور مزہ لے لے کے یاد کیا ہے اور ان کی تفصیلات درج کتاب کی ہیں۔

"اور ہر روز امیر خسرو اس مجلس میں نئی نئی غزلیں لاتے۔ بادشاہ امیر خسرو کی غزلوں کو بڑا پسند کرتا تھا اور انھیں گراں قدر انعام دیتا۔ بادشاہی مجلس کے ساقی پسران ہیبت خاں اور نظام خریطہ دار اور یلدز سر ساقی تھے اور ان کا حسن و جمال کچھ ایسا تھا کہ ہر زاہد و عابد جو ان کے چہرے پر نظر کرتا، زنّار گلے میں باندھ لیتا اور مصلے کو بوریائے خمار خانہ بناتا اور ان بے بدل ہستیوں کے عشق میں بدنامی اور رسوائی قبول کرتا۔ مجلس شاہی کے مطربوں میں محمد چنگی باجا بجاتا اور فتوحا اور نصرت خاتون گانا گاتیں اور ان کی میٹھی اور سُریلی آواز سے مسحور ہو کر مرغان ہوا زمین پر اُتر آتے۔ کنیزانِ خاصہ نصرت بی بی اور مہر افروز کے حسن و جمال اور ناز و نخرے کا یہ عالم تھا کہ جس طرف وہ دیکھتیں اور جو کرشمہ و غمزہ وہ برساتیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف نمک پاشی ہو رہی ہے۔ وہ بادشاہ کی مجلس میں رقص کرتیں اور جو کوئی ان کی پاکوبی اور ناز و نخرے کو دیکھتا یہی چاہتا کہ اپنی جان ان پر نثار کرے اور تمام عمر ان کے زیرِ پا سے اپنی آنکھیں نہ اُٹھائے!! (ترجمہ از تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۹)

سلطان جلال الدین کے بعد علاء الدین تخت نشین ہوا۔ وہ جابر اور خشک قسم کا دُنیادار بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے دربار سے شعر خوانی اور رقص و سرود کا سلسلہ اُٹھا دیا۔ اس سے پہلے امیر خسرو کو مصحف داری کی خدمت سپرد تھی۔ لیکن یہ خدمت برائے نام تھی اور عطیۂ شاہی کے لیے بہانہ۔ امیر فی الحقیقت "ملک الندما" تھے اور ان کا کام شاہی مجلسوں کو اپنے اشعار سے گرم کرنا تھا۔

علاء الدین نے برسرِ حکومت ہو کر حکم دیا کہ ہر ایک شخص اپنے فرائض پوری طرح ادا کرے اور معینہ خدمات بجا لائے۔ امیر خسرو بھی اس سے مستثنےٰ[1] نہ تھے۔

---

[1] برنی لکھتا ہے "اگرچہ امیر خسرو در عہدِ محمود و سنجر پیدا آمدے ظاہر و غالب آنکہ بادشاہان ولائتے و اقطاعے بدو انعام دادندے و اورا در مجلس خود مکرم و مبجل داشتندے و امیر خسرو ایں چنیں

(باقی اگلے صفحے پر)

چنانچہ انھوں نے ایک طویل نظم میں شکایت کی ہے کہ دن اور رات مجھے دربار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ مَیں تلاشِ مضمون کے لیے وقت کس طرح نکالوں اور تلاش و محنت کے بغیر جو اشعار لکھے جائیں ان میں حلاوت اور گہرائی کہاں سے آئے!

بادشاہ کی شعر و سخن میں اس قدر دلچسپی تھی، لیکن خدا کی شان ہے کہ علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے یہ زمانہ عہدِ اکبری کا صحیح پیش رَو ہے۔ امیر خسرؔو کا مشہور خمسہ اسی دَور میں لکھا گیا اور امیر خسرؔو کے علاوہ امیر حسؔن اور ضیاء الدین برنؔی اس زمانے میں زندہ تھے۔ ان تینوں کے علاوہ برنؔی لکھتا ہے :۔

"و صدر الدین عالی و فخر الدین قواس و حمید الدین راجا و مولانا عارف و عبید حکیم و شہاب انصاری و صدر بستی کہ شعرائے عصرِ علائی بودند و از دیوان عرض مواجب شاعری مے یافتند و ہر یکے را در نظم شیوہ و طرزے بودے و دیوانہا دارند و نظم و نثر ایشان بر اوستادی و شاعری ایشاں حاکی است۔" (ص ۳۶۰-۳۶۱)

افسوس ہے کہ ان صاحبِ دیوان شعرا کے اب نام ہی نام باقی ہیں، ان کا کلام نہیں ملتا۔ ان میں سے عبید حکیم کا دیوان اگر مل جائے تو ضرور دلچسپ ہو۔ برنؔی لکھتا ہے کہ سعد منطقی اور عبید حکیم کی صحبت نے محمد تغلق کو مذہب کے معاملے میں آزاد خیال و متشکک بنا دیا تھا اور اب وہ منقولات میں سے انھیں باتوں کا قائل ہوتا جو عقل کے ترازو پر ٹھیک اُترتیں۔ عبیؔد نے امیر خسرؔو کے خمسہ پر کئی جگہ طنز کیا ہے۔ ایک شعر بدایونی نے نقل کیا ہے ؎

غلط اُفتاد خسرؔو را ز خامی
کہ سکبا پُخت در دیگِ نظامی

---

[۱] و ہر سعرا و فضلائے سلف و خلف را ہمیں یک ہزار تنکہ مواجب دادے و در پیش خود مبجل و مکرم نگردانیدے حق احتشام و محافظت نکردے۔" (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶)

[۲] سکبا یعنی کسی گوشت کا شوربا۔

ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

دوش دیدم نظامی اندر خواب — گوئیا شستہ خمسہ را مے مُشست
گفتم اے شیخ! از چہ مے شوئی — اے بزرگِ زمانہ پشت بہ پُشت
گفت از ننگِ خسروِ لاچین — کو چہ داند جواب خمسہ گفت

امیر خسرو نے اس کے جواب میں لکھا ؎

دوش دیدم نظامی اندر خواب — بر دہانِ عبید مے زد مُشت
گفتم اے شیخ از چہ رنجیدی — چہ گنہ کرد ایں خبیث دُرشت
گفت بنگر چہ افترا کردہ است — خمسۂ خویش را نظامی گُشست
بدویدم بپایش اُفتادم — ورنہ ایں سفلہ را بجامی گُشت

اسی طرح کئی مورخین تھے، جن کی تصانیف کا اب کچھ پتا نہیں چلتا مثلاً کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی (در تالیف نثر عربی و پارسی یدِ بیضائے نمود و در فتح نامہ مجلدات پرداختہ است وداد نثر نویسی دادہ) برنی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ عہدِ علائی میں بلکہ اس سے پہلے بھی دہلی میں کثرت سے اہلِ قلم موجود تھے۔ (وجملہ دار الملک دہلی چہ در عصرِ علائی وچہ پیش از عصرِ علائی و بعد از و مصنفان و مولفان و شاعران و فاضلانِ بسیار بودہ اند و ہستند) لیکن ہم اب ان کی تصنیفات اور احوالِ زندگی سے ناواقف ہیں۔ ہماری ابتدائی ادبی زندگی کا یہ افسوس ناک واقعہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر کارناموں کو زمانے کی دستبرد نے صفحۂ ہستی سے محو کر دیا۔ صرف صوفیہ کے تذکروں، بعض تاریخی کتب اور امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ مروت کا سلوک ہوا ہے۔ اور ان سے ہم محروم نہیں رہے، لیکن شعر و ادب اور کتب تاریخ کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا۔

شعرا اور ادبا کے علاوہ برنی کا بیان ہے کہ عہدِ علائی میں مذہبی عالم بھی کثرت سے تھے۔ "در تمامی عصرِ علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ آں چناں

اُستادان کہ ہر یکے علامۂ وقت و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشد و در ہر علمے کہ فرض کنند، از منقولات و تفسیر و فقہ و اصولِ دین و نحو و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے مے شگافتند و ہر سالے چندیں طالبانِ علم از اُستادان سر آمدہ بدرجہ افادات می رسیدند و مستحق جواب دادن فتوئے می شدند و بعضے ازاں اُستاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجہ غزالی و رازی رسیدہ بودند چنانکہ ..... (ص ۳۵۲)

برنی نے اس کے بعد کوئی چھیالیس علما کے نام گنائے ہیں۔ ان میں شاید ایک کی بھی کوئی علمی یادگار اس وقت نہیں۔ اور فی الحقیقت یہ بزرگ معلمین اور مدرسین کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عہدِ علائی میں حضرت سلطان المشائخ، امیر خسرو، امیر حسن اور خود برنی کی موجودگی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علم و فضل کا معیار بہت بلند ہوگا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس زمانے میں چھیالیس غزالی یا رازی یا شاید ایک دو بھی شاہ ولی اللہؒ موجود تھے۔ اس زمانے کے حالات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ عام علم دوستی اور اہلِ علم کی کثرت کے باوجود، فنِ طباعت کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی کثرت نہ تھی اور صحتِ علمی اور تحقیقات کو بدرجۂ کمال تک پہنچانا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اعتقاد و محبت کا زور تھا۔ تنقیدی نقطۂ نظر ابھی عام نہ ہوا تھا۔ جو لوگ عبید منطقی کی طرح معقولات کے قائل تھے، وہ تخریبی کوششوں یا خیالی بوالعجبیوں میں گرفتار تھے اور عوام ہر ایک بات پر آمنّا و صدّقنا کہتے تھے۔ محدثوں کا طریقہ جس کے مطابق روایات کو کڑے تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھتے تھے۔ ابھی تک مذہبی حلقوں میں عام نہ ہوا تھا۔

علما و مشائخ کے ضمن میں خواجہ ضیاء الدین سنامی کا ذکر یہاں ضروری ہے جو نصاب الاحتساب کے مصنف تھے اور شدت سے احکام شرعی پر عامل تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کی مونچھیں بہت بڑھی

ہوئی تھیں۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان سے مونچھوں کے کٹوانے کی فرمائش کرتا خواجہ صاحب کو پتا چلا تو قینچی لے کر پہنچے اور اپنے ہاتھ سے قلندر صاحب کی مونچھیں کاٹ دیں۔ وہ سماع کی بنا پر حضرت سلطان المشائخ پر معترض تھے۔ لیکن ان کے زہد و تقوےٰ اور دیانت داری کی وجہ سے حضرت سلطان المشائخ ہمیشہ ان کا ادب کرتے تھے۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے تو حضرت شیخ عیادت کے لیے گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنی پگڑی سلطان المشائخ کے پاؤں میں ڈال دی اور اپنی درشتی اور سخت گیری کی معافی چاہی۔ سلطان المشائخ نے پگڑی اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگائی اور جب خواجہ ضیاء الدین وفات پا گئے تو آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگے "یک ذات بود حامی شریعت حیف کہ آں نیز نماند"۔ (اخبار الاخیار)

امیر حسن سنجری
(وفات ۷۳۳ھ/۱۳۳۲ء)

اس زمانے کی ایک اور برگزیدہ ہستی جسے حضرت سلطان المشائخ کی روحانی عظمت نے مسخر کیا امیر حسن سنجری تھے۔ وہ امیر خسرو کی طرح شاعر تھے اور دونوں میں کمال دوستی تھی۔ بلکہ مشہور ہے کہ جب ایک دفعہ خانِ شہید نے انھیں ایک دوسرے سے ملنے سے منع کر دیا اور اس حکم کی خلاف ورزی پر ان میں سے ایک کے ہاتھ پر تازیانے لگائے گئے تو ان تازیانوں کے نشان دوسرے کے ہاتھ پر بھی نظر آتے تھے۔ امیر حسن کا پورا نام خواجہ نجم الدین حسن سنجری تھا۔ چونکہ ان کے بزرگ سیستان یا سجستان کے رہنے والے تھے اس لیے سنجری کہلاتے تھے۔ ان کے والد کا نام علاء الدین حسن تھا۔ آپ امیر خسرو کی پیدائش سے ایک سال پہلے ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر امیر خسرو کے ساتھ خان شہید کی ملازمت اختیار کی۔ جب خان شہید مغلوں کے ساتھ معرکہ میں مارا گیا اور امیر خسرو نے بڑا پُر درد مرثیہ لکھا تو امیر حسن نے بھی فارسی نثر میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ آپ کی سب سے مشہور تالیف فواید الفواد ہے۔ جس میں آپ نے اپنے مرشد کے

ملفوظات قلمبند کیے۔ جتنی شہرت اس کتاب کو ہوئی ہے، اسلامی ہند و پاکستان کے کسی ملفوظات کے مجموعے کو نصیب نہیں ہوئی۔ اور مشہور ہے کہ امیر خسرو کہا کرتے تھے کہ کاش حسن میری ساری تصانیف لے لے اور ان کے بدلے یہ کتاب مجھ کو دے دے۔ آپ ویرانیٔ دہلی کے وقت زندہ تھے اور سلطان محمد بن تغلق کے حسب الحکم آپ کو دہلی چھوڑ کر دولت آباد جانا پڑا۔ یہیں ۷۳۸ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ مزار دولت آباد سے چند میل کے فاصلے پر خلد آباد میں ہے۔ عوام الناس میں مشہور ہے کہ جو کوئی اس مزار کی دہلیز کو بوسہ دیتا ہے اس کا ذہن کھل جاتا ہے۔ اور وہ نوشت و خواند میں جلد ترقی کرتا ہے۔ حسن کا ضخیم فارسی دیوان حیدر آباد دکن میں چھپ چکا ہے اور ارمغان پاک میں ہم نے اس سے طویل اقتباسات منتخب کیے ہیں۔

طوطیٔ ہند امیر خسرو

ہند و پاکستان نے چار بلند پایہ فارسی شاعر پیدا کیے ہیں۔ خسرو، فیضی، غالب اور اقبال۔ ان میں خسرو ہی ایک ایسا شاعر تھا جس کا مرتبہ اہلِ زبان بھی تسلیم کرتے تھے۔ مولانا جامی ان کی نسبت بہارستان میں لکھتے ہیں:۔

امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ در شعر مستثنیٰ است۔ قصیدہ و غزل و مثنوی ور زیدہ و ہمہ بکمال رسانیدہ۔ تتبع خاقانی مے کند۔ ہر چند در قصیدہ بہ وے نرسیدہ، امّا غزل را از وے گزرانیدہ۔ غزلہائے وے بواسطۂ معانی آشنائی کہ ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجدان خود را مے یابند مقبول ہمہ کس افتادہ است۔ خمسۂ نظامی را برابر او وے کسے جواب نگفتہ۔ وورائے آں مثنوی ہائے دیگر دارد ہمہ مطبوع و مصنوع۔"

امیر خسرو جن کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین اور تخلص خسرو تھا، ۱۲۵۳ء میں

پٹیالی میں (جو اب ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے) پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ اور والدہ ایک نومسلم رئیس کی بیٹی تھیں۔ شاعری کا جذبہ فطری تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں تمام درسی علوم و فنون سے فراغت حاصل کر لی اور دربارِ بلبن کے ایک ممتاز رکن ملک کشلو خان یا کشلو خان المعروف بہ ملک چھجو کے پاس جا کر ملازم ہوئے۔ اس کی تعریف میں آپ نے کئی قصیدے لکھے ؎

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است
آسماں روئے ملک چھجو نمود!

اس کے بعد بلبن کا بیٹا بغرا خان آپ کو بنگال لے گیا۔ بغرا خاں اور اس کے میر منشی شمس الدین دبیر نے آپ کو بنگالہ میں ہی روکنا چاہا۔ لیکن آپ نے قبول نہ کیا۔ وہاں سے رخصت لے کر واپس آئے۔ (۱۲۸۰ء) اور بلبن کے دوسرے بیٹے خان شہید کے ملازموں میں داخل ہوئے اور اس کے ساتھ ملتان میں جو اس وقت دہلی کے بعد علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا، تشریف لے گئے۔ وہاں پانچ سال کے قریب ان کا قیام رہا۔ ۱۲۸۵ء میں شاہزادہ مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوا اور ایک تاتاری نے امیر خسرو کو بھی گرفتار کر لیا اور ان سے ایک عام مزدور کا کام لینا شروع کیا ؎

منکہ بر سر نمے نہادم گل　　　توبرہ برنہاد و گفتا جل

پتا نہیں اس بلا سے کس طرح رہائی پائی۔ اور پٹیالی پہنچ کر ماں کے دیدار سے شاد کام ہوئے۔ اس کے بعد دہلی آئے اور بلبن کے دربار میں پہنچ کر خان شہید کا جو پُر درد مرثیہ لکھا تھا وہ پڑھا ؎

واقعہ ہست ایں یا بلا از آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

دربار میں کہرام مچ گیا۔ بلبن اتنا رویا کہ بخار آگیا۔ اور بالآخر اسی صدمے اور

بخار سے تیسرے روز انتقال کیا۔ (شعر العجم)

بلبن کی وفات کے بعد اس کی خواہش کے خلاف کیقباد کو تخت نشین کیا گیا۔ اس کا وزیر ملک نظام الدین امیر کے خلاف تھا۔ لیکن بادشاہ خود امیر کا مداح تھا ؎

معز الدنیا بود شاہ کیقباد　　زشاہاں کسے کا دلم کرد یاد

اس نے امیر سے استدعا کی کہ اس کی اور اس کے والد بغرا خاں کی ملاقات کا حال نظم میں بیان کریں چنانچہ ۱۲۸۹ء میں قران السعدین تصنیف ہوئی لیکن اگلے سال کیقباد نے دُنیا کو خیر باد کہا اور سلطان جلال الدین خلجی تخت نشین ہُوا۔ یہ بادشاہ شاعر اور شعر فہم تھا۔ اس نے معقول مشاہرہ دے کر خسرو کو ندیم خاص بنایا اور مصحف داری اور امارت کا عہدہ اور ملبوس خاص عطا کیا۔ امیر خسرو کو جو امیر[1] کہا جاتا ہے' اس کی ابتدا اسی زمانے سے ہوئی۔ خسرو نے جلال الدین کی تاج پوشی اور اس کے دیگر حالات کو مفتاح الفتوح میں نظم کیا۔ لیکن ۱۲۹۵ء میں علاء الدین نے جلال الدین کو مروا ڈالا اور خود تخت نشین ہُوا۔ خسرو نے اس کی فتوحات کو بھی نثر کی ایک کتاب خزائن الفتوح میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔ نیز خمسۂ نظامی کے جواب میں جو پانچ مثنویاں لکھیں وہ بھی سب سلطان علاء الدین کے نام معنون ہیں۔ اسی بادشاہ کے ولی عہد خضر خاں اور دیول رانی

---

[1] عہدِ مغلیہ سے پہلے اعلیٰ شاہی عہدہ داروں کے تین مراتب ہوتے تھے۔ (۱) خان (جن میں سب سے بڑے کو اُلغ خان یا خانِ خاناں کہا جاتا) (۲) ملک اور (۳) امیر۔ بعض بیانات کے مطابق ترتیب یہ تھی:۔

دس سواروں کا افسر ــــ سرخیل ، سو سواروں کا افسر ــــ سالار،
ہزار سواروں کا افسر ــــ امیر ، دس ہزار سواروں کا افسر ــــ ملک،
لاکھ سواروں کا افسر ــــ خان ،

کے عشق کی کہانی بھی ایک مثنوی بنام عشقیہ میں بیان ہوئی ہے۔ (۱۳۱۶ء)

علاء الدین کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ایک عیاش اور سبک سر بادشاہ تھا۔ لیکن امیر خسرو کی قدردانی میں وہ سب سے بڑھ گیا۔ خسرو نے جب ۱۳۱۸ء میں مثنوی نہ سپہر اس کے نام پر لکھی تو اس نے ہاتھی برابر تول کر روپے دیے۔ لیکن وہ جلد ہی مارا گیا۔ اور اس کا نیم مسلم غلام خسرو خاں تخت پر قابض ہو گیا۔ مگر اسے چار ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ اور سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ وہ بھی امیر خسرو کا مربی تھا اور امیر نے تغلق نامہ میں سلطان اور خسرو خاں کی کشمکش کا حال لکھا ہے۔

امیر خسرو اور حضرت سلطان المشائخ

جب اخیر عمر میں سلطان غیاث الدین تغلق لکھنوتی (بنگالہ) گیا تو امیر خسرو بھی ساتھ تھے۔ اور وہاں کچھ عرصہ کے لیے رک گئے۔ اس عرصے میں خبر مشہور ہوئی کہ ان کے مرشد[1] خواجہ نظام الدین اولیا[2] نے انتقال کیا۔ امیر بتعجیل تمام روتے پیٹتے دہلی پہنچے اور مزار مقدس حضرت سلطان المشائخ پر حاضر ہوئے

جامہ دراں، چشم چکاں، خونِ دل رواں!

اور کہا کہ مسلمانو! میں کون ہوں جو ایسے بادشاہ کے لیے روؤں۔ میں تو اپنے لیے روتا ہوں کہ سلطان المشائخ کے بعد میرا بھی خاتمہ ہے۔ چنانچہ اپنے مرشد سے چھ مہینے بعد ۱۸ نومبر ۱۳۲۴ء کو اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف رحلت کی۔ اور مرشد کے پائیں مزار دفن ہوئے۔

امیر خسرو ایک بڑے عابد اور اہل اللہ شاعر تھے۔ سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ ہر رات تہجد کے وقت کلام اللہ کے سات سیپارے پڑھتے اور یہ تی بھی ان کی

---

[1] امیر آٹھ سال کی عمر سے شیخ کی خدمت میں آتے جاتے تھے۔ بیس سال کی عمر میں بیعت کی۔

[2] سیر الاولیا (فارسی) ص ۳۰۵

نسبت لکھتا ہے :-

ومع ذالک افضل والکمال والفنون والبلاغ صوفی مستقیم الحال بود وبیشتر عمراو در صیام وقیام وتعبد وقران خوانی گزشتہ است وبطاعات معتد بہ ولازمہ یگانہ شدہ بود۔ ودائم روزہ داشتے واز مریدان خاصہ شیخ بود وآنچناں مرید معتقد من دیگرے ندیدہ ام (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹)

امیر خسرو کو اپنے مرشد اور حضرت سلطان المشائخ کو اپنے مرید سے بڑی محبت تھی۔ خواجہ صاحب انھیں "ترک" یا "ترک اللہ" کہہ کر پکارتے۔ ہر روز عشا کی نماز کے بعد جب شیخ مجلس برخاست کر دیتے اور خلوت خاص میں چلے جاتے تو امیر خلوت میں جانے کے مجاز تھے۔ اور اس موقع پر جس کو کوئی گزارش کرنی ہوتی وہ امیر کی وساطت سے پیش کرتا۔ چنانچہ جب ایک دفعہ سلطان المشائخ شیخ برہان الدین غریب سے ناراض تھے تو انھوں نے امیر خسرو کی معرفت ہی عرض معروض کر کے اپنی خطا بخشوائی۔

حضرت سلطان المشائخ کو امیر کی شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ جب وہ ابتدائے حال میں امیر خسرو کے نانا راوت عرض کے ہاں مقیم تھے تو امیر خسرو ہر روز اپنے اشعار انھیں سناتے۔ ایک مرتبہ انھیں سلطان المشائخ نے فرمایا، "طرزِ صفاہانیاں بگو۔ یعنی عشق انگیز وزلف وخال آمیز"[۱]۔ چنانچہ امیر خسرو نے اس کے بعد عام شاعرانہ خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی۔ اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ سلطان المشائخ کی ایک رباعی بھی اپنے خوش قسمت مرید کی نسبت سیر الاولیا میں نقل ہوئی ہے ؎

خسرو کہ بنظم ونثر مثلش کم خاست	ملکیست ملک سخن آں خسرو راست
ایں خسروِ ماست ناصر خسرو نیست	زیرا کہ خدائے ناصر خسروِ ماست

---

[۱] سیر الاولیا ص ۳۰۱

مقامی رنگ

امیر خسرو کو اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ غالباً ہندوالاصل تھیں[1]۔ امیر کو ہندو مذہب سے خاص واقفیت اور اپنے وطن کی ہر چیز سے بڑا اُنس تھا۔ تذکروں میں ان کی ایک تصنیف مناقب ہندوستان کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب تو اب عنقا ہے لیکن امیر کی دوسری تصانیف میں ان کے جذباتِ دلی صاف چھلک پڑے ہیں۔

ہندوستانی تشبیہیں اور ہندوستانی مضامین تو ان کی تصانیف میں کثرت سے ہیں۔

زہے خرامش آں نازنیں بہ عیاری　　　　کبوترے بہ نشاط آمدہ است پنداری

لیکن مثنویوں میں کئی جگہ اُنھوں نے بالتفصیل ہندوستانی چیزوں کا دُوسرے مُلکوں کی چیزوں سے مقابلہ کیا ہے اور اپنے وطن کی فوقیت ظاہر کی ہے۔ مثنوی عشقیہ جسے (دیول رانی خضر خان بھی کہتے ہیں) میں انھوں نے ایک باب سیرِ باغ کا رکھا ہے۔ اس میں چمپا، کیوڑہ، مولسری، کرنہ، جوہی اور دوسرے پھولوں کی تعریف کرکے لکھا ہے کہ اگر ہمارے پھول روم یا شام میں اُگتے اور ان کے عربی فارسی نام ہوتے تو اہلِ خطہ ان کی تعریف میں آسمان سر پر اُٹھا لیتے ؎

---

[1] اپنے نانا کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ سیاہ رنگت کے تھے ؎

زنسلِ عارضِ اسود منم آں نسخت معنیٰ　　　　کز اصلِ خورشیتن یک یک نشانے باز دادم من

وہ پان کے بہت شائق تھے۔ چالیس پچاس نوکر ان کے ہاں پان بنانے اور پان کھلانے پر مامور تھے۔ امورِ ملکی میں ان کا طریقہ صلح پسندی کا تھا۔ اور وہ اس قدر کامیاب سیاستدان تھے کہ وہ ہر ہندو راجا (رائے) کو الٹ کر حکومت کا وفادار ساتھی (یار) بنا سکتے تھے۔ ان کے پاس دو ڈھائی سو ترک اور دو ہزار ہندوستانی غلام تھے۔ امیر خسرو کو ان پر بڑا ناز تھا ؎

خساں رائے کنم غرق و گہر را امیدہم جبرو　　　　اناں ابرِ سیاہ جی ظرفہ دریائے کہ زادم من

چہ بینی ارغوان و لالہ خنداں ‏ ‏ ‏ کہ رنگے ہست و بوئے نیست چنداں
گُلِ ما را بہ ہندی نام زشت است ‏ ‏ ‏ وگرنہ ہر گلے باغِ بہشت است
گر ایں گل خاستے در روم یا شام ‏ ‏ ‏ ق ‏ ‏ ‏ کہ بودے پارسی یا تازیش نام
شدے معلوم تا مرغانِ آں بوم ‏ ‏ ‏ چساں غلغل زدے در ترکے و در روم
کدامی گل چنیں باشد کہ سالے ‏ ‏ ‏ دہد بو دور ماندہ از نہالے

پھر گریز کر کے لکھا ہے کہ یہی کیفیت ہندوستانی حسینوں کی ہے اور ان کا دنیا کے مشہور حسن خیز خطوں سے مقابلہ کر کے حسینانِ ہند کو خوبانِ عالم پر ترجیح دی ہے ؎

بتانِ ہند را نسبت ہمیں است ‏ ‏ ‏ بہر یک مُہرے شاں صد ملکِ چین است
چہ گیری نام از یغما و خلخ ‏ ‏ ‏ کہ غالب تیز چشم اند و ترش رخ
چہ یاد آری سپید و سرخ در رُوے ‏ ‏ ‏ چو گلہاے خراساں رنگ بے بوے
وگر پرسی خبر از روم و از روس ‏ ‏ ‏ از ایشاں نیز آید لابہ و بوس
سپید و سرخ ہمچوں کندۂ یخ ‏ ‏ ‏ کز ایشاں زم خوردہ کافور دو زرخ
خطاے تنگ چشم و پست بینی ‏ ‏ ‏ مغل را چشم و بینی خود نہ بینی
لبِ تاتار خود خنداں نباشد ‏ ‏ ‏ ختن را خود نمک چنداں نباشد
سمرقندی و آنچہ از قندھار اند ‏ ‏ ‏ بجز نامے ز شیرینی ندارند
بمصر و روم ہم زیمیں خدانند ‏ ‏ ‏ ولے چُستی و چالاکی ندانند

مثنوی نہ سپہر میں امیر خسرو نے تقریباً چار سو ابیات کا مستقل باب ہندوستان (یعنی برصغیر ہند و پاکستان) اور یہاں کے رہنے والوں کے فضائل میں قلمبند کیا ہے جس سے امیر کی حب الوطنی اور ہندوؤں کے علوم و فنون سے پوری واقفیت کا پتا چلتا ہے۔ ہندوستان کے فضائل مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت دیے گئے ہیں:۔

(۱) اثباتِ ملکِ ہند کہ جنت بہ جنت است ‏ ‏ ‏ حجت ہمہ بہ قاعدۂ عقل استوار

(۲) ترجیحِ ملکِ ہند بعقل ازہوائے خوش — بر رُوم و بر عراق و خراسان برقبار
(۳) ترجیحِ اہلِ ہند بر اہلِ عجم ہمہ — در زیرکی و دانش و دلہائے ہوشیار[۵]
(۴) اثباتِ گفتِ ہند بحجت کہ راجح است — بر پارسی و تُرکی از الفاظِ خوشگوار

ہندوؤں کی علمی فضیلت پر دس دلیلیں قائم کی ہیں[۲]۔ مثلاً :-

(۱) یہاں تمام دُنیا سے زیادہ علم نے وسعت حاصل کی۔
(۲) ہندوستان کے آدمی دُنیا کی تمام زبانیں حاصل کر سکتے ہیں لیکن اور کسی ملک کا آدمی ہندی زبان نہیں بول سکتا۔
(۳) ہندوستان میں دُنیا کے ہر حصہ کے لوگ علم کی تحصیل کے واسطے آتے،

---

[۱] عرب فلسفی جاحظ اور قدیم عرب سیاحوں نے ہندوستان کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے لیے ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی کی کتاب "عرب اور ہند کے تعلقات" امیر خسرو تو خیر ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند ہیں۔ انھیں ضرور اپنا وطن عزیز ہوگا، لیکن کبھی کبھی اس ملک کے متعلق ایرانی اہلِ قلم جس طرح حقارت کا اظہار کرتے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ عبرت خیز بیان شیخ علی حزیں کا ہے۔ جنھوں نے اپنے تذکرہ میں ایک مفصل باب ہند اور اہلِ ہند کی مذمت میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے بالتفصیل بیان کیا ہے کہ ہندوستان کی خاک ہی بُزدلی اور تن آسانی کے خمیر سے تیار ہوتی ہے اور قدیم شاعر اسدی کا بیان نقل کیا ہے کہ جب ایرانی بادشاہ ہندوستان کا کوئی علاقہ فتح کرتے تھے تو فوراً اس کی حکومت کسی دوسرے کے سپرد کر کے چلے آتے تاکہ وہ کہیں اس کے مضر اثرات کا شکار نہ ہو جائیں۔ ضحاک اپنے سپہ سالار گرشاسپ سے کہتا ہے کہ خبردار! ہندوستان فتح کر کے وہاں قیام نہ کرنا ؎

نہ مانی دراں بوم سالے تمام — کہ لشکر گراں گیرد از ننگ و نام
گرت بگذرد چار موسم دراں — ز فرہنگ و مردی نیابی نشاں!

[۲] ملاحظہ ہو حیاتِ خسرو مؤلفہ سعید مارہروی ص ۱۱۴ - ۱۱۵

لیکن کوئی ہندو تحصیل علم کے واسطے باہر نہیں گیا۔ ابومعشر ہندوستان میں تحصیل علم کے واسطے آیا اور دس برس تک بنارس میں پڑھتا رہا۔

(۴) علم حساب میں صفر ہندوستان کا تحفہ ہے کہ اسے آسا برہمن نے ایجاد کیا۔

(۵) کلیلہ و دمنہ جس کا ترجمہ فارسی، ترکی، عربی اور دری میں ہوا، ہندوستان کی تصنیف ہے۔

(۶) شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے وغیرہ وغیرہ۔

دسویں دلیل ہے ؎

حجت دہ آنکہ چوں خسرو بہ سخن
سحر گرے نیست بہ چرخ کہن!

واقعہ یہ ہے کہ فارسی شعر گوئی کا وہ ننھا سا پودا، جسے ریزہ، شہاب، مہمرہ اور عمید نے سینچا تھا، خسرو کی شاعری میں ایک تن آور درخت کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جو مرتبہ علاء الدین خلجی کا سیاسی تاریخ اور حضرت سلطان المشائخ کا روحانی تاریخ میں تھا، وہی خسرو کا شعر و سخن میں تھا۔ اور خسرو کو اس پر بجا ناز تھا۔ جس ماحول میں ایسی تین ہستیاں پرورش پاسکیں اس کا درجہ افغانستان اور ایران سے کم نہیں ہوسکتا۔ اور امیر خسرو نے طریقے طریقے سے اس پر فخر کیا ہے۔ انھوں نے مثنوی عشقیہ یا خضر خاں دیول رانی میں ایک باب ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر لکھا ہے جس میں سلاطین اسلام کا سلسلہ سلطان معز الدین سام سے سلطان علاء الدین خلجی تک ملایا ہے۔ اس باب میں شروع میں اپنے زمانے کی مذہبی حالت پر تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہندوستان میں شریعت کو کمال عزت حاصل ہے۔ علمائے باعمل کی وجہ سے دہلی بخارا کے ہم پہلو ہے اور غزنی سے لے کر ساحل سمندر تک اسلام یکساں روشنی کے ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ نہ یہاں عیسائی ہیں نہ یہودی نہ آتش پرست اور نہ ہی خارجیوں، معتزلوں اور رافضیوں کا پتا چلتا ہے بلکہ ہر طرف حنفی اور اہل سنت آباد ہیں۔

خوشا ہندوستان و رونقِ دیں — شریعت را کمالِ عز و تمکیں

ز علم باعمل دہلی بخارا — ز شاہاں گشتہ اسلام آشکارا

ز غزنیں تا لبِ دریا دریں باب — ہمہ اسلام بینی بہ یکے آب

نہ زاں زہ دیدہ زاغانِ گرہ گیر — ہمہ در کیشِ احمد راست چوں تیر

نہ ترسائے کہ از ناترس گاری — نہد بر بندہ داغِ کردگاری

نہ از جنسِ جہوداں جنگ و جوریت — کہ از قرآں کند دعوئے بہ توریت

نہ مغ کز طاعتِ آتش شود شاد — وزو با صد زباں آتش بفریاد

مسلمانانِ نعمانی روش خاص — ز دل ہر چار آئیں را باخلاص

نہ کیں با شافعی نے مہر با زید — جماعت را و سنت را بجاں صید

نہ زاہلِ اعتزالے کز فنِ شوم — ز دیدارِ خدا گردند محروم

نہ رفضی تا رسد زاں مذہبِ بد — جفائے بر وفادارانِ احمد

نہ آں سگ خارجی کز کینہ سازی — کند با شیرِ حق روباہ بازی

زہے خاکِ مسلماں خیز دیں جوئے
کہ ماہی نیز سنی خیزد از جوئے

اشاعتِ اسلام

اشاعتِ اسلام

ہم اسلامی ہند و پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ضمن میں کہہ چکے ہیں کہ فتح سندھ و ملتان کے بعد مسلمانوں کی رفتارِ ترقی بہت سست پڑ گئی۔ اور ملتان سے دہلی پہنچنے میں انھیں کوئی پونے پانسو سال لگے۔ یہی سست رفتاری اشاعتِ مذہب میں بھی نظر آتی ہے۔ بلکہ چونکہ سندھ اور ملتان میں قرامطہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس لیے وہاں جو تھوڑی بہت اشاعتِ اسلام ہو رہی تھی، اس کا بھی رُخ بدل گیا۔ آج سندھ اور ملتان کی ابتدائی تاریخ پر تاریکی کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ اور جب تک اسمٰعیلی ماخذ سے اس زمانے کی مذہبی تاریخ پر روشنی نہ پڑے۔ صحیح حالات کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ غالباً سندھ میں توسیعِ اسلام ابتدائی دَور کا نہیں بلکہ بعد کا واقعہ ہے اور اگرچہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں روابط و تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے زمین تیار ہو گئی تھی بلشتر علاقے میں تخم ریزی بعد میں ہوئی۔

لاہور قرمطیوں کے دائرۂ اثر سے باہر رہا۔ اس لیے اس شہر کی مذہبی تاریخ سے ہم بے خبر نہیں۔ اسے کئی قابلِ ذکر ہستیوں نے اپنے قیام سے شرف بخشا لیکن بہ حیثیتِ مجموعی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فتح سندھ سے حضرت خواجہ اجمیریؒ کی آمد تک اشاعتِ اسلام کی رفتار اس سرزمین میں بڑی سست رہی مگر اس کے بعد یکایک اس طرح مستعدی اور جوش و خروش کا ظہور ہوا کہ پچھلی سست رفتاری کی بہت جلد تلافی ہو گئی۔

اشاعتِ اسلام کے خاص اسباب

اس انقلاب کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو دہلی میں حکومتِ اسلامی کا

قیام اور اس کی توسیع تھی۔ اس سے مسلمان صوفیوں اور مبلغوں کو مُلک کے دُوسرے حصّوں میں بے کھٹکے جانے کا موقع ملا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وجہ تاتاریوں کا حملہ تھا، جس نے اسلامی دُنیا کا نظامِ زندگی درہم برہم کر دیا اور جوق در جوق علما و مشائخ اسلامی ممالک سے جان بچا کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ جیسا کہ سر ایڈورڈ میکلیگن نے ضلع ملتان کے گزیٹیر میں بتایا ہے، اس زمانے کے تمام مشائخ کبار ان علاقوں سے آئے، جہاں تاتاریوں نے ان کے لیے زندگی دوبھر کر دی تھی۔ اور اگرچہ منگولوں کے حملے سے باہر کے ممالک اسلامی کو بے انتہا نقصان پہنچا، لیکن خطۂ پاک و ہند کو فائدہ رہا اور ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلام کو بڑی رونق و ترقی ہوئی۔

مشائخ کبار کی آمد کے علاوہ ہم ویسے بھی اس زمانے میں ایک نئی مذہبی زندگی کے آثار دیکھتے ہیں۔ اسلامی تاریخوں میں مغل سفاکیوں اور مظالم کا حال پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سمجھتے تھے کہ گویا یاجوج ماجوج آ گئے۔ اور ہمیں اپنی مقدس ترین چیزوں کو ان سے محفوظ کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر مسلمان جہاں کہیں وہ تھا، خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا اور اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے ایسی شاندار کوششیں ہوئیں جن کی مثال پانچ سو سال پہلے قرنِ اولیٰ میں ہی نظر آتی ہے۔ یہ مساعی جمیلہ درگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئیں اور نہ صرف تاتاری حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے بلکہ مذہبی جوش کا سیلِ گراں اسلام کو ان علاقوں میں لے گیا، جہاں ابھی تک اس مذہب کا نام بھی نہ پہنچا تھا۔

صُوفیائے کرام کا طریقِ کار

پاکستان و ہند میں اسلام زیادہ تر صُوفیائے کرام نے پھیلایا، لیکن ان کا مطمحِ نظر اور طریقِ کار دَورِ حاضر کے مشنریوں اور مبلغوں سے بالکل مختلف تھا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو فقط غیر مُسلموں میں اشاعتِ اسلام کے لیے وقف نہ کر رکھا تھا بلکہ تبدیلِ مذہب تو (سوائے بعض اسمٰعیلیوں اور سہروردیوں کے) شاید ان کا مقصدِ اوّلین ہی نہ تھا۔

ان کے دروازے ہر ایک کے لیے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب کھلے تھے۔ اور ان کا کام ہر ایک میں بلا کسی تفریق کے "ارشاد و ہدایت" تھا۔ ایک ہندو کے قبولِ اسلام سے انھیں جتنی خوشی تھی شاید اس سے زیادہ ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی۔ صوفیہ کے اس جامع نقطۂ نظر کو سلسلۃ الذہب کے مصنف[1] نے ایک مشہور سہروردی بزرگ (شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) کا ذکر کرتے ہوئے خوب واضح کیا ہے اور ان کی نسبت لکھا ہے (ترجمہ)

لوگوں کی ارشاد و ہدایت میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے عبادت کی طرف، نفسانیت سے روحانیت کی طرف، ان کا بڑا مرتبہ تھا۔

مشائخ کبار کے سامنے یہی مطمحِ نظر تھا جو سلسلۃ الذہب کے بیان کے مطابق شیخ بہاء الدینؒ کا تھا۔ وہ ہر ایک کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے اور اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار اسلام کی طرف راغب ہوتے اور عام مسلمان ایک پاک اور بے عیب زندگی کی طرف!

خانوادۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادیؒ نے بھی اپنے مکتوبات میں اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ "دراں کوشید کہ صورتِ اسلام وسیع گردد و ذاکرین کثیر"۔

ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں:۔

"بہر حال در اعلائے کلمۃ الحق کوشید و از مشرق یا مغرب ہمہ اسلام حقیقی بر کنید"۔

یعنی صوفیہ کا مطمحِ نظر اسلام کی اشاعت نہیں، بلکہ اسلام حقیقی کی توسیع تھا۔ جس کی ضرورت فقط غیر مسلموں کو نہیں بلکہ بہت سے مسلمانوں کو بھی ہے۔ شاہ کلیم اللہ کے مکتوبات میں "اسلام حقیقی" کی تشریح کئی جگہ ہے:۔

---

[1] ملاحظہ ہو اخبار الاخیار (ص ۲۷)

(۱) "دراں باید کوشید کہ اکثر اہلِ دول از دنیاے دوں دل کندہ میل بطرف عقبیٰ پیدا کنند"۔

(۲) قصد کنید کہ مخلصانِ شما از سیرِ دُنیا پرستی برخیزند"۔

اسلامِ حقیقی کی توسیع کی یہی خواہش تھی جس کی بنا پر حضرت سلطان المشائخؒ نے ایک دو دفعہ ہندوؤں کے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کے حق مسلمانی کو پُورا نہ کرنے اور انسانیت کی معراج پر نہ پہنچنے پر رنج وغم کے آنسو بہائے۔ [فوائد الفواد ص ۱۸۴]

شیخ ابو اسحاق گازرونی کے حالات میں لکھا ہے: "نقل است کہ بست وچہار ہزار کس بر دستِ شیخ مسلمان شدند۔ وقریب صد ہزار اہلِ اسلام پیش شیخ تائب گشتہ در حلقۂ ارادت شیخ آمدہ بودند (خزینۃ الاصفیا) صُوفیاے کبار کے کام کے تناسب اور طریقِ کار کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے!!

ہندوستان میں مسلمان صُوفیہ کا واحد یا اہم ترین مقصد اسلام کی اشاعت نہ تھا، لیکن انھیں اس کام میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اس کی وجہ ہندوستان کے خاص حالات تھے۔ ہندو مذہب ایک مشنری مذہب نہیں۔ آریہ سماج کے آغاز سے پہلے ہندوؤں کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر قوموں میں اپنا مذہب پھیلائیں بلکہ سچے مذہب کی نسبت تو ان کا نقطۂ نظر تھا کہ یہ صرف خواص کا "حق" ہے۔ ہر کہ ومہ اس کا مستحق نہیں۔ اور جو شخص اس سے محروم رہتا ہے، اس میں اس کی اپنی تباہی ہے۔ مذہب کا کوئی نقصان نہیں۔ یہی اسلوبِ خیال تھا جس کی بنا پر منو نے شودروں اور نیچ ذات کے لوگوں کو اعلیٰ مذہبی واقفیت حاصل کرنے اور مذہبی عبادتگاہوں میں داخل ہونے سے منع کر دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر کوئی شودر مقدس وید کے منتر سُن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کے ہوتے ہوئے اشاعتِ اسلام میں کامیابی حاصل کرنا، بالخصوص

ان لوگوں میں دین حق پھیلانا جو کسی بھی دین و مذہب کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے۔ چنداں دشوار نہ تھا!

اگر صوفیہ کا مطمحِ نظر عہد حاضر کے مبلغوں سے مختلف تھا تو ان کا طریق کار بھی اس زمانے کے عیسائی مشنریوں کی عین ضد تھا۔ انھوں نے کبھی یہ نہ کیا کہ دوسرے مذہبوں اور ان کے بانیوں کی بدگوئی کر کے اپنے مذہب کی فضیلت ثابت کریں۔ دوسرے مذہبوں کی طرف ان کا طرزِ عمل انتہائی رواداری اور صلح پسندی کا تھا۔ ہاں، ان مذہبوں میں سے جو شخص ان کی اپنی کرامات یا پاک زندگی دیکھ کر ان کے اور ان کے مذہب کے قائل ہو جاتے۔ انھیں اپنے دامن کے نیچے جگہ دینے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتے۔ شیخ کلیم اللہ دہلوی کے مکتوبات میں صوفی طریق کار کی ایک اور جگہ وضاحت ہوتی ہے۔ اپنے خلیفۂ اعظم شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"صلح با ہندو و مسلمان سازند۔ ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشند ذکر و فکر و مراقبہ و تعلیم او را بگویند کہ ذکر بہ خاصیتِ خود او را بہ ربقۂ اسلام خواہد کشید۔ و باغیر معتقد اگرچہ سیّد زادہ باشد تعلیم نہ باید کرد" (ص ۸۶)

شیخ کلیم اللہؒ کا طریق صلح کل کا تھا، لیکن وہ اسلام کی توسیع سے بے پروا نہ تھے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"و دیگر مرقوم بود۔ بھیادیا رام و ہندوہائے دیگر بسیارے در ربقۂ اسلام درآمدہ اند۔ اما باہ رسم قبیلہ پوشیدہ مے مانند۔ برادرِ من! اہتمام نمایند، کہ آہستہ آہستہ ایں امرِ جلیل از بطون بہ اظہار انجامد" (ص ۳۰)

صوفیہ کے صلح کل طریقوں اور ہندوؤں کے مذہب کے متعلق خاص نقطہ نظر کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیہ کی اشاعتِ اسلام کی کوششوں کی کوئی خاص مخالفت نہ ہوئی بلکہ ہندوؤں نے ان صوفیوں کو بھی جنھوں نے اشاعتِ اسلام میں نام پیدا کیا، نگاہِ احترام سے دیکھا۔ مثلاً ولی الہند حضرت خواجہ معین الدین اجمیری

تو جو مبلغینِ اسلام میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے ۔ اور قدیم ترین تذکرے گواہ ہیں کہ اجمیر میں ان کے آنے سے رُوحانی طور پر اسلام کا بول بالا ہُوا ۔ لیکن ان کی نسبت ہندوؤں کا جو نقطۂ نظر تھا اس کی بابت سفینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ کا بیان ملاحظہ ہو ۔

"جمعے کثیرے از کفار بہ برکت قدوم ایشاں مسلمان شدند و جماعہ کہ مسلمان نہ شدہ بودہ ۔ فتوح دینار بخدمت ایشاں مے فرستادند و ہنوز کفارے کہ دراں نواحی اند بہ زیارت ایشاں مے آیند و مبلغ ہا بہ مجاوران روضہ منوّرہ میگزرانند"

(سفینۃ الاولیا ص ۹۳)

حال کے ایک ہندو رہنما رائے بہادر ہربلاس شاردا ابھی جو شاردا ایکٹ کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں، اجمیر کے متعلق اپنی انگریزی کتاب میں حضرت خواجہ بزرگ رح کو اس طرح خراجِ عقیدت ادا کرتے ہیں (ترجمہ)

"خواجہ معین الدین نے پرہیزگاروں کی زندگی گزاری ..... انھوں نے زیادتی کرنے کی کبھی تلقین نہیں کی ۔ اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطۂ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا ۔" (ص ۸۵)

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے ضمن میں ایک اہم نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں اسلام ان علاقوں میں سرعت سے پھیلا جہاں ابھی ہندو مذہب نے بدھ مت کو پوری طرح دبا نہ لیا تھا ۔ اور ذات پات کا معاشرتی نظام عوام کی زندگی پر پوری طرح حاوی نہ ہُوا تھا ۔ جب مسلمان سندھ میں آئے تو رعایا کا ایک بڑا حصّہ بودھ مذہب کا پیرو تھا اور وہ لوگ برہمن راجا سے سخت آزردہ تھے ۔ اسی طرح بنگال کی نسبت سپرنٹنڈنٹ محکمۂ مردم شماری لکھتا ہے (سنہ ۱۹۱۱ء) کہ اسلام کی آمد کے وقت اس علاقے میں ابھی ہندو مذہب نے دوبارہ فروغ حاصل نہ کیا تھا ۔ اور بودھ مذہب کی ایک بگڑی ہوئی صورت یہاں رائج تھی ۔ ایسی حالت میں اسلام کے لیے

پاؤں جمانا آسان تھا۔ کیونکہ خواہ رُوحانی طور پر تبدیلیٔ مذہب کی نسبت ہندوؤں کا جو بھی نقطۂ نظر ہو، لیکن ان کا معاشرتی نظام بڑا سخت تھا۔ اور ایک فرد کے لیے مذہب چھوڑ کر برادری کی مخالفت جھیلنا بڑا تکلیف دہ تھا۔ سید گیسو دراز کے ملفوظات اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ اسلامی مبلغین کی راہ میں بڑی روکاوٹ روحانی نہ تھی بلکہ ذات پات کا نظام اور جن علاقوں میں یہ نظام ابھی مستحکم نہ ہُوا تھا (یعنی سندھ، مغربی پنجاب اور بنگال) وہاں اشاعتِ اسلام کا کام آسانی سے سرانجام پاگیا۔

اشاعتِ اسلام کے علاوہ بزرگانِ کرام نے عام مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لیے جو کارہائے نمایاں کیے انھیں بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آج لوگ ان کے کام کا اندازہ ان کے جانشینوں کو دیکھ کر کرتے ہیں، جنھوں نے ان کی یادگاروں کو تجارت کا سرمایہ بنا رکھا ہے۔ یا مزاروں پر ان زائرین کا ہجوم دیکھتے ہیں، جن کی ایک ایک حرکت سے توہم پرستی اور جہالت ٹپکتی ہے۔ اور جن کے نزدیک شخصی صفائی تو شاید ایک عیب ہے۔ لیکن بندگانِ عظام کا اندازہ ان لوگوں سے کرنا بے انصافی ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ان بزرگوں کے صحیح اور مستند حالات پڑھیں۔ اور ان کے اقوال و افعال پر غور کریں۔ آج ہمارے لیے اس پاکیزہ رُوحانی فضا میں پہنچنا جو حضرت خواجہ اجمیریؒ، شیخ کبیر بابا فریدؒ، سلطان المشائخؒ، حضرت چراغ دہلیؒ، نور قطب العالم، خواجہ باقی باللہؒ، کے گرد و پیش تھی، ناممکن ہے۔ لیکن اگر آج بھی ہم جاہل کرامت فروشوں کے قصے کہانیوں کو نظر انداز کر دیں اور مستند اور صحیح معاصرانہ ملفوظات اور تذکروں کو دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ کیسی کیسی پاک ہستیاں تھیں۔ اور ان سے مسلمانوں کو کیا کیا فیض پہنچ رہا تھا۔ آج بھی اگر فوائد الفواد، سیر الاولیا، زبدۃ المقامات کا مطالعہ کریں۔ ان کا موازنہ کلامی تصانیف سے ہی نہیں، مسائل شریعت کی کتابوں سے بھی کریں تو پھر صاف نظر آجاتا ہے کہ اسلام حقیقی کہاں ملے اور

تصوف کے انحطاط کے ساتھ قوم میں ایک اخلاقی اور روحانی زوال کیوں آ گیا!!

سُلطان الہند حضرت خواجہ مُعین الدین اجمیری قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت داتا گنج بخش رح کا پاکستان و ہند کے اولیائے کبار میں خاص مرتبہ ہے۔ ایک تو انھیں اوّلیت کا شرف حاصل ہے، دوسرے ان کی تصانیف کو آج بھی اہلِ علم آنکھوں پر رکھتے ہیں، لیکن خدا کی دین ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود اس سرزمین کے اولیائے عظام میں انھیں وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رح کا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت گنج بخش کی حیثیت ایک لالۂ تنہا کی ہے جس کی رنگینی اور دلآویزی میں کلام نہیں، لیکن جس سے سارا چمن نہیں مہک اُٹھتا۔ برخلاف اس کے حضرت خواجہ اجمیری رح نے جو بیج بویا وہ اس طرح پھلا پھولا کہ تمام مُلک میں اس کی شاخیں پھیل گئیں اور چشتیہ سلسلہ

لہ پیر کبار شیخ دتو شوریانی خوشگی — مغربی پاکستان میں چشتیہ سلسلہ حضرت خواجہ بزرگ سے پہلے پہنچ چکا تھا لیکن افغان علاقہ سے باہر اس کی اشاعت نہ ہوئی۔ اس اشاعت کا شرف پیر کبار شیخ دتو کو حاصل ہُوا۔ جن کے حالات معارج الولایت اور دوسرے کمیاب تذکروں کے حوالے سے خزینۃ الاصفیا میں درج ہیں۔ (جلد اوّل ص ۴۵۳) آپ افغان قوم سے تھے۔ شروع سے مُرشدِ کامل کی تلاش تھی۔ کئی بزرگوں کی خدمت میں پہنچے۔ لیکن تشفی نہ ہوئی۔ پھرتے پھراتے چشت میں مشہور بزرگ خواجہ مودود چشتی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے چالیس

سے وہ ابتدائی چشتی بزرگوں میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ صاحب تصانیف تھے۔ مریدوں کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے۔ ان کے مرید خواجہ حاجی شریف زندنی حضرت خواجہ اجمیری رح کے پیر خواجہ عثمان ہارونی کے مرشد تھے۔ خواجہ مودود چشتی رح نے ۵۳۳ھ کو وفات پائی۔

اور اس کی مختلف شاخوں مثلاً نظامیہ، صابریہ کے نام لیوا سارے پاکستان و ہند میں کثرت سے موجود ہیں۔

سال تک ان کی خدمت کی۔ اور بے انتہا فیض حاصل کیا۔ وفات کے وقت مرشد نے انھیں خرقۂ خاص عنایت کیا اور وطن کی طرف رخصت کیا۔ لیکن مرشد سے عقیدت کی وجہ سے وہ ان کی وفات کے بعد بھی مرشد کے مزار پر ہی استقامت پذیر رہے تھے کہ مرشد نے خواب میں تاکید کی کہ اپنے وطن کو روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے وطن واپس آئے۔ سالِ وفات ۵۵۸ھ (۱۱۵۵ء) ہے۔

صوفیہ کے تذکروں میں لکھا ہے کہ جب شیخ کوہستان پشاور میں پہنچے تو افغانوں نے ان سے ولایت کا ثبوت مانگا اور کہا کہ اگر اس وقت دو کبوتر غیب سے پیدا ہوں، جو آپ کے گریبان سے داخل ہو کر آستینوں سے نکل جائیں تو ہم آپ کے قائل ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کرامت کے بعد آپ کا بڑا شہرہ ہوا۔ بالخصوص خوشگی افغان تو بالکل آپ کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ اُس وقت سے آپ نے حکم دیا کہ میرے مریدوں میں سے کبوتروں کو کوئی ذبح نہ کرے ؎

چوں زد از تو خوارقِ عادات	خواستہ قوم بہرِ مکشوفات
دو کبوتر موافقِ گفتار	ز آستین دو شیخ شد طیار
قوم را گفت شیخ بعد ازاں	چونکہ شد بر ولایتش برہاں
جنس ایں طیر را ضرر نہ رسید	گر مریدانِ خاص دا آں منید

پیرِ کبار سے بے شمار خلقت نے راہِ ہدایت پائی۔ ان کے کامل ترین مریدوں میں سے شیخ تبک تھے، جو بقول بعضے پیرِ کبار کے برادر زادہ اور بقولِ دیگراں خواجہ مودود چشتیؒ کے پوتے تھے۔ ان کے حق میں پیرِ کبار نے دُعا فرمائی کہ قیامت تک ان کی اولاد اور مرید اربابِ معرفت سے خالی نہ رہیں۔ قصور کے افغان خوشگی مشائخ جنھوں نے عہدِ مغلیہ میں بڑا نام پایا، اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم ان کا ذکر رودِ کوثر میں کریں گے۔ مخزنِ افغانی میں لکھا ہے کہ پیرِ کبار کا ایک بیٹا تھا، شیخ چون نام۔ ان کی اولاد میں بھی طریقہ معرفت و خدا جوئی متداول ہے۔ انھیں چون زئی کہتے ہیں۔

[باقی اگلے صفحے پر]

فوائد الفواد میں، جو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کے ملفوظات کا مستند مجموعہ اور ابتدائی چشتیہ تاریخ (بلکہ فی الحقیقت اسلامی ہندوستان و پاکستان کی ابتدائی روحانی اور ادبی تاریخ) کا اصل سرچشمہ ہے۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ کا بہت تھوڑا ذکر ہے۔ سیر الاولیا میں بھی جسے امیر خورد نے مختلف کتب اور زبانی روایات کی بنا پر ترتیب دیا۔ آپ کے حالاتِ زندگی بہت تھوڑے ہیں۔ آپکے واقعاتِ زندگی[۱] تفصیل کے ساتھ پہلی مرتبہ صوفیہ کے تذکرہ سیر العارفین میں درج ہوئے۔ جسے سکندر لودھی کے استاد شیخ جمالیؒ نے حضرت خواجہ اجمیریؒ کی وفات کے کوئی تین سو سال بعد ترتیب دیا۔ جمالی کو اکثر حالات بلادِ عجم کے سفر میں دستیاب ہوئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو حالات اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد سنے گئے ہوں، ان پر پوری طرح بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ جمالی کے

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۱۹۷)

شیخ ثابت بریحؒ مخزنِ افغانی میں خواجہ مودود چشتیؒ کے دو افغان مریدوں شیخ ثابت بریح اور شیخ الیاس بریح کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لیکن صوفیہ کے متداول تذکروں میں ہمیں یہ نام نہیں ملے۔ مخزن کے بیان کے مطابق دونوں صاحبِ کرامات بزرگ ہوئے۔ لیکن شیخ ثابت بریح کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ان کی قوم (بریح) پہلے بلوٹ میں رہتی تھی۔ وہ اسے حفاظت کی خاطر قندھار کے پاس شراوک میں لے گئے۔ جہاں یہ قوم اب مقیم ہے۔ اور ان کی بدولت یہ مقام دشمن کی فوج سے محفوظ رہا۔ شیخ ثابت کی قبر کوہ اودل ترین پر ہے۔

مخزن میں شیخ کی بدولت شراوک کا "افواجِ بادشاہ قزلباش از قندھار" اور "فوجِ مغلان" سے محفوظ رہنے کا ذکر ہے، جن کا وجود خواجہ مودود چشتیؒ کے زمانے میں ثابت نہیں۔ شاید بریح قوم کی ایک قدیمی روایت بعد کے حالات سے خلط ملط ہو گئی ہو!

[۱] شاید سرور الصدور ملفوظات و مکتوبات قاضی حمید الدین ناگوری خلیفہ حضرت (اجمیری) سے آپ کے واقعاتِ زندگی پر زیادہ روشنی پڑے!

بیان کے مطابق آپ سجستان میں پیدا ہوئے، لیکن آپ کی تعلیم و تربیت خراسان میں ہوئی۔ ابھی پندرہ سال کے تھے کہ یتیم ہو گئے۔ ان کے والد نے ایک باغ اور ایک پن چکی ورثہ میں چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے آپ بسر اوقات کرتے تھے۔ ایک روز آپ اپنے باغ میں تشریف فرما تھے اور درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ایک قلندر شیخ ابراہیم قندوزی نام آپ کے باغ میں آیا۔ حضرت نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے اسے بٹھایا اور انگوروں کا خوشہ ماحضر کے طور پر سامنے رکھا۔ قلندر نے برغبت تمام یہ انگور کھائے اور حضرت خواجہ کی مہمان نوازی اور ذوق و شوق سے خوش ہو کر ایک کھانے کی چیز اپنی بغل سے نکال کر چبائی اور حضرت کو کھانے کو دی۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کے کھاتے ہی انوارِ الٰہی جلوہ گر ہوئے اور حضرت کا دل دُنیا سے متنفر ہو گیا۔ تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ فروخت کر کے مساکین میں تقسیم کی اور خود سمرقند کا رُخ کیا۔ حضرت خواجہ کی زندگی میں اس اہم تبدیلی کی وجہ شاید ایک اور بھی ہے۔ اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پیشتر تاتاریوں نے شہر پر حملہ کیا اور حضرت کے وطن مالوف پر اس طرح ظلم توڑے کہ حضرت کا دل اس دار الابتلا سے سرد ہو گیا اور دُنیا اور دُنیاداروں سے ایک طرح کا انقباض پیدا ہونے لگا۔

ترک وطن کے بعد ایک عرصے تک حضرت نے سمرقند میں تحصیل علم کی اور کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد عراق کا رُخ کیا۔ راستے میں قصبہ ہرون میں جو نیشاپور کے نواح میں ہے۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونی چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک عرصہ دراز ان کی خدمت میں رہے اور کمال مجاہدہ اور ریاضت کے بعد ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ خواجہ عثمان ہرونی کے بہت سے حالات کتبِ صوفیہ میں مذکور ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے ایک واقعہ سے جسے شیخ جمالی نے سیر العارفین

میں نقل کیا ہے[1]۔ خیال ہوتا ہے کہ انھیں اشاعتِ اسلام کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت معین الدین اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے اور عراق اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ میں پھر پھرا کر ہندوستان تشریف لائے تو خواجہ عثمان کا دل ان کی جُدائی میں بے قرار ہُوا اور وہ اپنے جلیل القدر مُرید کی ملاقات کے لیے ہندوستان کی طرف چلے۔ راستے میں ان کا گزر ایک ایسے مقام پر ہُوا، جہاں پارسیوں کا ایک بڑا آتشکدہ تھا۔ خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اس کے قریب قیام کیا اور اپنے خادم کو بھیجا کہ افطار کے واسطے آگ پر روٹی پکالائے۔ خادم گیا لیکن آتش پرستوں نے اسے آگ نہ دی۔ حضرت کو خود اُن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ جب آپ آتشکدہ کے پاس پہنچے تو وہاں ایک بوڑھا موبد مختار نام سات برس کا لڑکا آغوش میں لیے کھڑا تھا۔ حضرت کی اس سے گفت و شنید ہوئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ آگ ایک فانی چیز ہے ایک چلّو پانی سے معدُوم ہو جاتی ہے۔ اسے کیوں پُوجتے ہو اور خدائے برتر و تعالیٰ کو جو اس آگ کا خالق ہے، نہیں پُوجتے۔ اُس نے کہا کہ آگ ہمارے مذہب میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ اسے کیوں نہ پُوجیں۔ حضرت نے پھر کہا کہ تم اتنی مُدت سے اس آگ کی صدق دل سے پرستش کرتے ہو کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنا ہاتھ یا پاؤں اس آگ میں ڈالو اور وہ نہ جلائے۔ موبد نے کہا جلانا آگ کی خاصیت ہے جو اس میں ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا ؎

اگر صد سال گبر آتش فروزد　　چو یک دم اندروں افتد بسوزد

حضرت نے یہ سُن کر موبد کے فرزند کو اس کی آغوش سے لیا اور خود آیۂ کریمہ قُلنا یا نارُ کونی بردًا وسلامًا علیٰ ابراھیم پڑھ کر آگ میں داخل ہوئے۔ یہ دیکھ کر موبد اور اس کے ساتھی حیران و پریشان ہوئے۔ آگ کے گرد شور و فغاں کرتے تھے،

---

[1] یہ واقعہ حضرت چراغ دہلیؒ کی زبانی بھی بیان ہُوا ہے۔ ملاحظہ ہو سراج المجالس ترجمہ خیر المجالس ص ۳۶

لیکن اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک عرصے کے بعد حضرت خواجہ مع اس بچے کے صحیح وسلامت اس حالت میں آگ سے نکلے کہ ان کے کپڑوں پر ایک دھبا بھی نہ تھا۔ تمام آتش پرست یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اور حضرت کی کرامت دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ لڑکے کا نام ابراہیم رکھا گیا اور بوڑھے موبد کا شیخ عبداللہ[۱]۔

خواجہ عثمان ہرونی سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین نے ایک عرصے تک بلادِ اسلامیہ کی سیر وسیاحت کی اور اس دوران میں صدہا اولیاء اللہ سے ملاقات کی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ ستاون روز تک حضرت غوث الاعظمؒ کے ساتھ ایک حجرے میں مقیم رہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور سہروردی سلسلہ کے بانی شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی سے بھی آپ کا بہت ربط ضبط رہا۔ اسی طرح شیخ نجم الدین کبریٰؒ۔ شیخ ضیاء الدین۔ خواجہ اوحد الدین کرمانی۔ شیخ ابوسعید تبریزی (جو شیخ جلال الدین تبریزی کے پہلے پیر تھے) اور دیگر کئی بزرگوں سے آپ کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔

بلادِ اسلامی میں بھی آپ کو بڑا مرتبہ حاصل ہوا۔ چنانچہ سیر العارفین میں مولانا رومؒ کے خلیفہ شیخ حسام الدین چلپی کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے حضرت خواجہ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔

اصفہان میں آپ کی ملاقات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی جو ان دنوں مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ حضرت قطب الدینؒ حضرت خواجہ بزرگ کے

---

[۱] جمالی کا بیان ہے کہ شیخ عبداللہ اور شیخ ابراہیم کا عالیشان مقبرہ میں نے خود دیکھا ہے اور وہاں دو ہفتے قیام کیا ہے (سیر العارفین صفحہ ۹)

مرید ہوئے اور بعد میں جب حضرت خواجہ بزرگ نے اجمیر میں اقامت فرمائی تو خواجہ قطب الدین نے ان کے فیض کا سلسلہ دہلی میں جاری رکھا۔

بغداد، ہرات، تبریز، بلخ سے ہوتے ہوئے حضرت خواجہ غزنی کے راستے ہندوستان آئے اور پہلے لاہور پہنچے۔ مشہور ہے کہ یہاں آپ نے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔ لاہور سے (بقول بعض تذکرہ نگاران) آپ ملتان تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے طویل قیام کر کے ہندوستانی زبان میں مہارت تامہ حاصل کی۔ اس کے بعد آپ دہلی آئے اور تھوڑا عرصہ یہاں قیام کر کے اجمیر کا رُخ کیا جو ابتدا میں اجمیر و دہلی کے راجا کا دارالخلافہ اور دہلی سے بھی زیادہ اہم مقام تھا۔

(سیر الاولیا میں حضرت سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ جب خواجۂ بزرگ اجمیر تشریف لائے۔ اس وقت رائے پتھورا ہندوستان کا بادشاہ اجمیر میں رہتا تھا۔ جب آپ نے اجمیر میں سکونت اختیار کی تو رائے پتھورا اور اس کے معتمدوں کو ناگوار گزرا۔ شیخ کی عظمت و کرامت کو دیکھ کر دم نہ مار سکتے تھے۔ لیکن شیخ کے وابستگان میں سے ایک شخص رائے پتھورا کے پاس نوکر تھا اس کو ایذا پہنچانی شروع کی۔ اس نے شیخ کے پاس فریاد کی۔ شیخ نے رائے پتھورا کے پاس اس کی سفارش کی، لیکن پتھورا نے یہ سفارش قبول نہ کی بلکہ اُلٹا شیخ کی نسبت جلی کٹی باتیں کہیں۔ جب راجا کے یہ الفاظ حضرت تک پہنچے تو ان کی زبان سے نکلا: "ما پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم" ان ہی دنوں سلطان معز الدین غوری کا لشکر دوسری مرتبہ غزنی سے ہندوستان پہنچا۔ رائے پتھورا نے اس کا مقابلہ کیا اور زندہ گرفتار ہُوا۔

یہ روایت عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن طبقات ناصری کے ایک حوالے سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیر میں سلطان معز الدین غوری کی لشکر کشی سے پہلے نہیں بلکہ اس کے ساتھ تشریف لائے اور ترائن کی دوسری لڑائی کے زمانے میں سلطان محمد غوری کے لشکر کے ساتھ تھے۔ اس لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے

طبقاتِ ناصری کا مؤلف لکھتا ہے :۔

"ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد تولک بود۔ لقبِ او معین الدین بود۔ اومے گفت کہ من دراں لشکر باسلطان غازی بودم۔ عدد سوار لشکرِ اسلام دراں وقت صد و بست ہزار برگستوران بود۔"

بدایونی کی منتخب التواریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے :۔

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز کہ سرچشمہ اولیائے کبار و مشائخ عظام دیارِ ہند است۔ مزار متبرک وے در اجمیر واقع است۔ دریں نوبت باسلطان ہمراہ بود و ایں فتح بموجب راندن نفس مبارک رحمانی آں قطب ربانی رو نمودہ۔"

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جمالی جس نے سیر العارفین میں پہلی مرتبہ حضرت خواجہ کے حالات تفصیل سے بیان کیے۔ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ بالصراحت کہتا ہے کہ حضرتِ خواجہ دہلی ان دنوں تشریف لائے، جب سلطان محمد غوری یہ مقام فتح کر کے واپس جا رہا تھا۔ اور پھر دہلی میں چند ماہ قیام کر کے اجمیر کا رخ کیا۔

اجمیر میں حضرت خواجہ کی آمد کا جو اثر ہوا۔ اس کی نسبت سیر العارفین میں لکھا ہے :۔

"بیشترے کفار نامدار ازاں دیار بہ برکت آثار آں زبدۃ الابرار بہ تشریف ایمان مشرف شدند و بیشتر یکہ ایمان نیاوردند۔ نذر و فتوح بے حد و عد بحضرت ایشاں مے فرستادند کہ ہنوز آں کفار بداں نمط معتقد اند۔ ہر سالے مے آیند و سر بر خاکِ آن آستانہ عظیم القدر وآں بدرِ سپہر مشیخت مے نہند و مبلغ ہائے کلی بمجاوران روضہ مطہرہ ایشاں مے رسانند۔ و خدمتے بجائے مے آرند۔"[۳]

سیر الاولیا میں بھی آپ کی تبلیغی کامیابی کی نسبت لکھا ہے :۔

"دوسری کرامت یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں کفر و بت پرستی کا رواج تھا اور ہند کا ہر ایک سرکش "انا ربکم الاعلیٰ" کا دعوے کرتا تھا

اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتا تھا اور وہ سب پتھر، ڈھیلے، درخت، چوپایوں اور گائے اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کی تاریکی سے ان کے دلوں کے تالے اور بھی مضبوط ہو رہے تھے ؏

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ نہ ہرگز شنیدہ کس اللہ اکبر

جناب کے ہند میں تشریف لانے سے جو کہ اہلِ یقین کے آفتاب اور در حقیقت معین الدین تھے۔ اس ولایت کی تاریکیِ کفر نورِ اسلام سے روشن اور منور ہو گئی ؏

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسیا در دارِ کفر مسجد و محراب و منبر است
آں جا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است (۴۴)

اجمیر فتح کرنے کے بعد غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے اجمیر کی حکومت رائے پتھورا کے لڑکے کو خراج کے وعدے پر تفویض کی تھی۔ لیکن جب اس کے چچا نے اسے شکست دے کر اجمیر سے نکال دیا تو ایبک نے پھر اس شہر کو فتح کر کے یہاں ایک مسلمان گورنر مقرر کیا۔ سب سے پہلے گورنر سید حسین مشہدی خنگ سوار تھے۔ اب حضرت خواجہ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ آپ دلجمعی سے یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے اور جو کوئی آپ کے پاس اخذِ فیض یا روحانی راہنمائی کے لیے آتا اس کی آپ ہر طرح مدد کرتے۔ آپ کی وفات (۹۷) برس کی عمر میں ۶۳۳ھ (مارچ ۱۲۳۵ء) میں ہوئی۔ مزار شریف اجمیر میں ہے اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

ہندوستان آ کر آپ کا قیام بیشتر اجمیر میں رہا۔ دہلی میں چشتی سلسلہ کا کام آپ نے اپنے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو سونپ رکھا تھا۔ جنھوں نے یہ کام بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔ آپ کے مشہور مرید فقط دو ہوئے ہیں۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری (اگرچہ شیخ کبیر بابا فرید گنج شکر نے بھی ایک مرتبہ آپ سے براہِ راست فیض حاصل

کیا تھا[1]) لیکن عنایتِ الٰہی سے آپ کا سلسلہ اس طرح پھیلا کہ ہندوستان کے تمام سلسلوں پر یہ غالب آگیا۔ حضرت خواجہ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ دلیل العارفین کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ اس کی ترتیب حضرت خواجہ قطب الدین سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن یہ مجموعہ وضعی ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین نے اجمیر میں اپنا وقت نہایت خاموشی سے گزارا۔ صرف ایک مرتبہ آپ کے ایک سفرِ دہلی کا ذکر ملتا ہے۔ اور یہ سفر دلچسپی سے خالی نہ رہا۔ سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ الاسلام شیخ معین الدین اجمیری کے پاس اجمیر کے گرد و نواح میں ایک گاؤں بطورِ جاگیر حاصل تھا۔ مقامی حکام نے تقاضا کیا کہ اس کے لیے شاہی فرمان حاصل کیا جائے اور شیخؒ کے صاحبزادوں[2] نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ وہ دہلی جائیں اور بادشاہ سے فرمان لائیں۔ چنانچہ شیخ کو اِس ضرورت کی بناء پر اجمیر سے دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں وہ شیخ قطب الدین کے پاس ٹھہرے۔ شیخ قطب الدین نے کہا کہ آپ کو (بادشاہ کے پاس) جانے کی ضرورت نہیں۔ مَیں جاتا ہوں اور یہ فرمان لے آتا ہوں۔ چناں چہ وہ

---

[1] سیر الاولیا میں حضرت سلطان المشائخؒ کی زبانی لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت خواجہ اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور بابا فرید ایک ہی حجرے میں یکجا تھے۔ "شیخ معین الدین نے شیخ قطب الدین کو فرمایا کہ بختیار، اس جوان کو کب تک مجاہدے سے جلاؤ گے۔ اسے کچھ عنایت کرو۔ شیخ قطب الدین نے عرض کی کہ میری کیا مجال کہ آپ کے رُوبرو بخشوں۔ شیخ معین الدین نے فرمایا کہ یہ مرید آپ کا ہے۔ پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ آؤ دونوں مل کر بخشیں۔ چنانچہ دائیں طرف شیخ معین الدین کھڑے ہوئے اور بائیں طرف شیخ قطب الدین اور بیچ میں آپ۔ اور آپ کو دونوں صاحبوں نے جو بخشا، سو بخشا" (سیر الاولیا ص ۶۴-۶۵)

[2] ملاحظہ ہو سیر الاولیا (فارسی مطبوعہ ایڈیشن) ص ۵۳ "فرزندان شیخ را برآں آوردند کہ در شہر بر درواز بادشاہ مقرر داشت بیارد" اُردو ایڈیشن میں اس کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے اور اس سفر کو حضرت خواجہ کی اولاد "اس لیے ان کی اولاد میں سے ایک شخص اجمیر سے چل کر دہلی .... آیا" (ص ۵۰)

سلطان شمس الدین التمتش کے پاس گئے۔ بادشاہ انھیں دیکھ کر حیران ہُوا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ بادشاہ کے پاس کبھی نہ گئے تھے۔ بلکہ جب خود بادشاہ نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو انھوں نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ جس وقت ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے اسی مجلس میں فرمان مقرر داشت مع اشرفیوں کے ــــ توڑوں کے ان کے حوالے کیا۔ شیخ قطب الدین نے یہ چیزیں لاکر شیخ معین الدین کی خدمت میں پیش کیں اور شیخ معین الدین نے شیخ قطب الدین کی شہرت اور ان کے حق میں خلقت کا اعتقاد ملاحظہ کیا تو فرمایا کہ تم نے یہ کیا کر رکھا ہے۔ عزلت میں پوشیدہ رہنا بہتر ہے۔ شیخ قطب الدین نے عرض کیا کہ بندہ نے تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں کیا۔[ا]

سفرِ دہلی کے دوران میں ہی آپ کو شیخ قطب الدین اور شیخ نجم الدین صغرا کے اختلافات سے واقفیت ہوئی۔ سیر الاولیا میں سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیر سے دہلی آئے تو اس وقت شیخ نجم الدین صغرا دہلی میں شیخ الاسلام تھے۔ ان دونوں میں پرانی دوستی تھی۔ چنانچہ حضرت خواجہ ان سے ملنے گئے۔ شیخ نجم الدین اس وقت اپنے مکان کے صحن میں ایک چبوترہ بنوا رہے تھے۔ جب حضرت کو دیکھا تو تپاک سے آگے نہ بڑھے۔ اس پر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شاید شیخ الاسلامی نے تمھارے دماغ کو برہم کر رکھا ہے۔ نجم الدین نے کہا کہ مَیں تو وہی مخلص اور معتقد ہوں، لیکن آپ نے اس شہر میں ایک ایسا مرید چھوڑ رکھا ہے جو میری شیخ الاسلامی کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ حضرت خواجہ نے مسکرا کر فرمایا کہ تم فکر نہ کرو۔ مَیں بابا قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جاؤں گا۔ جب آپ مکان پر تشریف لائے تو خواجہ قطب الدین سے فرمایا کہ بابا بختیار تم یکبارگی اس طرح مشہور ہو گئے ہو کہ خلقت تمھارے متعلق شکایت

[ا] سیر الاولیا۔ (ص ۹۰)

کرتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ اجمیر چلو اور وہیں اقامت کرو۔ چنانچہ دونوں بزرگ دہلی سے اجمیر کی طرف جانے کے لیے تیار ہوئے۔ لیکن اس سے تمام دہلی میں شور برپا ہو گیا۔ اور اہلِ شہر مع سلطان شمس الدین التمش کے آپ کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جب حضرت خواجہ اجمیری نے یہ حال دیکھا تو فرمایا کہ بابا بختیار! تم یہیں قیام کرو میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمھارے جانے سے اتنے لوگوں کی دل شکنی ہو۔ چنانچہ سلطان شمس الدین حضرت خواجہ کی قدم بوسی کے بعد اہلِ شہر اور شیخ قطب الدین کے ساتھ خوشی خوشی دہلی کی طرف واپس پھرا اور حضرت خواجہ اجمیری کی سمت روانہ ہوئے[۵]۔

اولیا کے صحیح حالات مرتب کرنے میں جو مشکلات ہوتی ہیں ان کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کی تاریخ وفات بھی شبہ سے بالا نہیں۔ عام طور پر تذکروں میں ۶ رجب ۶۳۳ھ درج ہے۔ لیکن جناب معنی اجمیری، جنھوں نے تاریخ السلف میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے ۶۳۲ھ کو سالِ وصال مانتے ہیں اور وجہ اس کی یہ بتاتے ہیں کہ اگر ۶۳۳ھ کو سالِ وصال مانیں تو پھر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، جن کی معتبر تاریخ وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ ہے، اپنے مرشد سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ فرشتہ نے خواجہ قطب الدین کی تاریخ وفات ۶۳۴ھ دی ہے۔ لیکن چونکہ سیر الاولیا میں قاضی محی الدین کاشانی کی زبانی خواجہ قطب الدین کا سالِ وفات وہی بتایا گیا ہے، جو سلطان شمس الدین التمش کا تھا (یعنی ۶۳۳ھ) اس لیے فرشتہ کا بیان قابلِ تسلیم نہیں۔ اور اخبار الاخیار وغیرہ میں ۶۳۳ھ ہی درج ہے۔ ہمارے خیال میں خواجہ معین الدین اجمیری اور خواجہ قطب الدین دونوں کا سالِ وصال ۶۳۳ھ ہے۔ لیکن حضرت خواجہ

---

[۵] سیر الاولیا ص ۵۴

معین الدین اجمیریؒ نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے چند ماہ بعد انتقال کیا۔[1]

حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اُن کی نعش مُبارک اسی حُجرے میں دفن کر دی گئی، جس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے۔ لیکن پُختہ مزار کوئی تعمیر نہ ہُوا۔ اور آپ کی وفات کے کوئی ڈھائی سو سال تک بیرونی دُنیا نے اجمیر اور خواجہ اجمیر کو فراموش کیے رکھا۔ فقط شیخ حمید الدین ناگوری کے جانشین کبھی کبھی راجپوتانے کے دوسرے بڑے اسلامی مرکز ناگور سے آتے اور زیارت و دُعا فاتحہ سے فیض یاب ہوتے۔ ۱۴۶۴ء میں خواجہ حسین ناگوری نے مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود خلجی سے استدعا کی اور حضرت خواجہ کا پختہ مزار تعمیر ہُوا۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر نے درگاہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور خود زیارت کے لیے بارہا حاضر ہُوا۔ اس کے بعد درگاہ کو بڑی رونق ہوئی۔ جہانگیر ایک زمانے میں عرصے تک اجمیر میں مقیم رہا اور نو مرتبہ درگاہ کی زیارت کو حاضر ہُوا۔ لیکن درگاہ میں سب سے شاندار اضافہ شاہجہان نے کیا۔ جس نے سفید سنگ مرمر کی ایک خوبصورت جامع مسجد بنوائی اور نقار خانے میں ایک بلند دروازے کا اضافہ کیا۔ روضے کا شاندار گنبد بھی شاہجہان نے تعمیر کرایا تھا۔

حضرت خواجہ بزرگؒ کو زمانہ ان کی پاک زندگی، مبلّغانہ اور مصلحانہ کوششوں اور رُوحانی عظمت کی وجہ سے مانتا ہے، لیکن ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا جس سے اکثر لوگ رُوشناس نہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور آپ کے اشعار کی تعداد سات آٹھ ہزار کے قریب تھی۔ فارسی شعرا کے مشہور تذکرہ آتشکدہ میں آپ کی دو رُباعیاں نقل ہوئی ہیں ؎

---

[1] سیر الاولیا کے ص ۵۳۲ پر حاشیہ پر کتاب کے ایک ایسے نسخے کی عبارت درج ہے جو متن سے مختلف ہے۔ اس نسخے میں خواجہ معین الدینؒ کے سفرِ دہلی کا ذکر کر کے لکھا ہے: "شیخ معین الدین سمتِ اجمیر رواں شدہ ہنوز شیخ معین الدین در اجمیر نرسیدہ بود کہ شیخ قطب الدین بختیار در شہر بر حمتِ حق پیوست۔"

عاشق بہ ہر دمے فکرِ رخِ دوست کند | معشوق کرشمۂ کہ نکو ست کند
ما جرم و گنہ کنیم و او لطف و عطا | ہر کس چیزیکہ لائقِ او ست کند

اے بعدِ نبی بر سرِ تو تاجِ نبی | اے دادہ شہاں زِ تیغِ تو باجِ نبی
آنی تو کہ معراجِ تو بالا تر شد | یک قامتِ احمدی زِ معراجِ نبی

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی ایک تصنیف میں ذیل کا شعر حضرت خواجۂ بزرگ سے منسوب کیا ہے ؎

سر داد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ ہستِ حسینؓ

سیر السالکین میں آپ کی نسبت لکھا ہے:۔

"حضرت ایشاں در زمرۂ شعرائے نامدار از معتنماتِ روزگار اند و در اصناف شعر قصیدہ و غزل مرعی دارند مجموعہ کلام عرفان آنحضرت کہ گنجینہ بیش از ہفت ہشت ہزار بیت بودہ۔ از دست دوراں نامہرباں از میان رفت واندکے ازاں ماندہ۔"

چند سال ہوئے مطبع نولکشور نے "دیوان حضرت خواجہ معین الدین" کے نام سے فارسی غزلیات اور قصائد کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، جسے حضرت خواجہ کے عقیدت مند آپ کا کلام سمجھتے ہیں۔ لیکن حافظ شیرانی نے ایک فاضلانہ اور مدلل مضمون میں اس دیوان کے اصلی ہونے پر شبہ ظاہر کیا ہے اور ہندوستان میں برگزیدہ ہستیوں سے بلا کسی تحقیق کے دوسروں کا کلام منسوب کرنے کا مرض اس قدر عام ہے کہ کوئی ایسا مجموعہ جو قابلِ اعتماد ذریعوں سے دستیاب نہ ہو اصلی نہیں سمجھا جا سکتا۔

میر سید حسین خنگ سوار | خواجہ بزرگ کے معاصرین سے ہم میر سید حسین خنگ سوار کا ذکر کر چکے ہیں۔ وہ سلطان محمد غوری کی فوج کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور یہیں بس گئے۔ غوری کے چلے جانے کے بعد قطب الدین نے خود پہلے کہرام اور پھر دہلی میں قیام کیا اور اجمیر میں میر خنگ سوار کو داروغہ

مقرر کیا[1]، جو شیعہ مذہب کے تھے۔ وہ حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ خواجہ بزرگ کی دوسری شادی آپ ہی کے خاندان میں ہوئی۔ آپ اکثر حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر رہتے اور محرمانہ صحبتیں برپا ہوتیں۔ بہت سے لوگ آپ کی بدولت حضرت خواجہ کی خدمت میں باریاب ہو کر خلعتِ اسلام سے شرف یاب ہوتے تھے۔ اس لیے اس علاقے کے غیر مسلم آپ کے خلاف ہو گئے۔ جب قطب الدین ایبک کی وفات کی خبر اجمیر میں مشہور ہوئی تو اُن لوگوں کی جرأت بڑھی۔ اس وقت آپ کا بیشتر لشکر اجمیر سے باہر تھا اور آپ معدودے چند آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں مقیم تھے۔ مخالفین نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ حملہ کیا اور آپ کو سب ساتھیوں کے ساتھ شہید کر دیا۔ صبح کے وقت حضرت خواجہ بزرگ تشریف لائے اور شہدا کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ میر خنگ سوار کا مزار تارا گڑھ کی پہاڑی پر ہے اور قریب ہی گنج شہیداں ہے جہاں آپ کے ہمراہی دفن ہیں۔ آپ کے مزار کی نسبت ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں بہت سا اضافہ دو ہندو امرا نے کرایا[2]۔

صوفی حمید الدین ناگوریؒ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے خلفائے کبار میں سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ دوسرے بڑے خلیفہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین صوفی ناگوری تھے۔ وہ بھی بڑے پائے کے بزرگ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف اصول الطریقت ہے، جس سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں طویل اقتباسات دیے ہیں۔ آپ کے ملفوظات سرور الصدور کے نام سے آپ کے پوتے اور خلیفہ شیخ فرید الدین نے جمع کیے ہیں لیکن وہ ابھی شائع نہیں ہوئے۔ اخبار الاخیار میں آپ کے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۷۷

[2] اجمیر از پنڈت ہربلاس ساردا۔

مکتوبات اور اشعار کا بھی ذکر ہے۔ بالخصوص وہ خط و کتابت جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحؒ کے درمیان ہوئی۔ خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق سیر الاولیاء میں لکھا ہے:۔

"جس زمانے میں شیخ حمید الدین سوالیؒ[1] کی شہرت ہوئی۔ ان دنوں ایک سوداگر جو ناگور سے تل لے جاکر ملتان میں بیچتا اور وہاں سے روئی لاکر ناگور میں فروخت کرتا۔ وہی سوداگر شیخ حمید الدین اور شیخ بہاء الدین زکریا کے خطوط ایک دوسرے کے پاس لے جاتا۔ شیخ حمید الدین نے شیخ بہاء الدین کو لکھا کہ مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ آپ واصلانِ خدا میں سے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ (دولت) دُنیا کو خدا تعالے نفرت سے دیکھتا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپ جیسا بزرگ اس دشمن خدا کو دُور نہیں کرتا۔ شیخ بہاء الدین نے جواب میں لکھا کہ یہ بھی معلوم ہے کہ دُنیا کہتے کسے ہیں؟ اور اس میں سے میرے پاس کس قدر رہے گی؟ آپ نے دُنیا کی حقارت کے متعلق کئی تمثیلیں لکھیں، لیکن شیخ حمید الدین کی تسلی نہ ہوئی۔ انھوں نے اس بارے میں کئی مرتبہ لکھا اور سوچا کرتے کہ اگر یہ ٹھیک ہے تو "ضِدّانِ لَا یَجْتَمِعَانِ" (ایک دوسرے کی مخالف چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں) کا کیا مطلب ہے۔ جب شیخ حمید الدین نے اس بارے میں غلو کیا تو عالم غیب سے ان پر یہ بھید ظاہر ہو گیا۔ لیکن انھوں نے اسے کسی کو بتایا نہیں[2]۔"

آپ کی عمر شریف میں خدا نے بڑی برکت دی۔ کہا جاتا ہے کہ فتح دہلی کے بعد کسی مسلمان کے گھر میں سب سے پہلی اولاد جو ہوئی وہ آپ ہی تھے۔ حضرت خواجہ اجمیری کے زمانے سے حضرت سلطان المشائخؒ کی ابتدائے حیات تک زندہ رہے اور ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔

---

[1] سوالی ناگور کے قریب جوار میں ایک گاؤں تھا۔ اس لیے آپ کو بالعموم ناگوری لکھتے ہیں۔
[2] سیر الاولیا (فارسی) ص ۱۵۸۔

نندر بار علاقہ خاندیش

اسی قافلہ کے ایک اور بزرگ سید علاءالدین نذر باری تھے۔ جنھوں نے ۶۱۲ھ میں خاندیش کے مشہور شہر نندربار (جسے اسلامی حکومت کے زمانے میں نذربار کہتے تھے) جامِ شہادت پیا۔ یہ شہر خاندیش اور گجرات کی سرحد پر واقع ہے اور قدیم زمانے سے تجارتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ سید علاءالدین صحیح النسب سید تھے اور مشہور ہے کہ میر سید حسین خنگ سوار کے برادرِ حقیقی تھے۔ نقل ہے کہ آپ ایک روز حضرت خواجہ بزرگ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک سید مظلوم آیا اور حضرت سے عرض کیا کہ میں نندر بار علاقہ خاندیش میں گیا تھا۔ وہاں کا حاکم رائے نند اگاولی ہے۔ اس نے اور اہالیانِ شہر نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں سید ہوں، عرب سے آیا ہوں اور مسلمان ہوں۔ اس پر راجہ نے حکم دیا کہ اسے مارو اور شہر سے خارج کر دو۔ چنانچہ اہلِ شہر نے مجھ کو مارا۔ میرا ہاتھ قطع کیا اور طرح طرح کی ایذا دے کر مجھ کو نکال دیا۔ اس پر حضرت خواجہ بزرگ نے سید علاءالدین نذر باری کو حکم دیا کہ آپ جائیے اور کفار کو سزا دیجیے۔ آپ حسب الارشاد مع چند ساتھیوں کے نذر بار پہنچے۔ نذر بار کے راجا سے آپ کے کئی معرکے ہوئے جن میں آپ شہید ہوئے۔ لیکن بالآخر راجا کو شکست ہوئی اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ تفصیلات تذکرہ اولیائے دکن میں درج ہیں۔ ضلع (مغربی) خاندیش کے سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ "پہلے نندر بار میں گاولیوں کا راج تھا، لیکن سمن (؟) معین الدین چشتی نے، جن کے ساتھ سید علاءالدین پیر تھے۔ ان سے لڑ کر شہر فتح کر لیا۔ سید علاءالدین یہاں شہید ہوئے لیکن ان کی کرامات سے مُسلم فوج کو کامیابی ہوئی۔ اب بھی شہر سے باہر ایک مسجد ہے، جسے اوّل غازی یا علاءالدین غازی کی مسجد کہتے ہیں۔" سید علاءالدین کی قبر شہر سے باہر ایک ٹیلے پر بنائی گئی تھی لیکن مرورِ زمانہ سے وہ ہموار ہو گئی۔ پھر حضرت

شاہ عالم (احمد آبادی) نے کشفِ باطنی کے ذریعہ قبر کا نشان بتایا اور ۹۹۶ھ میں ملک ناصر نے قبر اور گنبد اور ملک جمن نے مسجد پختہ تعمیر کرادی۔ سید علاء الدین کے ہمراہ ایک بزرگ شیر ابو الغازی نامی تھے، جن کا مزار دربار کے دروازے کے باہر واقع ہے۔ سید صاحب کی شہادت ۶۱۲ھ میں بتائی جاتی ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ زیادہ تر اجمیر میں رہے۔ دہلی میں ان کے سلسلے کا کام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کرتے تھے۔ آپ ترکستان کے شہر اوش میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت کے بعد بغداد میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مرید ہوئے۔ جب حضرت خواجہ بزرگؒ ہندوستان تشریف لے آئے تو حضرت بختیار کاکی بھی ان کی زیارت کے لیے بغداد سے ہندوستان آئے۔ پہلے ملتان پہنچے اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مہمان رہ کر دہلی آئے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت خواجہ بزرگؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ قربِ روحانی کے آگے بُعدِ مکانی کوئی چیز نہیں[۱] تمھیں دہلی ہی میں قیام کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت بختیار کاکی اس کے بعد دہلی ہی میں رہے۔

حضرت خواجہ نے دہلی میں بڑا اثر حاصل کیا۔ خاص و عام ان کے عقیدتمند ہوئے۔ ان کی طبیعت میں استغراق و انجذاب کا بھی ایک بڑا عنصر تھا۔ سیر الاولیا میں سُلطان المشائخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "شیخ الاسلام قطب الدین کا ایک چھوٹا بیٹا تھا، وہ فوت ہو گیا اور اُسے دفن کر کے واپس آئے تو آپ کی زوجہ محترمہ نے گریہ وزاری شروع کی۔ آپ نے ایک رفیق شیخ بدر الدین غزنوی سے پُوچھا: کیا ماجرا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ مخدُوم زادہ فوت ہو گیا ہے اور اس کی والدہ غم سے بے قرار ہو کر آہ و زاری کر رہی ہیں۔ آپ افسوس کرنے لگے اور

---

[۱] سیر العارفین ص ۲۱

فرمایا کہ اگر مجھے اس کی علالت کا پتا ہوتا تو میں ضرور اس کی زندگی کے لیے خدائے تعالیٰ سے دُعا کرتا۔ یہ واقعہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ دیکھو، استغراق کس درجے کا تھا کہ اپنے بیٹے کی زندگی یا موت کی خبر ہی نہیں[۱]۔

آپ کے حالات دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ شریعت اور طریقت کی جس کشمکش نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں بعض خوشگوار صورتیں اختیار کیں آپ کے زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں شیخ الاسلام کا عہدہ خالی ہوا۔ سلطان شمس الدین التتمش نے حضرت بختیار کاکیؒ سے یہ عہدہ قبول کرنے کی خواہش کی، لیکن آپ نے منظور نہ کیا۔ بالآخر یہ عہدہ شیخ نجم الدینؒ صغرا کو ملا، جو ایک باخُدا بزرگ تھے اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے عزیز اور عقیدت مند تھے۔ لیکن خواجہ بختیار کاکی سے ان کی نہ بن سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب کو سماع کا شوق تھا اور شیخ الاسلام اس پر اعتراض کرتے تھے۔ دُوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیخ الاسلام کو یہ بھی ناگوار تھا کہ لوگ خواجہ صاحب کا ادب مجھ سے زیادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، ان اختلافات کو مٹانے کے لیے حضرت خواجہ اجمیریؒ نے خواجہ قطب الدین کو اجمیر چلنے کا مشورہ دیا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہوئے، لیکن معتقدین کے اصرار کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

سلطان شمس الدین التتمش حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا بڑا مُعتقد تھا۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب التتمش نے ان کے دہلی آنے کی خبر پائی تو خدا کا شکر بجا لایا اور حضرت سے شہر دہلی کے اندر آ کر قیام کرنے کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ نے کمیِ آب کی بنا پر یہ درخواست قبول نہ کی، لیکن دُوسرے

---

[۱] فوائد الفواد ص ۶۳۔ سیر الاولیا (اُردو) ص ۴۹۔ سیر العارفین ص ۲۷

موقعوں پر جب آپ اندرونِ شہر تشریف لائے تو سلطان نے شاندار طریقے سے استقبال کیا اور باہمی مراسم پیدا ہو گئے[1]۔ بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ دہلی کا قطب مینار اسی پاک ہستی کی یادگار میں سلطان نے تعمیر کروایا[2]۔

سلطان شمس الدین التمش درویشانہ طبیعت کا انسان تھا اور صوفیہ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا طبقاتِ ناصری میں اس کی نسبت لکھا ہے:۔

"غالب ظن است کہ ہرگز بادشاہے بحسن اعتقاد و آب دیدہ و تعظیم علماء و مشائخ مثل او از مادر خلقت در قماط سلطنت نیامدہ۔

التمش کے عہدِ حکومت میں دہلی میں سماع کا عام رواج ہو گیا اور اس میں بادشاہ کی درویشانہ طبیعت کے علاوہ قاضی حمید الدین ناگوری اور قاضی منہاج سراج (مصنف طبقاتِ ناصری) کے اثر کو بڑا دخل تھا۔ فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کا ایک ارشاد نقل ہوا ہے:

"سکہ و سماع دریں شہر قاضی حمید الدین ناگوری نشاندہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی منہاج الدین ہمچوں او قاضی شد و صاحب سماع بود۔ بسبب ایشاں ایں کار استقامت پذیرفت (ص ۲۳۹)

قاضی حمید الدین ناگوری بخارا سے دہلی آئے تھے۔ چونکہ وہ تین سال ناگور میں قاضی رہے، اس لیے ناگوری مشہور ہیں۔ اس کے بعد ان پر جذبۂ درویشی غالب آیا۔ بغداد میں جا کر شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ وہ سہروردی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں سماع کا عام رواج نہیں، لیکن وہ دہلی میں آ کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گئے۔ سیر العارفین میں ان کی نسبت لکھا ہے: "اگرچہ بعضے از سہروردیاں سماع بر سبیل ندرت بشنوند۔ اما او را بواسطۂ صحبت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ

---

[1] سیر العارفین ص ۲۰۔۲۱۔ [2] کیمبرج ہسٹری جلد سوم ص ۵۵

دریں کار استغراقے وغلوے تمام بود" دار الخلافہ کے ارباب ظاہر نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن شیخ حمید الدین ناگوری خود اہلِ علم تھے اور بلا کے ذہین، ظریف اور حاضر دماغ تھے۔ وہ شرعی دلیلوں اور حیلوں سے مخالفوں سے بازی لے جاتے۔ اس کے بعد جب قاضی منہاج الدین ایک طرح کے قاضی القضاۃ ہوئے تو سماع کی بنیادیں اور گہری ہو گئیں۔ لیکن جب سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں شرعی احکام کی پابندی پر زیادہ زور دیا جانے لگا تو جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے سماع پر زیادہ موثر اعتراضات شروع ہوئے اور خود سلطان المشائخ کو علما کے ایک محضر میں جواب دہ ہونا پڑا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو سماع کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ خواجہ قطب الدین علی سجستانی کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں محفلِ سماع برپا تھی اور قوال یہ بیت گا رہے تھے[1]

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حضرت خواجہ کے مزاج میں ایسا تغیر ہوا کہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کے ساتھی انھیں مکان پر واپس لے آئے لیکن جب انھیں ہوش آیا تو قوالوں کو پھر اسی شعر کی تکرار کا حکم دیا اور خواجہ وجد فرما کر پھر حال میں مستغرق ہو گئے۔ یہ حالت چار شبانہ روز جاری رہی اور حضرت خواجہ کا بند بند درد کرنے لگا۔ بالآخر اسی حالت میں ۲۷ دسمبر ۱۲۳۵ء کو دنیا کو الوداع کہا۔ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ جب حضرت خواجہ کی وفات ہوئی، اس وقت بابا فرید

---

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۴۴۔ [لیکن حضرت خواجہ کے ملفوظات (فوائد السالکین) میں یہ واقعہ خود حضرت خواجہ کی زبانی درج ہے۔ ان ملفوظات کی بے اعتباری کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے!]

ہانسی میں تھے۔ وہ حضرت خواجہ کی خدمت میں دو ہفتے کے بعد حاضر ہوتے تھے، لیکن قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدر الدین غزنوی تو ہر روز موجود رہتے تھے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ خلافت ہمیں ملے گی، لیکن خواجہ قطب الدین نے انتقال سے پہلے فرمایا کہ میرا جامہ، عصا، مُصلّا اور لکڑی کے نعلین شیخ فرید الدین کو دینا۔ چنانچہ وہی حضرت خواجہ کے جانشین ہوئے۔ (فوائد الفواد ص ۱۸۷)

شیخ کبیر بابا فرید گنج شکرؒ

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا انتقال ۱۲۳۵ء میں ہوا اور ان کے اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے جانشین حضرت شیخ کبیر بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہوئے۔ ان کے آباد اجداد کابل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اور چنگیزی حملے کے دوران میں وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے۔ شیخ کبیر کے دادا ملتان کے نزدیک کھوتوال میں قاضی مقرر ہوئے اور یہیں بابا صاحب، جن کا اصل نام مسعود تھا، پیدا ہوئے۔ کھوتوال میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے۔ اور حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں اٹھارہ برس کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ آپ دہلی کی طرف چلے۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ نے تین منزلیں شیخ قطب الدین کے ساتھ طے کی تھیں کہ انھوں نے بابا فرید کو فرمایا کہ وہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کر لیں اور پھر ان کے پاس دہلی آئیں۔ خوش نصیب مسعود نے اسی طرح کیا۔ پانچ سال تکمیلِ تعلیم کے لیے خطۂ قندھار میں گزارے[1] اور پھر دہلی آئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں شیخ قطب الدین نے

---

[1] سیر العارفین ص ۳۶۔ سیر الاولیا کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے۔ لیکن فوائد الفواد سیر الاولیا اور دوسری کتب سے آپ کی جو ٹھوس علمی استعداد نظر آتی ہے اسے دیکھ کر سیر العارفین کا بیان بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

آپ کو نعمہائے رُوحانی سے مالا مال کر دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں ہجوم مرطلی کی وجہ سے یکسوئی میّسر نہیں ہوتی تو مرشد کی اجازت سے ہانسی چلے گئے، لیکن وہاں سے دہلی آتے جاتے رہے اور ایک دفعہ جب حضرت خواجہ بزرگؒ اجمیر سے دہلی آئے ہوئے تھے تو آپ ان کی توجہ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ خواجہ بزرگ بابا فرید کے ذوق وشوق اور روحانی استعداد سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے ان کے مرشد اور اپنے مُرید خواجہ بختیار کاکی سے کہا "بابا بختیار! شہبازِ عظیم بقید آوردہ کہ جز بہ سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد۔ این فرید شمعیست کہ خانوادۂ درویشاں منوّر سازد۔" چنانچہ یہی ہُوا۔ اور نہ صرف شیخ کبیرؒ نے مغربی پنجاب میں کامیاب اشاعتِ اسلام کی، بلکہ سلطان المشائخ اور شیخ صابر جیسے صاحب سلسلہ بزرگوں کی تربیت کر کے چشتیہ سلسلے کو پہلی مرتبہ وسیع اور مستحکم بُنیادوں پر کھڑا کیا۔

مُرشد کی وفات کے بعد بابا فرید پہلے ہانسی، پھر کھوتوال اور بالآخر پاکپٹن جو اُن دنوں اجودھن کہلاتا تھا۔ چلے گئے۔ اپنی وفات یعنی ۱۲۶۵ء تک وہیں رہے اور بیعت و ارشاد اور وعظ و تلقین اور یادِ الہٰی میں ساری عُمر گزار دی۔

آپ سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں لیکن سب سے بڑی کرامت آپ کی بے حرصی اور پاک زاہدانہ زندگی تھی۔ بادشاہوں کے درباروں اور شہری زندگی کے جھگڑوں سے آپ کو بڑی نفرت تھی۔ آپ نے خواجہ بختیار کاکی اور شیخ نجم الدین کے معرکے دیکھے تھے اور جانتے تھے کہ دربار کے قرب سے ایک تو فقرا کو ان قضیوں سے واسطہ پڑتا ہے، جن سے انھیں بچنا ہی مناسب ہے۔ دوسرے اُرشاد و ہدایت اور ارشادِ مذہب کا پُورا موقعہ نہیں ملتا۔ چنانچہ خواجہ بختیار کاکی کی زندگی میں آپ زیادہ تر ہانسی میں رہے اور ان کی وفات کے بعد

۱؎ سیر العارفین ص ۲۲

پاک پٹن تشریف لے گئے ۔ آپ جنگل میں رہتے ۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ۔ پیلو اور جنگل کے پھل پھول پر گزارہ کرتے بلکہ زیادہ تر روزہ سے رہتے ۔ اسی تقوے اور پرہیزگاری کی وجہ سے لاتعداد لوگ آپ کے معتقد تھے ۔ اور شاہانِ وقت بھی آپ کا بڑا احترام کرتے، لیکن آپ کو اصل محبت عزلت نشینی اور عبادت سے تھی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے ؂

ہر کہ در بندِ نام و آوازہ است
خانۂ او برونِ دروازہ است

اجودھن کے نئے ماحول میں آپ کو جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کا اندازہ فقط ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے ۔ جب آپ اجودھن تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو کھوتوال بھیجا تاکہ آپ کی والدہ ماجدہ کو وہاں سے لائیں ۔ چنانچہ شیخ نجیب الدین نے اپنی بوڑھی ماں کو ایک گھوڑی پر سوار کیا اور خود ان کے ساتھ پا پیادہ اجودھن کو چلے ۔ رستے میں ایک بڑا جنگل تھا ۔ جس میں وحوش و درندے بکثرت تھے ۔ آدھے راستے میں پہنچ کر بوڑھی اماں کو پیاس لگی تو شیخ نے انھیں ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور خود گھوڑی پر سوار ہو کر پانی کی تلاش کو نکلے ۔ جب بہت دیر کے بعد پانی لے کر آئے تو والدہ ماجدہ غائب تھیں ۔ ہر طرف ان کی تلاش کی ۔ لیکن کوئی پتا نہ چلا ۔ ناچار تھک کر اکیلے اجودھن گئے اور جب وہاں سے کچھ آدمی ساتھ لاکر والدہ ماجدہ کی پھر تلاش شروع کی تو فقط ان کی ہڈیاں ملیں ؂۔

خود اجودھن میں شیخ کبیر کے ڈیرے کے حالات پڑھیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی بچھوؤں اور سانپوں کا دل پسند مسکن تھا ۔ جس میں ہر طرف درویشوں کے دائیں بائیں خوفناک چیزیں رینگتی پھرتی تھیں ۔ سیر الاولیا میں جا بجا، کہیں بابا فرید اور

؂ فوائد الفواد صر ۱۲۲

کہیں ان کے کسی مرید (مثلاً حضرت سلطان المشائخ) کے سانپوں سے ڈسے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اجودھن کے لوگوں کی نسبت بھی لکھا ہے کہ وہ زیادہ تر "کج طبع و درشت مزاج و بد اعتقاد" تھے۔ انھوں نے بابا صاحب کی کوئی پروانہ کی۔ اسی چیز کو دیکھ کر بابا صاحب نے وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ اُنھوں نے لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر کہا کہ یہ جگہ خوب ہے۔ یہاں بڑے اطمینان اور فراغ خاطر سے خدائے تعالٰی کی عبادت ہوسکتی ہے[ا]۔ چنانچہ قصبے سے باہر، درختوں کے نیچے اپنا بوریا ڈالا اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔

آہستہ آہستہ آپ کی ریاضت و عبادت کی شہرت عام ہونی شروع ہوئی۔ اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے۔ ان دنوں تختِ دہلی پر سلطان ناصر الدین محمود متمکن تھا جس کی درویش طبعی ضرب المثل ہے۔ وہ ایک زمانے میں لشکر کے ساتھ اچہ اور ملتان کی طرف جارہا تھا۔ راستے میں اُس نے اپنے نائب السلطنت الغ خان کو جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے دہلی کا با اقتدار بادشاہ ہُوا۔ بابا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ساتھ ہی زرِ نقد اور چار دیہات کا جاگیر نامہ تھا۔ الغ خاں نے یہ چیزیں بابا صاحب کے سامنے رکھ دیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو الغ خان نے جواب دیا کہ خانقاہ کے درویشوں کے لیے کچھ نقدی ہے اور آپ اور آپ کی اولاد کے لیے چار گاؤں کی سند ہے۔ اگر قبول فرمائیں تو ہماری انتہائی خوش قسمتی ہوگی۔ بابا صاحب نے کہا کہ نقدی تو درویشوں کے لیے ہے، وہ ان میں تقسیم کر دی جائے اور جاگیر نامہ واپس لے جائیے کیونکہ اس کے دوسرے طالب بہت ہیں[۲]۔

آپ خود بھی اربابِ ثروت اور متوسلین حکومت سے دُور رہے اور دوسروں کو بھی یہی ہدایت کرتے رہے۔ عہدِ خلجی کے مشہور درویش سیدی مولٰہ

[ا] سیر العارفین صہ ۳۲ [۲] فوائد الفواد صہ ۹۹

آپ نے اجودھن سے دہلی کے لیے رخصت کرتے وقت جو ہدایت کی تھی اس کا ہم سلطان جلال الدین خلجی کے واقعاتِ حکومت میں ذکر کر چکے ہیں۔ قریباً اسی طرح کی ہدایت آپ نے اپنے پیر بھائی شیخ بدرالدین غزنوی کو دی، جو حضرت بختیار کاکی کے مشہور خلفا میں سے تھے۔ دہلی میں ملک نظام الدین خریطہ دار نے ان کے لیے ایک خانقاہ بنوا دی تھی اور ان کے آرام و آسائش کا سارا سامان بہم پہنچایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ زرِ کثیر کے غبن کے الزام میں ماخوذ ہوا۔ شیخ بدرالدین کے کام میں بھی خلل پڑنا شروع ہوا۔ انھوں نے بابا فرید کو ایک خط لکھا۔ سارے حالات بیان کیے اور درخواستِ دعا کی ؎

فرید الدین و ملت یار زیرک　　　　لہ بادش در کرامت زندگانی
دریغا خاطرم گر جمع داری　　　　بملہ حش کردمے گوہر فشانی

بابا صاحب نے رقعہ کو پڑھا تو سر مبارک کو ہلایا اور جواب میں لکھا:۔

عزیز الوجود کا رقعہ ملا اور جو کچھ اس میں درج تھا۔ اس سے آگاہی ہوئی۔ جو کوئی اپنے بزرگوں کی روش پر نہ چلے گا۔ ضرور ہے کہ اُسے اس طرح کا ماجرا پیش آئے اور وہ غم و الم سے دوچار ہو۔ آخر ہمارے پیرانِ عظام میں سے کون تھا، جس نے اپنے لیے خانقاہ بنوائی؟ اور اس میں جلوس فرمایا ہو؟[1]

اربابِ ثروت سے دُور رہنے کے علاوہ معاملات میں انتہائی احتیاط پر آپ جس طرح زور دیتے تھے، اس کا اندازہ فوائد الفواد کے ایک اندراج سے ہو سکتا ہے۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ جب میں شیخ کبیر کا مرید ہوا اور توبہ کی تو انھوں نے کئی مرتبہ فرمایا کہ دشمنوں کو خوش کرنا چاہیے اور صاحب حق کو مطمئن کرنے پر بھی بڑا زور دیا۔ سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ مجھے اس وقت یاد آیا کہ مجھے ایک آدمی کے بیس جیتل دینے ہیں اور ایک کتاب بھی کسی سے

---

[1] سیر العارفین ص ۱ ۵ ۔ فوائد الفواد ص ۹۷

مُستعار لی تھی، جو گُم ہو گئی ہے۔ حضرت مُرشد کو کشف سے اس کا علم ہو گیا ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ مَیں نے دل میں عہد کیا کہ دہلی واپس پہنچتے ہی یہ حساب بے باق کر دوں گا۔ چنانچہ جب میں اجودھن سے دہلی پہنچا تو اس کی فکر ہوئی، لیکن معاش کی بڑی تنگی تھی۔ بیس جیتل جمع ہونے میں نہ آتے تھے۔ جب دس جمع ہوئے تو مَیں انھیں لے کر اس بزاز کے پاس پہنچا، جس کی رقم میرے ذمہ تھی۔ اور کہا کہ تمھارے بیس جیتل دینے ہیں، وہ تو میرے پاس نہیں۔ اِس وقت یہ دس لے لو اور باقی مَیں پھر ادا کروں گا۔ اُس نے یہ سُنا تو بڑا خوش ہُوا۔ اور کہا کہ ہاں، تم مسلمانوں کے پاس سے آتے ہو، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ اُس نے دس جیتل تو لے لیے اور کہا کہ باقی مَیں نے تمھیں بخشے۔ اسی طرح مالکِ کتاب کے پاس جاکے اس کا حساب چکایا۔ (فوائد الفواد ص۱۴۰)

شاہانِ وقت اور لاتعداد لوگوں کی عقیدت کے باوجود آخر عُمر تک شیخ کبیر کے زہد و ریاضت کی جو حالت رہی، اس کے متعلق سیر الاولیا میں ہے:-

"سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ شیخ شیوخ العالم فریدالحق والدین قدس سرہ العزیز آخر عمر میں تنگ روزی ہو گئے۔ خصوصاً جب آپ کی رحلت کا موقع آیا۔ یہاں تک کہ ماہِ رمضان میں جب میں وہاں تھا، افطار کے وقت تھوڑا سا کھانا لایا جاتا جو حاضرین کے لیے کافی نہ ہوتا۔ ان دنوں میں نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتا۔" (ص۶۰)

اشاعتِ اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی کو شاید ہی ہوئی ہو۔ مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ مثلاً سیال راجپوت، وٹو وغیرہ[1]۔

---

[1] گزیٹر ضلع ملتان و ضلع منٹگمری وغیرہ

زہد و عبادت اور چلہ کشی میں انتہائی مصروفیت، اور شہروں اور علمی مجلسوں سے دُوری کے باوجود شیخ کبیر علم و تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ خواجہ سید بدرالدین اسحٰق فقرا کے منکر ہونے کے باوجود بابا صاحب کی علمیت کی وجہ سے ان کے معتقد ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین نے آپ سے عوارف المعارف کے چند باب، تمہید ابو شکور سلمی اور کئی دوسری کتابیں پڑھیں عوارف سے آپ کو بہت شغف تھا۔ چنانچہ جن دنوں آپ عوارف کا سبق دے رہے تھے۔ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور آپ نے اس کا نام عوارف کے مصنف شیخ شہاب الدین سہروردی کی مناسبت سے شہاب الدین رکھا۔

عربی ادب سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ چنانچہ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کا ارشاد درج ہے کہ جب ایک مرتبہ شیخ کبیر کے سامنے ابوبکر قوال نے عربی کے دو اشعار پڑھے، جو اس نے شیخ بہاء الدین زکریا کو سنائے تھے اور کہا کہ باقی مصرعے مجھے یاد نہیں رہے تو شیخ کبیر نے باقی سنا کر بیان کی تکمیل کر دی۔ (فوائد الفواد ص ۱۴۹)

شیخ کبیر بڑے عالم اور عابد تھے، لیکن غالباً اپنے مرشد شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے زیر اثر سماع سے انھیں بڑی دلچسپی ہو گئی تھی اور اہل شریعت اس پر اعتراض کرتے تھے۔ لیکن آپ کے اثر و اقتدار اور روحانی سطوت کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے[1]

مغربی پنجاب میں کامیاب اشاعت اسلام کرنے کے علاوہ آپ نے بڑے بڑے صاحب سطوت بزرگوں کی تربیت کی۔ چشتیہ سلسلے کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں رونق دی تھی۔ لیکن خطۂ ہند و پاکستان میں اس سلسلے کو اصل وسعت و استحکام بابا فرید کی ذات بابرکات سے نصیب ہوا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۹۶

اور فی الحقیقت انھیں اس سرزمین میں سلسلۂ چشتیہ کا موسس ثانی کہا جا سکتا ہے۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ نے بابا صاحب کی نسبت فرمایا تھا کہ فرید ایک شمع ہے، جس کی بدولت خانوادۂ درویشاں منور ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ چشتیہ سلسلے کی دو بڑی شاخیں صابریہ اور نظامیہ ہیں۔ ان دونوں کے موسس حضرت بابا صاحب کے مرید، مخدوم علاءالدین صابرؒ اور حضرت سلطان المشائخؒ تھے۔

ان کے علاوہ آپ کے ایک اور عزیز اور قدیمی خلیفہ حضرت قطب جمال الدین ہانسوی تھے۔ جنھوں نے قیام ہانسی کے دوران میں آپ سے بیعت کی تھی۔ ان پر آپ کو اتنا اعتماد تھا کہ کوئی خلافت نامہ ان کی تصدیق و توثیق کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے مخدوم علاءالدین صابرؒ کی ولایت دہلی کی سند پھاڑ دی۔ جب بابا صاحب کی خدمت میں اس کی شکایت کی گئی تو انھوں نے کہا کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں سی سکتا۔ چنانچہ انھیں دہلی کی بجائے کلیر کا علاقہ مرحمت ہوا۔ شیخ ہانسویؒ شاعر تھے اور ان کا ضخیم فارسی دیوان چھپ گیا ہے۔ آپ کی وفات ۶۵۹ھ میں ہوئی۔

حضرت سلطان المشائخؒ، حضرت خواجہ صابر کلیریؒ اور شیخ جمال ہانسویؒ کے علاوہ حضرت گنج شکر کے کئی اور قابلِ ذکر خلفا تھے۔ ایک حضرت امام الحقؒ سیالکوٹی تھے جنھیں بابا فرید نے تعلیم و تربیت اور عطائے خرقہ کے بعد سیالکوٹ بھیجا۔ آپ نے برسوں وہاں ارشاد و ہدایت کے فرائض انجام دیے اور ہزاروں لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی وفات ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء میں ہوئی۔ مزار پُرانوار سیالکوٹ کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ دوسرے قابلِ ذکر خلیفہ شیخ منتخب الدین قدس سرہ تھے جو دکن میں شمع اسلام لے کر گئے۔ ان کا ذکر ہم دکن کے داعیانِ اسلام کے سلسلے میں کریں گے۔

حضرت بابا صاحب کے ملفوظات کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک مجموعہ حضرت سلطان المشائخ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسرا خواجہ

بدر الدین اسحٰق سے۔ پہلے کا نام راحت القلوب ہے اور دوسرے کا اسرار الاولیا۔
اگر ان دونوں مجموعوں کا حضرت خواجہ اجمیریؒ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مبینہ ملفوظاتؒ سے مقابلہ کریں تو ان سے بابا فرید کی علمی قابلیت اور وسیع مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت خواجہ اجمیری کے ملفوظات دلیل العارفین میں زیادہ تر نماز روزہ، طہارت، درود وظیفہ کی باتیں ہیں، جو انھوں نے اپنے مُرشد یا دوسرے بزرگوں سے سُنیں۔ لیکن بابا فرید کے ملفوظات میں جابجا کتابوں کے حوالے ہیں۔ بعض جگہ ایک ایک صفحے پر تین تین چار چار کتابوں کے نام آتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بابا صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ اس کے علاوہ آپ کے جو ارشادات ہیں ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپ کے دل میں علم کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ راحت القلوب میں آپ کا ایک ارشاد درج ہے :۔

لہ ان ملفوظات کی صحت پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے (مثلاً حضرت چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس میں لکھا ہے "شیخ نظام الدین و خواجگان چشت قدس اللہ ارواحہم کتابے تصنیف نکردہ و ایں ملفوظات در حیات شیخ نبودے۔ اگر بودے خدمت شیخ ہم فرمودے) اور ان میں الحاقی عناصر شامل ہو جانا قرینِ قیاس ہے لیکن یہ ملفوظات ہیں بہت پُرانے اور فوائد الفواد کے بعض اندراجات حضرت چراغ دہلی کے بیان کی تائید نہیں کرتے۔

ہم نے اولین چشتیہ مشائخ کے متعلق معلومات جمع کرنے میں فقط حضرت سُلطان المشائخ کے مستند ملفوظات فوائد الفواد، سید محمد مبارک امیر خورد کی تالیف سیر الاولیا اور جمالی کی سیر العارفین پر اعتماد کیا ہے۔ خیر المجالس اور جوامع الکلم بھی شبہ سے بالا نظر آتے ہیں۔ ابتدائی دور کے باقی ملفوظات یعنی انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیا کی حیثیت مشتبہ ہے اور غالباً وہ سب کے سب وضعی ہیں۔ لیکن یہ ملفوظات حضرت چراغ دہلی کے زمانے میں ہی رائج ہو گئے تھے۔ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے بزرگوں نے ان سے کم و بیش استفادہ کیا ہے۔

علم فاضل تر از جملہ عبادتہاست نزدیک خدائے تعالیٰ از نماز و روزہ و حج و جُز آں۔

حضرت شیخ کبیر کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ فرشتہ نے ایک رباعی نقل کی ہے[۱]۔

گیرم کہ بہ شب نماز بسیار کُنی	در روز دوائے شخص بسیار کُنی
تا دل نہ کُنی ز غصّہ و کینہ خالی	صد خرمن گل بر سر یک خار کُنی

مخدوم علاء الدین صابرؒ

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابرؒ بابا صاحب کے حقیقی بھانجے تھے موضع کھوتوال میں ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ بابا صاحب نے بڑی محبت اور محنت سے تعلیم دی۔ صابریہ سلسلہ، جس میں ہزارہا انسان داخل ہیں آپ ہی سے شروع ہُوا۔ آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اکثر نیم مجذوبانہ اور استغراق کی حالت میں رہتے تھے۔ قدیم اور مستند کتابوں میں آپ کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث آپ کی نسبت لکھتے ہیں :۔

> در سیر الاولیا مے نویسد "کہ درویشے بود ثابت قدم و صاحب نعمت۔ مرید شیخ فریدالدین است و شیخ فریدالدین وقتے کہ باو اجازت بیعت مے کرد فرمود: 'صابر' زندگانی خوش خواہی گزرانید" و ہمچناں بود۔ تا زندہ بود بہ عیش خوش مے گزرانید و او مردے خوش باش و کشادہ رو بود و غالباً ایں شیخ صابر غیر شیخ علی صابر است کہ داماد شیخ فریدالدین و خلیفۂ او بود و قبر او در قصبہ کلیر است۔ و سلسلہ شیخ عبدالقدوس وغیرہ بوے منتہی مے شود۔ و ذکر او در سیر الاولیا اصلاً نہ کردہ و ترک ذکر او خالی از غرابت نیست و تواند کہ او شیخ صابر ہمیں شیخ علی صابر

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۸۴

باشد واللہ اعلم" (ص ۶۹)

سیر الاولیا کا اندراج جس کی نسبت شیخ محدث نے اشارہ کیا ہے حسب ذیل ہے (ترجمہ)

محمد مبارک علوی المدعو بہ امیر خورد (مصنف سیر الاولیا) عرض کرتا ہے کہ ایک درویش صاحب نعمت شیخ علی صابر نام درویشی میں ثابت قدم اور مستجاب الدعوات قصبہ ڈیکری کا رہنے والا شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین کا مرید تھا۔ جب رخصت ہوتے وقت اور یاروں نے وصیت کی درخواست کی تو ہر ایک کو خاص خاص وصیت فرمائی۔ جب شیخ علی صابر نے وصیت کی درخواست کی تو شیخ الشیوخ عالم نے فرمایا کہ جاؤ زندگانی خوشی سے بسر ہو گی چنانچہ آپ کی دعا سے اس بزرگ کی زندگی بڑے عیش سے گزری۔ یہ شخص نہایت خوش باش اور ہنس مکھ تھا" (ص ۱۶۵)

اخبار الاخیار میں لکھا گیا ہے کہ قدیمی تذکروں میں شیخ علی صابرؒ کا ذکر بہت تھوڑا ہے۔ اس کا جواب سیر الاقطاب کے مصنف نے دیا۔ جس نے عہد شاہجہانی میں اپنی کتاب لکھی اور مخدوم صابر اور ان کے خلفا کے حالات بڑی تفصیل سے دیے ہیں:۔

"چوں در ملفوظات حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج ذکر حضرت خواجہ علاء الحق والدین علی احمد صابر قدس اللہ تعالےٰ .... کم واقعہ شدہ و حال ایشاں تمام و کمال ثبت نیست۔ بسبب او اینکہ ملفوظات حضرت شکر گنج باتفاق شیخ جمال ہانسوی جمع گشتہ اند۔ وسوائے آں ہر کہ نوشتہ او را خاطر داشت شیخ مذکور لازم و غبار خاطر آں حضرت و شیخ ہانسوی خود روشن است[1] بنا برآں ذکر آں حضرت چنانکہ بایستے واقع نشدہ"

---

[1] ملاحظہ ہو آیندہ صفحات میں ذکر حضرت سلطان المشائخ و شیخ جمال ہانسویؒ

بعد کے تذکرہ نگار بہت سے واقعات مخدوم صابرؒ سے منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کے زورِ جلال سے بابا فرید کے لڑکوں کی وفات۔ آپ کی خفگی کی وجہ سے آپ کی زوجہ محترمہ کی وفات۔ شیخ جمال ہانسوی سے نزاع۔ شہر کلیر کی ویرانی وغیرہ۔ مُعتقدین تو ان واقعات کو آپ کے رُوحانی جلال اور فتوت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن معترضین کئی اعتراض بھی کرتے ہیں۔ یہ واقعات کسی مُستند قدیمی کتاب میں نہیں ملتے۔ آپ نے سنہ ۱۲۹۱ء میں وفات پائی۔ آپ کے بعد آپ کے سلسلے کو بڑا فروغ ہُوا۔ مزار رُڑکی ضلع سہارن پور سے تیس کوس کے فاصلے پر کلیر شریف میں ہے۔ "یہاں ہر سال عُرس کے موقعہ پر سماع کی محفلیں، ذکر و فکر کے حلقے، حال و قال، وعظ و نصیحت کی مجلسیں اور ناچ رنگ۔ غرض سب کچھ ہوتا ہے۔"

سُلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ

شیخ کبیر بابا فرید گنج شکرؒ نے چشتیہ سلسلے کو بڑی وسعت اور رونق دی۔ خطۂ ہند و پاکستان میں انھیں اس سلسلے کا مؤسسِ ثانی سمجھنا چاہیے۔ لیکن شاید اس سلسلے کے سب سے باثر شیخ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ جس زمانے میں وہ مُرشد کی خدمت میں پہنچے، اُنھیں دنوں شیخ کبیر نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ہم نے جال لگایا ہے۔ اس میں زیادہ تر چڑیاں آئی ہیں، لیکن ایک شاہباز بھی آن پھنسا ہے۔ جب بابا صاحب کی اپنے مُرید سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

حضرت خواجہ صاحب ۹ر اکتوبر ۱۲۳۸ء کو بمقام بدایوں پیدا ہوئے۔

آبائی وطن بخارا تھا۔ آپ کے دادا اور نانا اپنے خاندانوں کے ساتھ چنگیزی فتنہ کے دوران میں بخارا سے لاہور آئے۔ یہیں آپ کے والد اور والدہ پیدا ہوئے۔ لاہور میں ایک عرصہ مقیم رہنے کے بعد یہ دونوں خاندان بدایوں چلے گئے۔ خواجہ صاحب کا نام سید محمدؒ تھا۔ آپ پانچ سال کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے، لیکن آپ کی والدہ بی بی زلیخا بڑی سمجھ دار اور باہمت خاتون تھیں۔ غربت اور افلاس کے باوجود انھوں نے آپ کو پوری تعلیم دلوائی۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں ہوئی، جو شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے آغاز سے ہی علم و فضل اور مذہبی اور روحانی سرگرمیوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ اور جب یہ مرحلہ ختم ہوا تو بی بی صاحبہ اپنے جگر گوشے کو لے کر دہلی آئیں، جہاں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ خواجہ شمس الدین خوارزمیؒ جو کچھ دنوں بعد سلطان غیاث الدین بلبن کے وزیر ہوئے خواجہ صاحب کے اُستاد تھے۔ ان سے آپ نے مقاماتِ حریری پڑھی۔ اور مولنا کمال الدین محدث سے جو علم حدیث میں اُستادِ وقت تھے کتاب مشارق الانوار[۱] کی سند لی۔

حضرت بابا فرید سے تعلقِ قلبی آپ کو اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آپ ابھی بارہ سال کے تھے اور بدایوں میں مولنا علاء الدین اصولی سے تحصیلِ علم کرتے تھے کہ ابوبکر قوال نے جو مغربی پنجاب کی سیاحت سے واپس آیا تھا،

---

[۱] شیخ رضی الدین صنعانیؒ مشارق الانوار احادیث کا ایک ابتدائی مجموعہ ہے جس میں "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" سے دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں بحذف اسناد جمع کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ایک عرصے تک ہندوستان اور دوسرے ممالک میں رائج رہا اور اسے ہندوستان کے ہی ایک عالم شیخ رضی الدین حسن صنعانی نے مرتب کیا۔ ہم ان کا ذکر خطۂ لاہور کے علما و مشائخ کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

وہاں کے بزرگوں کا ذکر کیا۔ پہلے اس نے شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی تعریف کی اور کہا کہ ان کی عبادت و ریاضت حد سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ ان کی کنیزیں کام کاج کی حالت میں بھی ذکر سے غافل نہیں ہوتیں اور اس طرف کی تمام ولائت کو انھوں نے اپنے فیض سے پُرنور کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ابوبکر قوال نے بابا فرید کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ تو ایک ماہِ تمام ہیں جنھوں نے عالم کو اپنے نورِ معرفت سے منوّر کر رکھا ہے۔ خدا کی دین ہے کہ شیخ بہاء الدین کی تعریف سُن کر تو خواجہ صاحب پر کوئی اثر نہ ہُوا، لیکن بابا فرید کی نسبت دل میں ایک قدرتی محبّت پیدا ہوئی۔ اور اس دن سے نماز کے بعد اور سونے سے پہلے آپ نے شیخ فرید کے نام کا وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لائے تو اتفاق سے آپ کو مکان بھی حضرت بابا فرید کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کے پڑوس میں ملا، جن کی صحبت میں یہ تعلقِ خاطر اور بھی گہرا ہو گیا۔

بالآخر آپ ۱۲۵۷ء میں اجودھن تشریف لے گئے اور اُسی روز بیعت سے شرف یاب ہوئے، لیکن خلافت اس سے چار سال بعد یعنی ۶۵۹ھ میں ملی۔ اجودھن کے آپ نے دس سفر کیے۔ سات مُرشد کی وفات کے بعد اور تین ان کی زندگی میں[1]۔ مرشد سے سندِ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ ہانسی میں سند کی توثیق کے لیے قطب جمال ہانسوی کے پاس پہنچے، جن کے پاس شیخ کبیر کی سب سندیں پیش ہوتی تھیں[2]۔ انھوں نے بڑی خوشی سے خلافت نامہ

---

[1] سیر الاولیا صہ ۹۶

[2] صُوفیہ میں عام طور پر مشہور ہے کہ شیخ جمال ہانسوی نے بابا فرید کے دوسرے مشہور مُرید مخدوم علاء الدین صابر کی سند کسی بات پر ناخوش ہو کر پھاڑ دی تھی۔ سیر الاولیا میں غالباً اسی واقعہ کا ذکر ہے۔ "شیخ العالم نے کسی شخص (؟) کو خلافت نامہ عطا فرما کر حکم دیا کہ جب ہانسی جاؤ تو یہ خلافت نامہ ہمارے جمال کو دکھانا۔ جب اس نے ہانسی پہنچ کر آپ کو وہ خلافت نامہ دکھایا

(باقی اگلے صفحے پر)

کی توثیق کی اور زبانِ مبارک سے یہ شعر پڑھا ؎

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس[1]

سندِ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ دہلی تشریف لائے۔ اس وقت آپ کا مشغلہ درس و تدریس تھا اور اس سے بسر اوقات ہوتی تھی۔ لیکن تذکروں میں کئی واقعات درج ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ شروع میں گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ اور کئی کئی روز فاقے سے گزرتے۔ مکان کے متعلق بھی اسی طرح کی بے اطمینانی تھی۔ جب آپ خلافت حاصل کر کے دہلی آئے تو پہلے دو سال امیر خسرو کے نانا کے مکان میں رہے۔ لیکن ایک شام کو جب امیر خسرو پٹیالی گئے ہوئے تھے، ان کے ماموں نے آپ کو فوراً مکان خالی کرنے کے لیے کہا۔ آپ نے مکان تلاش کرنے کے لیے آدمی بھیجا، لیکن کوئی ٹھکانا نہ ملا۔ ناچار آپ مکان سے نکل کر ایک مسجد میں چلے گئے۔ آپ کا سامان اس وقت کتابوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ انھیں سیر الاولیا کے مصنف کے والد سیّد نور الدین کرمانی اور حضرت کے خادم بشر نے اپنے سر پہ اٹھایا۔ دوسرے روز سعد کاغذی کے مکان پر گئے۔ ایک مہینا کے بعد اسے بھی چھوڑا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک شاہی امیر شمس شرب دار کا بیٹا حضرت کا مرید ہوا۔ اور آپ کئی سال تک اس کے مکان پر رہے[2]۔

(بقیہ ص ۲۳۰) تو آپ نے یہ کہہ کر کہ تو خلافت کے لائق نہیں۔ وہ خلافت نامہ پھاڑ ڈالا۔ دراصل اس شخص نے شیخ العالم سے منت و سماجت سے بلا رضا و رغبت شیخ العالم خلافت نامہ حاصل کیا تھا۔ جب وہ شخص ہانسی سے اجودھن آیا اور اس نے خلافت نامہ پھٹا ہوا شیخ العالم کو دکھایا تو آپ نے فرمایا کہ جمال کے پھاڑے ہوئے کو ہم سی نہیں سکتے۔" (اردو ترجمہ سیر الاولیا مطبوعہ لاہور ص ۱۵۹)

[1] سیر الاولیا اردو ترجمہ ص ۱۰۲ [2] سیر الاولیا ص ۹۷

اس کے بعد (غالباً ۶۷۱ھ کے قریب) آپ نے شہر کی رہائش ترک کرکے غیاث پور میں چھپر دں کے مکان کرائے پر لیے، لیکن کچھ عرصہ بعد آپ کے ایک مُرید مولٰنا ضیاءالدین وکیل عمادالملک نے آپ کے لیے ایک عالیشان خانقاہ بنوادی جواب تک موجود ہے۔ یہ خانقاہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے، جس کی دیوار ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کی فصیل سے ملی ہوئی ہے۔ نیچے وہ کوٹھڑیاں ہیں جہاں حضرت کے خلفا عبادت کرتے تھے۔ اور صحن ہے، جہاں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ دوسری منزل میں حضرت کے بیٹھنے کی جگہ ہے، جہاں اکثر مجلس منعقد ہوتی تھی۔ تیسری منزل میں حضرت کی عبادت اور آرام کا حجرہ ہے۔

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب ابتدا میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے موضع غیاث پور میں سکونت اختیار کی تو آپ کی خانقاہ میں نہایت فقر و فاقہ اور تنگی کے ساتھ گزر ہوتی تھی۔ سب سے پہلے جن مُریدوں نے آپ کی خدمت میں درجاتِ عالی حاصل کیے، مولنا برہان الدین غریب اور مولنا کمال الدین یعقوب پٹنی تھے۔ وہ خانقاہ میں مشغولِ ریاضت تھے کہ ایک دفعہ چار روز گزر گئے اور کوئی چیز ایسی نہ آئی جس سے روزہ افطار کیا جاتا۔ اتفاق سے ایک ضعیف آدھ سیر آٹا لے آئی۔ وہ ہنڈیا میں اُبالا جارہا تھا کہ ایک فقیر کمبل پوش آیا۔ جو کچھ موجود تھا، حضرت نے اس کے پاس رکھ دیا۔ اس درویش نے وہ کھا کر ہنڈیا زمین پر دے ماری اور کہا درویش نظام الدین! حضرت شیخ فریدالدین مسعودؒ نے تم کو نعمتِ باطنی عنایت کی ہے، لیکن تمھارے فقرِ ظاہری کی دیگ کو میں نے توڑ دیا[۱]۔ اس کے بعد حضرت کی خدمت میں فتوحات اور نذرانہ و

---

[۱] ملاحظہ ہو سیر العارفین ص ۶۹۔ سیر الاولیا میں یہ واقعہ قدرے تفاوت سے درج ہے اور لکھا ہے کہ اس درویش نے حضرت سلطان المشائخ کی تنگی دیکھ کر آپ کے ایک رفیق کو بارہ جیتل دیے اور اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ (سیر الاولیا ص ۱۰۳)

شکرانہ کی اس قدر آمد شروع ہوئی کہ حد حساب سے باہر تھی۔

خدا معلوم اس قصّہ میں کس قدر صداقت ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں حضرت کی ظاہری حالت میں زمین آسمان کا فرق آگیا۔ اور اب آپ کے دروازے پر عقیدت مندوں کا اس طرح اژدحام شروع ہوا کہ شاید ہی سلطنتِ دہلی میں کسی شیخ کے در پر ہوا ہو۔ ایک وجہ اس کی یہ تھی کہ غیاث پور کے قریب ہی کیلوکھری میں بلبن کے جانشین کیقباد نے قیام شروع کیا اور اس جگہ امرا و ارکینِ سلطنت کا ہجوم ہو گیا۔ فوادالفواد میں حضرت کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ جب کیقباد نے نیا شہر آباد کیا تو پھر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ میرے پاس آنے شروع ہوئے اور امراء اور دوسرے لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ میں نے فیصلہ کیا کہ ترکِ سکونت کر کے شہر کے اندر چلا جاؤں گا۔ لیکن اسی دن ایک جوان میرے پاس آیا[1]۔ اور آتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

آں روز کہ مہ شدی نمے دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہی شدُ!

اور کہا کہ اس میں تو کوئی خوبی نہیں کہ خلقت سے گوشہ نشینی اختیار کر کے یادِ الٰہی کی جائے۔ قوت اور حوصلہ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ خلقت کے اندر رہ کر یادِ الٰہی جاری رہے۔

اس پر سلطان المشائخ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور مریدوں اور عقیدتمندوں کا جو اژدحام تھا وہ جاری رہا۔ آپ کے ہاں ہر روز ہزاروں کی نذر نیاز آتی لیکن آپ اسے فوراً خرچ کر دیتے اور کوئی حاجت مند آپ کے دروازے سے مایوس نہ جاتا۔ سیرت نظامی (اردو) میں منقول ہے کہ "تین ہزار علماء و فضلا علاوہ طالب علموں اور حافظوں کے اور دو سو قوال ہمیشہ آپ کی

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۴۲

سرکار سے پرورش پاتے تھے اور دیگر پروردگان آنجناب کا تو کچھ شمار نہیں" آپ کو اپنی زندگی میں جو اقتدار اور دبدبہ حاصل ہُوا' وہ ہندوستان کے شاید ہی کسی اور اہلِ طریقت بزرگ کو نصیب ہُوا ہوگا۔ شہر کے عمائد و امرا اور عوام آپ کے مُرید تھے اور بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ آپ سے خم کھاتے تھے۔

شاہانِ عصر اور سُلطان المشائخ

آپ کے ابتدائی اَیام عہدِ غلاماں میں بسر ہوئے' لیکن آپ کو زیادہ عروج خلجیوں کی بادشاہت میں ہُوا۔ خاندانِ خلجی کا سب سے بااقتدار بادشاہ علاء الدین خلجی علما و اہلِ شرع کی پروا نہ کرتا تھا' لیکن شاید وہ بھی درویشوں کی بددُعا کا قائل تھا۔ اس کی تخت نشینی سے ایک دو سال پہلے سیدی مولہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا' جس نے درویشوں کا اثر و اقتدار بہت بڑھا دیا تھا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ جلال الدین خلجی نے بڑے حلم و تحمل کے باوجود اس درویش کی سازشوں سے ڈر کر اس کی موت کا سامان کروایا۔ لیکن جب اس کے قتل کے بعد آندھی اور گرد و غبار کا طوفان اُٹھا تو خود ہی اس کا قائل ہو گیا۔ اخبار الاخیار میں سیدی مولہ کی نسبت ہے:-

"و او را قلندرانِ شیخ ابُوبکر طوسی در زمانِ سلطان جلال الدین خلجی گشتند و روزِ قتلِ او باد و غبار بے اندازہ شد۔ و عالم تاریک گشت۔ گویا کہ قیامت قائم شد و سلطان جلال الدین را بمشاہدہ ایں حال با وے اعتقادے کہ نبود پیدا شد۔" (ص ۷۳)

اور جب اس کے ایک دو سال بعد سلطان جلال الدین خود قتل ہُوا تو لوگ ضرور کہتے ہوں گے کہ اسے درویش آزاری کی سزا ملی ہے۔ چنانچہ عجب نہیں علاء الدین خلجی بھی اس خیال سے متاثر ہُوا ہو اور حضرت سلطان المشائخ کی خواہشات کا اس نے جو احترام کیا' اس میں اس خیال کو بھی کچھ دخل ہو!

سلطان علاء الدین خلجی نے دو ایک مرتبہ حضرت سے ملنے کی خواہش کی'

لیکن آپ نے ٹال دیا۔ سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ نے بقصدِ امتحان چند سوال لکھ کر اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کے ہاتھ حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجے اور ان کے جواب مانگے۔ جب وہ کاغذ شیخ کو ملا تو انھوں نے اُسے کھولا بھی نہیں اور حاضرین سے کہا کہ درویشوں کو بادشاہوں سے کیا کام۔ میں درویش ہوں اور شہر کے ایک گوشے میں دُنیا سے الگ تھلگ بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دُعا کرتا رہتا ہوں۔ اگر بادشاہ اس وجہ سے مجھے کچھ کہے گا تو میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں خود شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ لیکن شیخ نے کہلا بھیجا کہ میں غائبانہ دُعا کرتا ہوں اور غائبانہ دُعا میں بڑا اثر ہے۔ جب اس کے بعد بھی سلطان نے آنے پر اصرار کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اس فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔[1]

ایک دفعہ علاءالدین نے ملک کافور کو ورنگل کی فتح کے لیے بھیجا لیکن ایک مُدت تک اُدھر سے کوئی خبر نہ آئی اور سلطان کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین کو سلطان المشائخ کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیجا کہ لشکرِ اسلام کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ آپ کو اسلام کا غم مجھ سے زیادہ ہے۔ اگر آپ پر نورِ باطن سے کوئی حقیقت روشن ہوئی ہو تو مجھے بھی اس سے مطلع کریں۔ سلطان المشائخ نے بادشاہ کا پیغام سُن کر کہا کہ یہ فتح کیا چیز ہے ہم تو دوسری فتحوں کے بھی امیدوار ہیں۔ شاہی قاصدوں نے

---

[1] ملاحظہ ہو سیر الاولیا صفحہ ۱۱۹ و ۱۲۰۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود اسی کتاب میں سلطان علاءالدین کی قساوتِ قلبی کی اس لیے شکایت کی گئی ہے کہ اس نے حضرت سلطان المشائخ سے ملنے کی کبھی خواہش نہ کی (صفحہ ۲۴۵) اور برنی بھی یہی شکایت کرتا ہے۔

یہ بشارت بادشاہ تک پہنچائی۔ جسے سُن کر وہ خوش ہو گیا اور اتفاق سے اُسی شام کو مَلک کافور کے نمائندے ورنگل کا فتح نامہ لے کر آ گئے۔[۱]

علاء الدین کا بڑا لڑکا اور ولی عہد خضر خاں سلطان المشائخ کا مُرید تھا۔ لیکن مُلک کافور نے اسے اندھا کر کے نورِ دیدہ کے ساتھ تخت و تاج سے بھی محروم کیا۔ اور بالآخر مَلک کافور کا خاتمہ کر کے قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہُوا۔ وہ شیخ زادہ جام کا جو حضرت سلطان المشائخ کے مخالف تھے، معتقد تھا۔ مشہور ہے کہ جب مُلک کافور خاندان علائی کا خاتمہ کر رہا تھا تو قطب الدین کی والدہ نے شیخ زادہ کے پاس آدمی بھیج کر اپنی مصیبتیں بیان کیں۔ انھوں نے فرمایا: "غم مدار و منتظر لطیفۂ غیبی باش"۔ چنانچہ قطب الدین کامیاب اور مَلک کافور ناکام ہُوا۔ بادشاہ کے شیخ زادہ جام سے فرطِ اعتقاد کے علاوہ سلطان المشائخ سے سوءِ ظن کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو گئی کہ وہ قطب الدین کے حریف اور صحیح وارث تخت و تاج خضر خاں کے مُرشد و مُربّی تھے۔ چنانچہ قطب الدین نے آپ کا زور توڑنے کی بڑی کوشش کی۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح سہروردیؒ کو ملتان سے اس لیے بُلایا کہ شیخ کی بارگاہ کے بالمقابل ایک دوسری بارگاہ قائم ہو۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کے تعلقات اتنے خوشگوار ہو گئے کہ بادشاہ کی یہ چال ناکام رہی۔ تاہم تخت و سجادہ کی چپقلش جاری رہی اور بالآخر قطب الدین نے آپ کے پاس شکایت بھیجی کہ چاند رات کو دہلی کے سب مشائخ مجھے سلام کرنے اور نئے چاند کی دُعا دینے دربار میں آتے ہیں، لیکن آپ فقط اپنے غلام خواجہ اقبال کو بھیج دیتے ہیں۔ حضرت نے اپنے نہ آنے کی توجیہ کر دی۔ لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ اگر شیخ نظام الدین آیندہ ماہِ نو کی تہنیت کو حاضر نہ ہوں تو بزور ان کو حاضر کیا جائے۔ سلطان المشائخ کے سارے مخلص اس کشمکش سے

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۳۳۲

مشوّش تھے، لیکن آپ نے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ جب چاند رات آن پہنچی تو آپ اطمینان سے خانقاہ میں مقیم رہے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے۔

صبح کو خبر ملی کہ رات کو قطب الدین مُبارک شاہ اپنے چاہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہُوا[1] اور خسرو ناصر الدین خسرو خاں کے نام سے تخت نشین ہُوا۔

خسرو خاں حضرت شیخ کے اثر کا قائل تھا۔ چنانچہ جب غازی مُلک کی فوج اسے شکست دینے کے لیے آئی تو اس نے پانچ لاکھ تنکے آپ کی خدمت میں حصولِ دُعا کے لیے بھیجے، لیکن سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو کی بدعنوانیاں کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان میں اسلام کو نئی زندگی ملی۔ بدقسمتی سے سلطان اور شیخ میں کسی قدر کشیدگی پیدا ہو گئی ـــــ ایک تو شاید بادشاہ کو اس امر کا ملال ہو گا کہ آپ نے خسرو کے پانچ لاکھ تنکے بیت المال کو کیوں نہ واپس کیے۔ دوسرے بعض لوگوں نے جو سماع کے خلاف تھے[2]، بادشاہ سے شکایت کی کہ

---

[1] سیر الاولیا ص ۱۳۴۔ یہ تفصیلات سیر الاولیا میں ہیں۔ انھیں درج کر کے مؤلفِ کتاب نے سلطان قطب الدین کی دھمکی اور اس کے عبرت ناک انجام کی نسبت بطور تبصرہ سعدی کا شعر نقل کیا ہے ؎ اے بد بہک چو نشستی بجائے خویش ٭ باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش
لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ چاند رات کو خود حضرت سلطان المشائخ خانقاہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے!

[2] سلطان المشائخ پر سماع کی وجہ سے اس سے پہلے بھی اعتراض ہوتا تھا مثلاً نصاب الاحتساب کے مصنف خواجہ ضیاء الدین سنامی کی نسبت اخبار الاخیار میں لکھا ہے "معاصر نظام الدین اولیا بود۔ دائم بہ شیخ از جہتِ سماع احتساب کردے۔ و شیخ باوے جز بہ معذرت و انقیاد پیش نیامدے"۔ (ص ۱۰۹)

شیخ نظام الدین مع جمیع مُریدوں کے سماع سُنتے ہیں۔ بادشاہ کو واجب ہے کہ علما کو طلب کر کے ایک محضر منعقد کرائے اور انھیں اس فعلِ نامشروع سے باز رکھے۔

چنانچہ غیاث الدین تغلق نے قلعہ تغلق آباد میں حضرت سلطان المشائخ اور سلطنت کے مشہور علما و شیوخ کو بُلایا اور سماع کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔ کہتے ہیں، دو سو ترپن ۲۵۳ علما موجود تھے[1]۔ قاضی جلال الدین ولوالجی اور شیخ زادہ جام سماع پر اعتراض کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے بحث میں بڑی گرمی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہُوا کہ حضرت سلطان المشائخ کے مخالفین نے زور شور سے اعتراض کیے تو بادشاہ نے کہا کہ اِس قدر جوش و خروش نہ کرو۔ سُنو کہ شیخ کیا فرماتے ہیں۔ معترضین نے اپنے اعتراضات کی بنا امام ابُو حنیفہؒ کے ارشادات پر رکھی اور سُلطان المشائخ نے سماع کے جواز کے حق میں بعض روایاتِ نبوی سے مدد لینی چاہی[2]۔ اس دوران میں بادشاہ نے شیخ بہاء الدین زکریا مُلتانیؒ کے نواسے شیخ علم الدین سے جو عالم بھی تھے

---

[1] سیر العارفین ص ۸۹

[2] یہ تفصیلات سیر الاولیا سے ماخوذ ہیں۔ فرشتہ جس نے کئی جزئیات اس پر اضافہ کی ہیں۔ لکھتا ہے کہ سلطان المشائخ نے حدیثِ نبوی "السماع مباح لاہلہ" کو اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں پیش کیا۔ اس پر الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں مولنا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں۔ "یہ حدیث نہیں بلکہ امام غزالی کا قول ہے، جو احیاء العلوم میں فتوے کے طور پر منقول ہے۔ غالباً فرشتہ نے اسے حدیث کہنے میں غلطی کی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ حضرت مستدل کو غلط فہمی ہوئی ہو۔" اس پر مولنا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: "خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے بیٹھے ہندو شاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اڑائی کہ امام غزالی کا قول یجوز لاہلہ ولا یجوز لغیر اہلہ کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا۔ کیا تماشا ہے دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے۔" سیر الاولیا میں یہ اندراج

[باقی اگلے صفحے پر]

اور اسلامی ممالک کا سفر بھی کر چکے تھے، استفسار کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ جو لوگ سماع دل سے سُنتے ہیں ان کے لیے مباح ہے اور جو از رُوے نفس سُنتے ہیں، ان کے لیے حرام ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ بغداد، شام، روم میں مشائخ سماع سُنتے ہیں۔ بعض دف اور شبانہ سے بھی۔ اور انھیں کوئی منع نہیں کرتا۔

موجود نہیں۔ لیکن وہاں دو اُور رسالوں کے حوالے دیے گئے ہیں، جن میں اس واقعہ کی تفصیلات درج ہیں۔ یعنی مولانا فخر الدین رازی کی کشف المفتاح من وجوہ السماع اور ضیاء الدین برنی کا حیرت نامہ۔ فرشتہ نے اپنی کتاب میں کئی تفصیلات سیر الاولیا سے زائد دی ہیں۔ اس کے علاوہ خود سیر الاولیا سے واضح ہوتا ہے کہ بحث میں سلطان المشائخ نے انحصار حدیثوں پر کیا ہے۔ اور مخالفین نے فقہی فتاوے پر زور دیا۔ (بقول سیر الاولیا) حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا: "اس بحث میں مجھے ایک بات نہایت عجیب معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ معرضِ حجت میں وہ صحیح احادیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلم نہیں سنتے اور یہی کہتے جاتے ہیں کہ ہمارے شہر میں فقہ کا رواج مقدم ہے .... جب کوئی صحیح حدیث بیان کی جاتی، وہ منع کرتے اور کہتے کہ اس حدیث کی آڑ شافعی نے لی ہے۔ اور وہ ہمارے علما کے دشمن ہیں۔ اس لیے ہم اس حدیث و نہیں سُنتے۔" اب اگر فرشتہ کے بیان کو ٹھکرا دیں تو آخر وہ کون سی صحیح حدیث ہے جس سے سماع کا جواز ثابت ہوتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے دوسرے کمالاتِ رُوحانی ہی نہیں علمی مرتبہ بھی بڑے احترام کے لائق ہے، لیکن پُرانے زمانے میں طباعت کی عدم موجودگی کی وجہ سے کتابوں کی کمی تھی (اور حضرت سلطان المشائخ تو اپنے علمی ذوق و شوق کے باوجود ایک زمانے میں کتابیں خریدنے کے خاص طور پر خلاف ہو گئے تھے (سیر الاولیا ص ۱۲۸) اس کے علاوہ کڑا تنقیدی نقطۂ نظر بھی عام نہ تھا۔ کسی ایک آدھ حوالے میں سہو ہو جانا خلافِ قیاس نہیں۔ سیر الاولیا میں تو حضرت سلطان المشائخ کا یہ بیان نقل ہوا ہے:۔ "و عجب امروز معائنہ شد کہ معرضِ حجت احادیثِ صحیح حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے شنوند۔ ہمیں مے گویند کہ در شہر ما عمل بر روایت فقہ مقدم است بر حدیث و ایں چنیں سخنے کسانے گویند کہ ایشاں را بر احادیثِ

[باقی اگلے صفحے پر]

بادشاہ نے یہ سُنا تو خاموش ہو گیا۔ اس پر مولنا جلال الدین نے پھر کہا کہ بادشاہ کو لازم ہے کہ سماع کی حُرمت کا حکم دے اور اس بارے میں امام اعظم کے مذہب کو ملحوظ رکھے، لیکن سلطان المشائخ نے بادشاہ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں کوئی حُکم نہ دیں۔

یہ بحث صبح دس بجے سے ظہر کے وقت تک جاری رہی۔ نتیجۂ بحث کی نسبت سیر الاولیا میں دو رائیں درج ہیں۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ نے کوئی حکم نہ دیا۔ یعنی سلطان المشائخ کا مشورہ قبول کر لیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ حضرت سلطان المشائخ سماع سُنیں اور انھیں کوئی منع نہ کرے، لیکن دوسرے فرقوں مثلاً قلندروں اور حیدریوں کو سماع سُننے سے منع کریں۔ کیونکہ وہ محض حظِ نفسانی کی خاطر سُنتے ہیں۔ سیر الاولیا کے مصنف نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مجلس سے فارغ ہو کر بادشاہ نے حضرت سلطان المشائخ کو بڑی تعظیم و تکریم سے رخصت کیا بلکہ محضر کے ۱۲ روز بعد ان کے مخالف قاضی جلال الدین کو عہدۂ قضا سے معزول کیا۔

اس روایت سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ آخر تک سماع کے قائل اور اس پر عامل رہے۔ لیکن اس امر کی مُستند معاصرانہ شہادت

بقیہ نوٹ از صفحہ ۲۳۹

رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم عبور نباشد۔"

لیکن سیر العارفین کے مطالعے سے خیال ہوتا ہے کہ معاملہ ذرا زیادہ پیچیدہ تھا اور بحث کی تہ میں اجتہادِ شخصی کا مسئلہ تھا۔ جس نے بعد میں اہلِ حدیث اور حنفیوں کے درمیان خاص اہمیت اختیار کر لی تھی۔ شیخ جمالی لکھتے ہیں:۔

حضرت شیخ تمسک بہ حدیثِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مے نمود۔ قاضی مذکور گفت: "تو مجتہد نیستی کہ تمسک بہ حدیث نمائی۔ مردی مقلد۔ روایتے از ابو حنیفہ بیار تا قولِ تو بمعرضِ قبول افتد۔" شیخ فرمود، "سبحان اللہ! کہ باوجود قولِ مصطفوی از من قولِ ابو حنیفہ مے خواہند۔"

موجود ہے کہ اخیر عمر میں سماع بالخصوص سماع بالمزامیر کی نسبت حضرت سلطان المشائخ کا نقطۂ نظر شرع سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ آپ کے ملفوظات کا سب سے مکمل مجموعہ فوائد الفواد ہے۔ جسے امیر حسن سنجری نے ترتیب دیا اور جسے تمام نظامی حضرات آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ اس میں بالتفصیل لکھا ہے:۔ (ترجمہ)

"پھر سماع کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ شاید آپ کو حکم ہوا ہے کہ جس وقت آپ چاہیں سماع سنیں۔ آپ پر حلال ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ جو چیز حرام ہے وہ کسی کے حکم سے حلال نہیں ہو سکتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہو سکتی۔ اب ہم مسئلہ مختلف فیہ کو لیتے ہیں۔ سو سماع ہی کو لو۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے موافق برخلاف ہمارے علما کے مباح بمعہ دف و سارنگی ہے اس اختلاف میں حاکم جو حکم کرے وہی ہو گا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا انھیں دنوں میں بعض درویشوں نے چنگ و رباب اور بانسریوں کا استعمال مجمع میں کیا اور رقص کیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے اچھا نہ کیا جو نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے۔ بعدازاں ایک نے کہا کہ جب وہ اس مقام سے باہر نکلے تو ان سے پوچھا گیا کہ اس مجلس میں تو بانسریاں بجائی گئیں۔ تو جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مستغرق تھے کہ ہمیں معلوم نہ ہوا کہ یہاں بانسریاں ہیں بھی یا نہیں۔ جب خواجہ صاحب نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ تو کوئی معقول جواب نہیں۔" (ص ۱۰۱)

سلطان المشائخ کے ضمن میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انھوں نے اپنی جانشینی اس بزرگ کو تفویض کی جو علانیہ سماع بالمزامیر کا منکر تھا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات فروری یا مارچ ۱۳۲۵ء میں ہوئی اور اس کے چند ہی روز بعد یعنی اپریل کی تیسری کو سلطان المشائخ بھی انتقال فرما گئے۔ ان کی طویل علالت کے دوران میں شیخ رکن الدین ملتانی موجود تھے۔ انھی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مزار دہلی میں مرجع خاص و عام ہے۔

سلطان المشائخ کا مرتبہ

ہندوستان کے مشائخ میں حضرت سلطان المشائخ کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ انھیں داتا گنج بخش یا حضرت خواجہ اجمیری کی طرح شرفِ اولیت حاصل نہیں۔ نہ ہی ان کی زندگی تبلیغی کوششوں کے لیے اس طرح ممتاز ہے، جس طرح ان کے مرشد بابا فرید یا دوسرے پیرانِ عظام مثلاً امیر کبیر ہمدانی، شیخ بہاء الدین زکریا یا حضرت نور قطب العالم بنگالی کی۔ لیکن اس کے باوجود جو اثر و اقتدار انھیں حاصل ہوا، بہت کم بزرگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ بقول امیر خسروؔ ؎

در عالمِ دل جہاں پناہے	در حجرۂ فقر بادشاہے
شاہانش بخاکپائے محتاج	شہنشہ بے سریر و بے تاج

جب سلطان المشائخ نے ظہور کیا، اس وقت تصوف کا ابتدائی زاہدانہ دور ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ طریقِ زندگی فقط وہی لوگ اختیار نہ کرتے تھے، جو سخت سے سخت ریاضتیں اور مشقتیں سہتے اور دنیا کے دُوں سے فقط قوت لایموت لے کر دَورِ آخرت میں اپنے حصے کے منتظر رہتے۔ اب تصوف اور درویشی کی نئی ترجمانی ہو چکی تھی اور شیخ محی الدین ابنِ عربی اور ان کے ہم خیال کہہ رہے تھے کہ دنیا کے ظاہری نظام کے ساتھ ساتھ ایک باطنی نظام بھی ہے، جو قطبوں، ابدالوں، اوتادوں کے سرپر قائم ہے۔ شیخ ابنِ عربی نے فتوحاتِ مکیہ میں کئی جگہ اس نظریے کی توضیح کی ہے۔ اور فرشتہ ناقل ہے کہ ابنِ عربی کی تصانیف حضرت سلطان المشائخ کے زیرِ مطالعہ تھیں۔ (پیوستہ دل انوار منزل بہ کتب معتبرہ تصوف مثل فصوص الحکم و مواقع النجوم و شروح آنہا مشغول مے داشت[1]) انھوں نے دو ایک جگہ مقاماتِ اولیا کے متعلق جو ارشادات کیے ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی ابنِ عربی کے نظریے سے متاثر تھے۔ بلکہ انھوں نے کہا: ”جب

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۹۱

ولی مقامِ قطبیت اور غوثیت و فردیت کو طے کر کے مرتبۂ محبوبیت کو پہنچتا ہے تو اس کی ذات مظہرِ الٰہی ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ بھی ارادۃ اللہ ہوتا ہے[1]"۔

جب بابا فرید نے انھیں خلعتِ خلافت سے سرفراز کیا تو انھیں "نظام الدین والدُنیا" کہہ کر خطاب کیا تھا اور شاید یہ مُرشد کے ارشاد اور ابنِ عربی کی تعلیمات کا اثر تھا کہ سلطان المشائخؒ نے زندگی ایک تارک الدنیا درویش کی طرح نہیں گزاری بلکہ شاہانِ وقت کے بالمقابل[2] بھی اپنی پوزیشن اس طرح برقرار رکھی جس طرح ابنِ عربی کی اسکیم کے تحت قطبوں اور ابدالوں کی تھی ؎

غوثِ عالم، نظامِ ملت و دیں
قطبِ ہفت آسمان و ہفت زمیں

انیس الحاشقین میں سلطان المشائخؒ کی اپنی ایک رباعی نقل کی گئی ہے۔ جس سے ان کے مافیہا کا کچھ اندازہ ہوتا ہے ؎

---

[1] ملاحظہ ہو سیرتِ نظامی صر ۱۴۲-۱۴۳ اس کے علاوہ حضرت سلطان المشائخؒ کی مجلس میں قطب، اوتاد، ابدال اور اولیا کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو فوائدُ الفواد صر ۲۵۳

[2] اس کے علاوہ حضرت اپنے مریدوں کو بھی کبھی جس طرح شانِ جلالی دکھاتے تھے، اس کے لیے شیخ برہان الدین غریب کا واقعہ ملاحظہ ہو (اخبار الاخیار صر ۹۴) لیکن آپ دوسروں خواہ وہ مخالف ہی کیوں نہ ہوں، جس بلند حوصلگی اور وسعتِ قلبی کے ساتھ سلوک کرتے، اس کا اندازہ شیخ رکن الدین ابوالفتح (اخبار الاخیار صر ۶۵) اور اس سے بھی زیادہ خواجہ ضیاء الدین سنامی (اخبار الاخیار صر ۱۰۹) سے آپ کے حسنِ سلوک سے ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ اپنے نظام اور اپنی پوزیشن کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے لیکن اہلِ علم اور مخلص مخالفوں کی آپ عزت کرتے تھے۔ اور جو طویل اقتباسات ہم نے سماع کے متعلق فوائدُ الفواد اور افضل الفواد سے دیے ہیں۔ ان سے ظاہر ہو گیا کہ اس معاملے میں بھی آپ کا وہ نقطۂ نظر نہ تھا جو سماع کے بعض شائق آپ سے منسوب کرتے ہیں۔

در ملکِ قناعت بجہاں سلطانیم کیخسروِ بے حاجب و بے دربانیم
از لذّتِ فاقہ ذوقہا مے گیریم از دولتِ فقر ملکہا مے رانیم

حضرت سلطان المشائخ نے تو اس امر کا کبھی دعوئے نہیں کیا لیکن عام طور پر انھیں اپنے زمانے کا قطب سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال تھا کہ ان کے علاقے کا نظام ان کے سر پر قائم تھا۔ فتوح السلاطین میں عصامی نے (عہدِ محمد تغلق میں) دہلی کی بربادی کے تین اسباب لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب حضرت خواجہ سلطان المشائخ کے سایۂ عاطفت اور ان کے "فیضِ بلانوشی" سے محروم ہو جانا ہے

بہ ہر ملک گرچہ امیرے بود و لیکن درو پناہ فقیرے بود
امیراں بہ کشور اگر سر برند فقیراں بلانوشِ کشور بوند
گر او تاد نبود بہ روے زمیں نماند بہ پا خیمۂ ہفتمیں
چو خواہد خداوندِ لیل و نہار کہ از مرز و بوم بر آرد دمار
بہ فرمانِ ایزد ازاں مرز و بوم نختیں بر آرند مرداں قدوم
وزاں پس یکے ظالمے را خدا کند اندراں ملک فرمانروا
شنیدم ز پیران اختر سعید کہ چوں وقت ابطال دہلی رسید
نظام الحق آں پیرِ ثابت قدم ملاذِ ملوک و پناہِ اُمم
محمد کہ شد خاتمِ اولیا چو ختم ہمہ انبیا مصطفٰے
ز خاکِ درش خسرواں تاج دار سرِ حاسد انش شدہ تاج دار
سلاطیں بر ایوان او بار خواہ بر ایوانِ او سودہ خاناں جباہ
بہ درگاہ آں شاہِ ملکِ سلوک بہ چوبک زنی گشتہ راضی ملوک
چہ گوید کسے وصفِ آں آستاں چہ داند زمیں درجۂ آسماں
نداند کسے قدرِ او جز خدا بود آگہ از رہرواں راہنما
خدارا یکے بود از دوستاں مقرر بدو ملکِ ہندوستاں

نخستیں ہماں مردِ فرزانہ فر | قدم زد ز دہلی بہ ملکِ دِگر
وزاں پس نشد آں شہر و کشور خراب | دراں ملک شد فتنہ کامیاب

ابن عربی اور سلطان المشائخ نے اپنے خیالات کی تائید میں جو احادیث پیش کی ہیں، ان کی صحت مشتبہ ہے۔ اور جو دلائل اس باطنی نظام کے حق میں ہیں، وہ بھی معقولیت سے بالا ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی علمی قابلیت، خداداد سمجھ، وجیہ شخصیت اور مذاقِ سلیم کی بنا پر اگر سلطان المشائخ روحانی دائرے سے نکل کر کسی اور سمت قدم بڑھاتے تب بھی وہ میرِ کارواں ہی ہوتے۔ انھوں نے علم و فن کی تکمیل دار الخلافے کے بہترین علما سے کی تھی۔ اور اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو امیر خسرو اور امیر حسن سجزی جو شروع میں ان کے مرید نہیں شاگرد تھے، ان کی معلمانہ قابلیت کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کی شروع میں یہ خواہش تھی کہ "کہیں کا قاضی ہو جاؤں" (سیر الاولیا ص ۱۵۰) اور علومِ شرعی و فقہی کو آپ نے بڑی محنت اور تن دہی سے حاصل کیا۔ اپنے ہم درسوں میں سب سے تیز طبع اور دانشمند مشہور تھے۔ اور بحث مباحثوں میں اتنا حصّہ لیتے تھے کہ اس زمانے میں آپ کو "مولٰنا نظام الدین بحاث اور محفل شکن" کا خطاب ملا ہوا تھا (سیر الاولیا ص ۹۰) اس کے علاوہ ان کی روزمرّہ کی گفتگو فوائد الفواد اور افضل الفواد میں محفوظ ہے جس سے ان کی وسعتِ علمی، وسیع واقفیت[1] اور مذاقِ سلیم کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے زمانے میں واقعات کی صحت پرکھنے کی وہ سہولتیں جو آج میسر ہیں نہ

---

[1] سلطان المشائخ کی معلومات اور گوناگوں دلچسپیوں کے لیے سیر الاولیا کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ حضرت کے خواہرزادہ خواجہ رفیع الدین کے ضمن میں (جو حضرت کی خانقاہ و روضہ کے متولی ہوئے تھے) لکھا ہے: "آپ کو تیر و کمان، سیاحت اور کشتی کا بہت شوق تھا سلطان المشائخ از روئے شفقت اسی بارے میں آپ کو ترغیب دیا کرتے اور ان ہنروں کی بابت جو کہ شرعاً جائز ہیں، پوچھا کرتے۔ بلکہ ان کی باریکیاں خود سمجھایا کرتے۔" (ص ۱۸۰)

تھیں مگر فوائد الفواد اٹھا کر دیکھیں بلا مبالغہ سیرت، حدیث اور تاریخ کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔

ان کے زمانے میں دہلی علما و فضلا و شعرا و ادبا سے پھٹی پڑتی تھی۔ لیکن کتنے اہلِ نظر تھے جو اس در کے حلقہ بگوش نہ تھے ؎

کو دیدہ کز فراقِ رُخ تو در آب نیست
کو دل کہ در کشاکشِ عشقت خراب نیست

یہ صحیح ہے کہ اشاعتِ اسلام کے معاملے میں سلطان المشائخ اپنے مرشد سے بہت پیچھے ہیں۔ تواریخ میں ان کے ہاتھ پر فقط ایک آدمی[1] کے مسلمان ہونے کا سراغ ملتا ہے، لیکن وہ اشاعتِ مذہب سے غافل نہ تھے۔ فوائد الفواد میں دو ایک جگہ ہندوؤں کے اسلام سے دور رہنے کا ذکر ہے۔ اور ایک دفعہ تو خواجہ صاحب نے آنکھوں میں آنسو لاکر اس امر کا افسوس کیا کہ ہندوؤں پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ امیر حسن لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"ایک غلام مرید آیا اور ایک ہندو کو ہمراہ لایا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ جب دونوں بیٹھ گئے تو خواجہ صاحب نے اس غلام سے پوچھا کہ آیا تیرا بھائی مسلمانی سے کچھ رغبت رکھتا ہے۔ عرض کی میں اس مطلب کے لیے اسے یہاں لایا ہوں کہ جناب کی نظرِ التفات سے وہ مسلمان ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر فرمایا، اس قوم پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کسی صالح مرد کی صحبت میں آیا جایا کریں تو شاید اس کی برکت سے مسلمان ہو جائیں۔" (فوائد الفواد ص ۱۸۲)

---

[1] تلنگانہ کا ایک ہندو تھا، جس کا ہندوانی نام کنو تھا۔ خواجہ جہاں ملک احمد ایاز کے ہمراہ سلطان المشائخ کی مجلس میں آنے جانے لگا۔ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اور بالآخر خان جہاں کے نام سے سلطان فیروز تغلق کا وزیر اعظم بنا۔

فوائد الفواد کے اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ کئی ہندو اسلام کی حقانیت کے قائل تھے، لیکن بعض موانع (مثلاً برادری کی مخالفت) کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ امیر حسن لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ جو ہندو کلمہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ کو ایک جانے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی قائل ہو، لیکن جب مسلمان آئیں تو چپ ہو جائے اس کا انجام کیسے ہو۔ خواجہ صاحب نے فرمایا اس کا معاملہ حق سے ہے خواہ اسے بخشے خواہ عذاب دے۔

پھر فرمایا کہ بعض ہندوؤں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام سچا ہے، لیکن پھر بھی مسلمان نہیں ہوتے۔" (فوائد الفواد ص ۱۳۵)

سلطان المشائخ کے ملفوظات کا مستند مجموعہ فوائد الفواد ہے، جسے ان کے مرید اور مشہور فارسی شاعر حسن سنجری نے ترتیب دیا۔ ہم نے اس سے جا بجا، نہ صرف سلطان المشائخ بلکہ دوسرے بزرگانِ دین اور اہلِ علم کے حالات کے لیے استفادہ کیا ہے۔ آپ کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ افضل الفوائد ہے، جسے امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن جو وضعی معلوم ہوتا ہے۔ اخبار الاخیار میں ایک اور مجموعۂ ملفوظات (مسمی بہ تحفۃ الابرار و کرامت الاخیار) کا ذکر ملتا ہے، جسے شیخ کبیر بابا فریدؒ کے نواسے خواجہ عزیز الدین صوفی نے ترتیب دیا، لیکن یہ مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر فوائد الفواد اور سلطان المشائخ کے مرشد شیخ کبیرؒ کے مبینہ ملفوظات بغور پڑھیں تو ان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب اصلاحِ خیالات کے لیے مردِ صالح کی صحبت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور بابا صاحب نے اشاعتِ مذہب اور تبدیلِ عقائد کی جو مثالیں

لہ فوائد الفواد کے بعد حضراتِ چشت کے حال میں بہترین تالیف سیر الاولیا ہے، جسے سلطان المشائخ کے عقیدت مند اور حضرت چراغ دہلی کے مرید امیر خورد نے ۷۵۲ھ میں ترتیب دیا۔

یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں اظہارِ کرامت کو بڑا دخل ہے۔ شاید اس اختلاف کی وجہ ان بزرگوں کے ماحول کا اختلاف ہے۔ حضرت بابا صاحب کو جن لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا وہ سادہ اور ضعیف الاعتقاد تھے۔ ان پر کرامات کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ بابا صاحب اپنے تصرفات کی بنا پر ان میں شاندار نتائج پیدا کر سکے۔ لیکن جو لوگ دار الخلافے میں رہتے تھے، وہ اس قدر سادہ نہ تھے۔ ان کے اعتقادات بدلنا اس قدر آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک عرصے کا اختلاط درکار تھا۔

حضرت خواجہ صاحب جو طویل صحبتِ صالح کی ضرورت سمجھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی نظروں میں مسلمان ہونے کے لیے ایک بڑا بلند معیار برقرار رکھنا ضروری تھا۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت خواجہ صاحب نے اِس مقصد کی توضیح کے لیے کئی مرتبہ بایزید اور یہودی کی حکایت اپنے سامعین سے بیان کی اور افسوس کیا کہ عام مسلمان دوسری قوموں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ افضل الفوائد میں ہے (ترجمہ)

"پھر اسلام کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ زبان مبارک سے فرمایا کہ اے درویش! اسلام کا نام لے لینا سہل ہے، لیکن اس کے فرائض کا انجام دینا مشکل ہے۔ پھر فرمایا کہ خواجہ بایزید بسطامیؒ نے ستر سال تک نفس کو مجاہدہ سے مارا .... لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ چونکہ میں مسلمان کہلاتا ہوں، اس لیے مجھے مسلمانی کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ یہودی سے پوچھا گیا کہ تجھے خواجہ بایزید سے اتنی اُلفت ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ اس نے کہا اگر اس بات کا نام مسلمانی ہے جو تم کرتے ہو تو ایسی مسلمانی سے مجھے شرم آتی ہے۔ اور اگر مسلمانی وہ ہے جو خواجہ صاحب کرتے ہیں تو

وہ مجھ سے نہیں ہو سکتی"۔

افضل الفوائد کے اندراجات پر شُبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن بالکل یہی واقعہ فوائد الفواد میں بیان ہوا ہے:۔

آنگاہ ہم از نسبت صدق و دیانتداری اسلامیاں حکایت فرمود کہ جہودے بود کہ در جوارِ خانہ بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت۔ چوں بایزید نقل کرد۔ آں جہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمے شوی۔ گفت چہ مسلمان شوم۔ اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت از من نمے آید۔ و اگر این است کہ شما دارید۔ مرا ازیں اسلام عار مے آید! (فوائد الفواد ص ۱۸۳۔۱۸۴)

اگر سلطان المشائخ غیر مسلموں میں اِس طرح اشاعتِ اسلام نہیں کر سکے جس طرح ان کے مُرشد نے کی (جو غالباً دار الخلافے میں ہو ہی نہ سکتی تھی) تو یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے خود مسلمانوں کی اصلاحِ خیالات اور تہذیبِ نفس کی وسیع پیمانے پر کوشش کی۔ اور اس کے علاوہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا، جس کے ماتحت اشاعتِ اسلام کا کام مُلک کے مختلف حصّوں میں سرانجام پاتا رہا۔ گجرات، دکن اور بنگال میں جو بزرگ اسلام لے کر گئے، ان میں مولنا حسام الدین ملتانیؒ اور مولنا کمال الدینؒ، شیخ برُہان الدین غریبؒ اور مولنا سراج الدین عثمانؒ خاص طور پر ممتاز ہیں۔ یہ سارے بزرگ حضرت سلطان المشائخ کے خلفاے کبار میں سے تھے۔ سلطان المشائخ کا یہ کام کم اہم نہیں کہ اُنھوں نے ایسے بزرگوں کی تربیت کی جو مُلک کے مختلف حصوں میں خود ارشاد و ہدایت کا مرکز بن سکتے تھے۔ امیر خسروؒ ان کی بابت لکھتے ہیں ؎

واں مریدانِ رہروانِ یقیں	ہر یکے والیئے ولایتِ دیں
ہمہ شیطان کُش فرشتہ خدم	در رہش برہوا نہادہ قدم
زندہ دارِ شب از دمِ تسبیح	غلغل افگندہ در رواقِ مسیح
ہر سوار آستینِ شرع ساختہ تاج	دلِ شاں عرش و سجدۂ شاں معراج

ضیاء الدین برنی حضرت کے نیک اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس پاک کی برکت اور ان کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل اور شیخ کی ارادت کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ سلطان علاء الدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا۔ خواص و عوام کے دل نے نیکی اختیار کر لی تھی۔

عہدِ علائی کے آخری چند سالوں میں شراب و شاہد، فسق و فجور، قمار بازی، فحاشی، لواطت اور بچہ بازی کا نام بھی آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا۔ اب کبیرہ گناہ لوگوں کو کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری و ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہ ہو سکتے تھے۔ اور خوف کے مارے دکان داروں سے جھوٹ، کم تولنے اور آمیزش کا رواج اٹھ گیا تھا۔ اکثر طالب علموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے، تصوف اور احکامِ طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہو گئی تھی۔ قوۃ القلوب، احیاء العلوم، ترجمہ احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تصوف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح و لوامع قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفواد امیر حسن سنجری کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے۔ زیادہ تر لوگ کتب فروشوں سے سلوک و حقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے۔ کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی نہ لٹکی ہو اور اہلِ تصوف کی کثرتِ خرید کے باعث چمڑے کے طشت اور لوٹے مہنگے ہو گئے تھے (ص ۳۴۵-۳۴۶)

بوعلی قلندرؒ

نظامیہ سلسلہ جو صابریہ طریق کی طرح چشتیہ سلسلے کی ایک شاخ ہے، حضرت سلطان المشائخؒ سے شروع ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی کو بھی سلطان المشائخؒ سے بیعت تھی۔ لیکن شیخ عبد الحق محدث اس روایت کے قائل نہیں۔ قلندر صاحب جو ایک

روایت کے مطابق قطب جمال ہانسویؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ سلطان المشائخ کے ہمعصر تھے۔ آپ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ایک فقیر کے اثر سے درس و تدریس چھوڑ کر جنگل میں نکل گئے اور قلندروں کے آزادانہ طریقے اختیار کر لیے۔ آپ کی زندگی کے کئی واقعات ہیں جنھیں اگر شرع، وضع داری یا اخلاقیات کے ترازو میں تولیں تو ان پر کئی اعتراض ہو سکتے ہیں۔ لیکن دُنیا آپ کو ایک قلندر کے طور پر جانتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص دُنیا چھوڑ دیتا ہے اُسے دنیاداروں کے معیار سے نہیں جانچا جا سکتا۔ آپ کی بیشتر عمر استغراق اور جذب کی حالت میں گزری اور جب رمضان المبارک ۷۲۴ھ میں وفات پائی تو آپ کے پاس کوئی نہ تھا۔ تین روز تک کسی کو پتا نہ چلا کہ آپ رحلت کر گئے ہیں۔ تیسرے روز چند لکڑہارے آئے جنھوں نے نعش مُبارک دیکھی اور کفن دفن کی تیاریاں کیں۔ مزار پانی پت میں ہے۔

آرنلڈ نے لکھا ہے کہ پانی پت کے علاقے میں جو مسلمان راجپوت ہیں، وہ حضرت بوعلی قلندر ہی کی بدولت مشرف باسلام ہوئے اور ان کا مورثِ اعلےٰ امیر سنگھ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہُوا۔

حضرت بوعلیؒ کمالِ جذب کے ساتھ ساتھ صاحبِ تصنیف بھی تھے آپ کی دو تین فارسی مثنویاں اور دیوان چھپ چکا ہے۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے آپ کے مکتوبات کا بھی ذکر کیا ہے اور جو مکتوب اخبار الاخیار میں نقل ہُوا ہے، اس کی زبان بڑی شستہ اور خیالات لطیف و پاکیزہ ہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی دوسری تصانیف آپ سے منسوب ہونے لگی تھیں۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں:-

"و رسالہ دیگر در عوام الناس شہرت دارد کہ اورا حکم نامہ شیخ شرف الدین مے گویند۔
ظاہر آن است کہ از مخترعات عوام است۔ واللہ اعلم۔"

یہ "حکم نامۂ بندگی ملک المشائخ حضرت شیخ شرف بوعلی قلندرؒ" چند صفحوں کا رسالہ ہے۔ اس کے مطابق آپ چالیس برس کی عمر میں دہلی پہنچے۔ علمائے زمانہ

سے مباحثہ ہُوا، لیکن سب آپ کی بزرگی کے قائل ہو گئے اور کوشش کرکے آپ کو
"دہلی کے درس اور فتوے نگاری" کا عہدہ سپرد کیا۔ بیس سال تک آپ نے یہ
شغل جاری رکھا۔ پھر جذبہ نے جوش کیا اور یہ سب کچھ ترک کرکے سیر و سیاحت
کو نکل کھڑے ہوئے۔ اور قلندرانہ وضع اختیار کرلی۔ اثنائے سفر میں شیخ شمس الدین
تبریزی اور مولانا روم سے ملاقات ہوئی اور ان سے جُبہ و دستار حاصل کیا۔
سفر سے واپسی پر جذبہ اور قوی ہو گیا اور بقیہ عمر مجذوبانہ گزری۔

مُلتان میں تبلیغی اور صُوفیانہ سرگرمیاں

سہروردی اور دُوسرے سلسلے

تصوف کے ہندوستانی سلسلوں میں سب سے زیادہ شہرت چشتیہ خاندان کو ہے [اور فی الواقع
اس میں کئی خصوصیتیں ایسی تھیں جن کے لیے ہندوستانی حالات خاص طور پر سازگار تھے۔
مثلاً موسیقی اور سماع کا رواج۔ ادبیت اور شعر و شاعری سے اُنس۔ ملائمت،
غیر مسلموں کے ساتھ غیر معمولی رواداری) اور جنھوں نے اس کی مقبولیت و
اشاعت میں بڑی مدد دی۔ مسلمانوں کی روحانی تربیت میں بھی اس سلسلے
کے بزرگانِ کبار نے بڑا حصّہ لیا، لیکن سہروردیہ سلسلہ بھی چشتیہ کی طرح بہت
پُرانا ہے۔ اور ٹھوس تبلیغی کاموں میں تو شاید اس کا پلّہ چشتیہ سے بھاری ہے۔
کشمیر میں اسلام کبرویہ سلسلے کے بزرگوں (مثلاً امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور
ان کے صاحبزادے میر محمدؒ ہمدانی) نے پھیلایا جو سہروردیوں کی ایک شاخ سے
تعلق رکھتے تھے، بنگال کے پہلے کامیاب مبلغ شیخ جلال الدین تبریزیؒ تھے۔
جو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ اعظم تھے۔ اس وقت مشرقی بنگال
کی سب سے بڑی زیارت گاہ سلہٹ میں ایک سہروردی (شاہ جلال یمنی)
کا مزار ہے۔ گجرات کے قدیمی دار الخلافہ پٹن میں حضرت سلطان المشائخ اور

حضرت چراغ دہلیؒ نے بھی اپنے خلفا بھیجے، لیکن دار الخلافہ یعنی شہر احمد آباد کی سب سے بڑی زیارتیں یعنی حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ کے سربفلک روضے سہروردی یادگاریں ہیں۔ اور پاک پٹن سے مغرب کے علاقے یعنی سندھ، مغربی پنجاب اور بلوچستان کو تو بابا فریدؒ بھی بہاء الدین زکریا سہروردیؒ کی ولایت کا جزو مانتے تھے[1]۔

چشتیوں اور سہروردیوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں اور اس امر کا بھی عام رواج تھا کہ ایک شخص دونوں سلسلوں کے بزرگوں سے فیضیاب ہو۔ لیکن اگر ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو بہ نگہِ غائر دیکھیں تو ان کا امتیازی رنگ[2] صاف نظر آتا ہے۔ چشتیوں کی خصوصیات ہم بیان کر چکے۔

---

[1] سیر العارفین ص ۱۱۵

[2] مختلف سلسلوں کی خصوصیات:۔ اسلامی ہند و پاکستان میں ایک سے زیادہ صوفی سلسلوں سے منسلک ہونے کا رواج رہا ہے۔ بلکہ امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے تو یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ) بزرگوں کے نام لیتے تاکہ ان سب سے فیض حاصل ہو اور ان کی خصوصیات اخذ ہوں۔ ان رجحانات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مختلف سلسلوں کے ماننے والوں کے درمیان وہ حدِ فاصل نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی ان کے طریقِ ذکر و عبادت میں کئی امتیازات ہیں:۔

چشتیہ:۔ "ان کے ہاں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت الا اللہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ عموماً ان الفاظ کو دہراتے وقت سر اور جسم کے بالائی حصے کو ہلاتے ہیں ان میں شیعہ حضرات کثرت سے ہیں۔ اور اس سلسلے کی امتیازی خصوصیت سماع کا رواج ہے۔ حضراتِ چشت پر سماع کے وقت ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بسا اوقات اس سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ چشتی درویش بالعموم رنگ دار کپڑے پہنتے ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر ہلکے بادامی رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سہروردیہ:۔ ان کے ہاں سانس بند کر کے اللہ ھو کا وِرد کرنے کا بڑا رواج ہے ــــ وہ

(باقی اگلے صفحے پر)

سہروردی امورِ شرعی میں ان سے زیادہ محتاط تھے۔ ان کے ہاں سماع بہت کم تھا۔ خلافِ شرع امور پر وہ فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ دوسرے مذہبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی رواداری کا نہ تھا تبلیغ کا جوش بھی ان میں زیادہ تھا۔ سیر و سفر کا شوق بھی انھیں چشتیوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ بالعموم چشتیوں کا رنگ "جمالی" تھا اور سہروردیوں کا "جلالی"۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ دارالخلافہ کی نازک مزاج اور حسّاس ہستیوں کو سہروردی کسی بڑی حد تک مسخّر نہ کر سکے لیکن اطرافِ مُلک میں انھوں نے اسلام کا ڈنکا خوب بجایا اور اسلام کی بڑے پُرجوش طریقے سے اشاعت کی۔

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۲۵۳)

ذکرِ جلی اور ذکرِ خفی دونوں کے قائل ہیں۔ سماع سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور تلاوتِ قرآن پر خاص طور پر زور دیتے ہیں۔

قادریہ:۔ "پنجاب کے بیشتر سُنّی مولوی اس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں" قادری سماع بالمزامیر کے خلاف ہیں۔ اور ان کے حلقوں میں موسیقی کو (خواہ وہ بالمزامیر ہے یا ان کے بغیر) بہت کم بار ملتا ہے۔ قادری درویش بالعموم سبز پگڑی پہنتے ہیں اور ان کے لباس کا کوئی نہ کوئی حصّہ ہلکے بادامی رنگ کا ہوتا ہے۔ وہ درود شریف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کے ہاں ذکرِ خفی اور ذکرِ جلی دونوں جائز ہیں۔

نقشبندیہ:۔ وہ ذکرِ جلی کے خلاف ہیں۔ فقط ذکرِ خفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ وہ بالعموم مراقبہ میں سر کو جھکائے آنکھوں کو بند کیے یا زمین پر نگاہ بیٹھتے ہیں۔ موسیقی اور سماع کے خلاف ہیں اور احکامِ شریعت پر سختی سے عامل ہیں۔ ان کے ہاں مُرشد اپنے مریدوں سے علٰحدہ نہیں بیٹھتا بلکہ حلقے میں ان کا شریک ہوتا ہے اور توجہ الی الباطن سے ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری متعلقہ پنجاب از ایڈورڈ میکلیگن ۱۸۹۲ء صفحہ ۱۹۲-۱۹۶) بیعت کے وقت سب سلسلوں میں مرید کا سر تراشا جاتا ہے۔ توبہ کرائی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے لیے بیعت ایک نئی رُوحانی اور اخلاقی زندگی کا آغاز ہو۔

افسوس ہے کہ سہروردیوں کی مکمل تاریخ مرتب نہیں ہوئی اور آج تو اس کیلیے مواد نہیں ملتا۔ سہروردیوں نے کام زیادہ تر اسلامی ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی مرکزوں سے دُور رہ کر کیا۔ ان کی رُوحانی کوششوں کو دارالخلافے کی تیز برقی روشنی نے اُجاگر نہیں کیا اور اتفاق سے ان میں اہلِ قلم حضرات کی بھی بہتات نہیں۔ چشتیوں میں سے اکثر اصحابِ سجادہ (مثلاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ بابا فریدؒ۔ حضرت سلطان المشائخ۔ سیّد گیسو درازؒ) ایک خوشگوار ادبی رنگ کے حامل بلکہ شاعر تھے۔ ان کے مریدوں میں امیر خسروؒ۔ امیر حسن سنجری۔ ضیاء الدین برنی مورخ جیسے کامل الفن ادیب اور شاعر موجود تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کارنامے بڑی آب و تاب سے بیان ہوئے اور ہماری رُوحانی زندگی کا جزو ہو گئے' لیکن سہروردیوں کی ٹھوس مذہبی خدمات سے (جن کی بدولت مغربی اور مشرقی پاکستان میں اسلام کا بول بالا ہُوا) ایک عام بے خبری ہے۔

شیخ بہاءالدین زکریا سہروردیؒ

ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے مؤسسِ اعلےٰ شیخ بہاء الدین زکریاؒ[1] تھے۔ ان کے دادا مکہ معظمہ سے پہلے خوارزم اور وہاں سے مضافاتِ ملتان میں تشریف لائے اور نانا منگولوں کے حملے میں وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے اور کوٹ کروڑ میں آباد ہو گئے۔ شیخ بہاء الدین یہیں ۱۱۷۰ء[2] میں پیدا ہوئے۔ آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہُوا۔ اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور سات برس تک علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضہ نبوی کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علمِ حدیث کی سند لی۔ پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ

---

[1] یہ حالات کسی قدر فوائد الفوائد اور زیادہ تر سیر العارفین سے ماخوذ ہیں۔

[2] سیر العارفین صفحہ ۱۰۳

شیخ شہاب الدین سہروردی[1] کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

فوائد الفواد[2] میں حضرت سلطان المشائخؒ کی زبانی لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریا مُرشد کی خدمت میں فقط سترہ دن رہے تھے کہ انھیں خرقۂ خلافت مل گیا۔ اس پر شیخ الشیوخ کے یارانِ قدیم نے شکایت کی کہ ہم تو ایک مُدت سے اوراد و وظائف میں مشغول ہیں اور ابھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے، لیکن یہ نو وارد چند ہی روز میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ تم لوگ گیلی لکڑیاں لائے ہو، جن میں دیر سے آگ لگتی ہے۔ زکریا چوبِ خشک لایا تھا جو ایک ہی بار پھونک مارنے سے بھڑک اُٹھی!

خلعتِ خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے فرمایا کہ اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کر کے وہاں کے لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچائیں۔ (سیر العارفین ص ۱۰۹) چنانچہ آپ مُلتان آئے اور جلد ہی وہاں بڑا اعتبار و اقتدار حاصل کر لیا۔ بلکہ ملتان، سندھ، بلوچستان کے علاقے کو آپ کی روحانی سلطنت سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے حالات پر حال ہی میں ایک کتاب انوارِ غوثیہ کے نام سے خادمانِ درگاہ نے شائع کی ہے، جس میں کتب تاریخ کے اندراجات کے علاوہ خاندانی روایات بھی جمع کی ہیں۔ انوارِ غوثیہ کے مطابق ممالک اسلامی سے واپسی کے بعد شیخ بہاء الدین نے ایک عرصہ صوبہ سرحد کی ایک پہاڑی پر گوشۂ عزلت میں عبادت کی۔ جسے اب کوہ شیخ بودین (کوہ شیخ بہاء الدین) کہتے ہیں۔

انوارِ غوثیہ میں لکھا ہے کہ "حضرت کے وعظ سُن کر مُلکِ سندھ اور علاقۂ مُلتان اور لاہور کے اہلِ ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے جس میں بہت متمول تاجر

---

[1] مصنف عوارف المعارف۔ سہروردی سلسلے کے بانی شیخ ابو النجیب سہروردی کے بھتیجے اور خلیفہ، اکبر بلکہ سلسلے کے بانی ثانی تھے۔ [2] فوائد الفواد ص ۲۴۳

اور بعض والیانِ مُلک بھی تھے، دینِ اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے"۔ اس کے علاوہ "حضرت نے عامۂ خلائق کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے زراعت اور تجارت کے کام کو رفتہ رفتہ بڑھایا۔ اطرافِ ملتان میں جہاں کہیں اچھا موقع ہوا اُفتادہ جنگلوں کو آباد کرایا۔ چاہات اور نہریں احداث کرائیں.... اور تجارت کی طرف بھی حضرت نے بہت توجہ فرمائی"۔ (انوارِ غوثیہ ص ۴۸-۴۹)

شیخ کبیر بابا فرید گنج شکر سے جو ملتان سے تھوڑے فاصلے پر پاکپٹن میں مقیم تھے، آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ آپ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے بابا فرید کے نام رقعہ لکھا جس کا ایک فقرہ تھا: "میانِ ما و شما عشق بازی است" بابا فرید نے جواب دیا: "میانِ ما و شما عشق است بازی نیست[1]"۔ آپ کے زمانے میں شیخ شہاب الدین سُہروردی کے اور خلفا مثل قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ جلال الدین تبریزی ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن چشتیہ بزرگوں کی کشش نے انھیں اپنا لیا اور انھوں نے سہروردی سلسلے کو فروغ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری کے تو فقط تین مرید تھے اور شیخ جلال الدین تبریزی نے بھی بنگالہ جانے سے پہلے بہت کم لوگوں کو مُرید کیا۔ یہ کمی شیخ بہاء الدین زکریا نے پوری کی اور ان کی وجہ سے سہروردیہ سلسلے کو ہندوستان میں اہم جگہ مل گئی۔ ان کے زمانے میں شیخ الاسلام سید نور الدین مُبارک غزنوی اور شاہ ترکمان بیابانی[2] بھی سُہروردی سلسلے سے تھے، لیکن سلسلہ ان سے بہت چلا نہیں اور ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کا مورثِ اعلیٰ شیخ بہاء الدین زکریا

---

[1] سیر الاولیا ص ،،

[2] شیخ شہاب الدین سہروردی کے ایک اور مرید شیخ شہاب المعروف جگجوت تھے۔ وہ پورب چلے گئے اور پٹنہ کے قریب ایک قصبہ (جھٹلی) میں دفن ہیں۔ بہار کے مشہور صُوفی۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ان کے حقیقی نواسے تھے۔

ہی کو سمجھنا چاہیے۔

آپ کے زمانے میں ناصر الدین قباچہ جو سلطان محمدؒ غوری کا غلام تھا، ملتان کا گورنر تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات تک تو وہ بادشاہ دہلی کا وفادار صوبیدار بنا رہا۔ لیکن جب اس کا غلام التمش بادشاہ ہوا تو قباچہ نے بھی خود مختاری کا ارادہ کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا اور قاضی شرف الدین قاضیٔ ملتان نے خط لکھ کر التمش کو اس کے منصوبوں کی اطلاع دینی چاہی۔ قضارا دونوں کے خط قباچہ کے ہاتھ جا لگے۔ قاضی کو تو اس نے فوراً قتل کرا دیا اور شیخ سے باز پرس شروع ہوئی۔ شیخ نے صاف کہا کہ یہ خط میں نے لکھا ہے اور ارشادِ الٰہی کے مطابق لکھا ہے۔ تمھاری کوششوں سے سوائے مسلمانوں کا خون بہنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ شیخ کا ملتان میں اتنا اثر تھا کہ ناصر الدین قباچہ کو انھیں آزار پہنچانے کی ہمت[1] نہ ہوئی۔ بالآخر اس نے التمش کے خلاف بغاوت کی اور التمش اس کا تعاقب کر رہا تھا کہ وہ دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا اور اس کی جگہ ایک نیا صوبیدار مقرر ہوا۔

اسی طرح نقل ہے کہ جب ۱۲۵۷ء میں منگول ملتان میں داخل ہو گئے اور برج اور مورچے گرا کر شہر میں قتل و غارت شروع کرنے کو تھے تو حضرت مخدوم العالم شیخ بہاء الدین زکریا ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور مغلوں کو یہ رقم ادا کر کے شہر کو ان کی تباہی سے بچایا[2]۔

سہروردیہ سلسلے میں سماع کی وہ افراط نہیں جو چشتیہ سلسلے میں ہے اور شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ عام طور پر سہروردی چشتیوں کی نسبت احکام شرعی کی تعمیل میں زیادہ محتاط رہے ہیں۔ مثلاً سیر الاولیا میں لکھا ہے: "منقول ہے کہ ان دنوں

---

[1] فوائد الفواد صر ۱۱۹

[2] ملاحظہ ہو مولوی نور احمد خاں فریدی مولف ملتان کا ایک مضمون مندرجہ نیرنگ خیال جون ۱۹۲۵ء

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہ کا ایک فرزند ناگور میں آیا اور جب اس نے سُنا کہ (سلطان التارکین) شیخ حمید الدین (صوفی ناگوری خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ) نمازِ جمعہ میں شریک نہیں ہوتے تو شور برپا کیا۔ اور چند ظاہر بین عالموں کو لے کر آپ کے مکان پر پہنچا اور معروف کرنا شروع کیا[1] (ص ۱۴۱)

سہروردی چشتیوں کی طرح سماع کے معاملے میں غلو نہیں کرتے بلکہ عموماً اس سے مُجتنب ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض بقول شیخ جمالیؒ "بر سبیلِ ندرت" سماع سُنتے ہیں۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی نسبت بھی لکھا ہے کہ جب عبداللہ نامی ایک قوال خوش کلام ملکِ روم کی طرف سے مُلتان آیا تو اُس نے شیخ زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے میری قوالی سُن کر سماع کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اچھا اگر حضرت نے سُنا ہے تو ہم بھی سُنیں گے۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ اور اس کے ساتھی کو حجرے میں بُلایا۔ اور حجرہ بند کر کے قوال سے کہا کہ کچھ پڑھو۔ قوال نے غزل شروع کی ؎

مستاں کہ شرابِ ناب خوردند　　　از پہلوے خود کباب کردند

شیخ پر کیفیت طاری ہوئی تو انھوں نے چراغ گُل کر دیا۔ جس سے حجرے میں اندھیرا ہو گیا۔ لیکن اتنا نظر آ رہا تھا کہ شیخ گردش کر رہے ہیں[2]۔

سماع سے شیخ کی دلچسپی مشہور فارسی شاعر عراقی کی صحبت کی وجہ سے اور بھی

---

[1] لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جمع اموال کی بناء پر حضرات چشت سہروردیوں کو طنز کرتے رہے ہیں۔ اس مسئلے پر شیخ حمید الدین ناگوری اور شیخ بہاء الدین زکریا کے درمیان دلچسپ خط و کتابت ہوئی تھی۔ (اخبار الاخیار) اور سید گیسو درازؒ نے بھی کہا: "مشائخ ملتان ہمتے بر جمع مال دارند و مشائخ خراسان تعلقے بہ تجارت و سوداگری دارند۔ اما خواجگان ما بہ ہیچ از اسباب دُنیاوی متعلق نشدہ" (جوامع الکلم ص ۲۱۳)

[2] فوائد الفواد ص ۱۴۷　سیر العارفین ص ۱۱۴

بڑھ گئی۔ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے تھے اور ان دنوں اثنائے سیر و سیاحت میں ملتان تشریف لائے تھے۔ شیخ بہاء الدین سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ وہ کہتے تھے۔ "بر مثال مقناطیس کہ آہن را کشد۔ شیخ مرا جذب می کند۔ و مقید خواہد کرد۔ ازیں جا زودتر باید رفت۔" شیخ نے بھی اپنے مرشد کے خواہرزادہ کی بڑی خاطرداری کی۔ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی۔ اور عراقی ایک عرصہ ملتان میں مقیم رہے۔ وہ نہایت دل گداز شعر لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ نفحات الانس میں مولنا جامی لکھتے ہیں کہ جب شیخ بہاء الدین زکریا کی خانقاہ میں عراقی نے چلہ کشی شروع کی تو ابھی چند ہی دن گزرے تھے۔ کہ ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انھوں نے ذیل کی غزل کہی۔ اور اسے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا ؎

نختیں بادہ کاندر جام کردند ۔۔۔ زچشم مست ساقی وام کردند
برائے صید مرغ جان عاشق ۔۔۔ ز زلف ... ہر دیاں دام کردند
بعالم ہر کجا رنج و ملامت ۔۔۔ بہم بردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش ۔۔۔ عراقی را چرا بدنام کردند

اہل خانقاہ نے اس پر اعتراض کیا۔ کیونکہ خانقاہ میں سوائے ذکر اور مراقبہ کے کوئی اور چیز رائج نہ تھی۔ انھوں نے شیخ سے بھی اس کی شکائت کی۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ یہ چیزیں تمھیں منع ہیں۔ اسے منع نہیں۔ اور آخری شعر پر تو کمال خوشنودی کا اظہار کیا (نفحات الانس ص ۴۲۵)

عراقی کے علاوہ آپ کے دوسرے مشہور اہل قلم مرید امیر حسینی تھے، جو کنز الرموز، زاد المسافرین اور نزہت الارواح کے مصنف ہیں۔ گلشن راز جو شیخ محمود شبستری کی مشہور مثنوی ہے۔ حضرت امیر حسینی کے سوالات کے جواب میں لکھی گئی۔ وہ کنز الرموز میں شیخ بہاء الدین اور شیخ صدر الدین کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیا ۔۔۔ واصل حضرت ندیم کبریا

فخرِ ملت و بھلے شرع و دیں	جانِ پاکش منبعِ صدق و یقین
از وجودِ او بر نزدِ دوستاں	جنت الماوٰی شدہ ہندوستاں
منکرو از نیک و از بد تاختم	ایں سعادت از قبولش یافتم
رختِ ہستی چوں بطل بست از میاں	کرد پروازِ ہما بر آشیاں
آن بلند آوازۂ عالم پناہ	سر در عصرِ افتخارِ صدر گاہ
صدرِ دین و دولت آں مقبولِ حق	نہ فلک بر خوانِ جودش یک طبق!

شیخ بہاءالدین زکریاؒ کے ہندوستانی مریدوں میں آپ کے صاحبزادے شیخ صدرالدین عارف اور پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح کے علاوہ اُچہ شریف کے بخاری سیّدوں کے مؤسسِ اعلےٰ سیّد جلال الدین منیر شاہ میر سرخ بخاریؒ اور سندھ کے لال شہباز قلندر قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کی وفات ۶۶۱ھ ۱۲۶۲ء میں ہوئی۔ مزار خاکِ پاک ملتان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے اور اس کے قرب و جوار میں بعض بڑی مبارک و متبرک ہستیاں دفن ہیں[1]۔

---

[1] مثلاً ملتان کا آخری اور جری دل ناظم نواب مظفر خاں، جس نے ۱۷۷۶ء سے ۱۸۱۸ء تک بڑی سمجھ، قابلیت اور فرض شناسی سے صوبۂ ملتان کا انتظام کیا۔ اسے اسّی برس کی عمر میں راجا رنجیت سنگھ کی اس فوج کا مقابلہ کرنا پڑا جسے فرانسیسی جرنیلوں نے منظّم کیا تھا۔ اور جو ہر طرح کے کیل کانٹے سے آراستہ تھی۔ شیر دل پیرِ مرد نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ حتےٰ کہ قلعے میں فقط دو تین سو آدمی رہ گئے اور سکھ فوج خضری دروازے سے قلعے کے اندر داخل ہوتی نظر آئی۔ اس وقت بوڑھا نواب سبز لباس پہن کر ننگی تلوار ہاتھ میں لیے باہر آیا اور دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ سینکڑوں سپاہی کھیت رہے۔ لیکن تلواروں اور گولیوں کا کیا مقابلہ۔ دوبارہ سہ بارہ گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور نواب صاحب لڑکھڑا کر میدانِ کارزار میں گرے۔ ان کے پانچ جانباز فرزند بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ بڑا بیٹا سرفراز خان اسّی زخم

(باقی اگلے صفحے پر)

شیخ صدرالدین | شیخ بہاء الدین کی وفات ۱۲۶۲ء میں ہوئی اور آپ کے صاحبزادہ شیخ صدرالدین جانشین ہوئے۔ (غالباً ہندوستان میں موروثی سجادہ نشینی کی یہ پہلی اہم مثال ہے، جس پر بعد میں اچ کے قادری پیروں نے بھی عمل کیا۔
شیخ صدرالدین کی بہت سی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ میر حسینی سادات نے کنزالرموز میں ان کی نسبت لکھا ہے ؎

آں بلند آوازۂ عالم پناہ ۔۔۔ سرورِ دیں، افتخارِ صدرگاہ
آبِ حیواں قطرۂ بحرِ دلش ۔۔۔ چوں خضر علمِ لدنی حاصلش
معتبر چوں قولِ او افعالِ او ۔۔۔ ہم بیانِ او گواہِ حالِ او
ملکِ معنی جمع در فرمانِ او ۔۔۔ ہم بکسب و ہم بمیراث آنِ او

ہندوستان کے مشائخ میں شاید سب سے پہلے آپ تھے جنھیں شیخ ابنِ عربی کے نظریوں اور تصانیف کے متعلق اطلاع ملی۔ ہم مشہور شاعر عراقی کا ذکر کر چکے ہیں جو شیخ صدرالدین کے بہنوئی تھے اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مریدِ خاص۔ جب عراقی ملتان سے بلادِ روم کو واپس گئے تو (ایشیائے کوچک کے) مشہور شہر قونیہ میں ان کی ملاقات شیخ محی الدین ابنِ عربی کے مشہور خلیفہ شیخ صدرالدین قونوی سے ہوئی اور ایک عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ عراقی نے وہیں فصوص الحکم کا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر لمعات لکھی۔ ان دنوں عراقی کی شیخ صدرالدین سے خط و کتابت تھی۔ چنانچہ انھوں نے قونیہ سے یہ تفصیلات شیخ کو ایک خط میں لکھیں۔ سیر العارفین میں شیخ جمالی لکھتے ہیں:
"و عراقی از آنجا در روم رسید و در شہر قونیہ در آمد و آنجا شیخ صدرالدین قونوی

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۲۶۱)
کھا کر بیہوش ہوا۔ جب ہوش آیا تو بے ساختہ کہا ؎

مظفر بر بساطِ مرگ بنشست ۔۔۔ مسلمانی ز ملتاں رخت بربست

(مولوی نور احمد فریدی مؤلف ملتان)

خلیفہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ بود۔ چندگاہ در صحبتِ ایشاں مے گزرانید و نسخہ لمعات در قونیہ تصنیف کرد و ازاں جا کتابے متضمن کلمات و نکات عرفان بجانب حضرت سلطان العارفین شیخ صدرالدین عارف پسر بزرگ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نوشتہ است کہ ما را الآن بہ صوفی صحبتے افتادہ است کہ کلماتش این است۔ معلوم نیست کہ حضرت ایشاں چہ جواب نوشتند۔" (ص ۱۸۹)

شیخ رکن الدین ابو الفتح رح

۱۳۰۹ء میں شیخ صدرالدین رح کی وفات ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ رکن الدین ابو الفتح ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے حسنِ خلق اور پرہیزگاری کی سب تاریخیں گواہ ہیں۔ آپ شیخ بہاء الدین زکریا کے براہِ راست مرید اور اس کے علاوہ اپنے والد کے خلیفہ تھے۔ اپنے زمانے میں آپ کو بڑا عروج ہوا۔ سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس کی زندگی میں آپ دو دفعہ دہلی آئے۔ بادشاہ نے بڑی عقیدت سے استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنکے نذر کیے۔ آپ نے وہ رقم لے کر مستحقین میں تقسیم کر دی۔ سلطان علاء الدین کا بیٹا قطب الدین خلجی حضرت سلطان المشائخ کے خلاف تھا۔ اس نے شیخ رکن الدین کو ملتان سے بلایا۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت سلطان المشائخ کے مقابلے میں ایک اور بارگاہ دہلی میں قائم ہو تاکہ حضرت کا اثر و رسوخ کم ہو۔ لیکن شیخ رکن الدین اور سلطان المشائخ اس تپاک و محبت سے ایک دوسرے کو ملے اور ان کا سلوک اتنا دوستانہ رہا کہ بادشاہ کے سب منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان المشائخ شیخ کے استقبال کو اپنی اقامت گاہ سے نکل کر حوضِ علائی تک گئے۔ اور سب سے پہلے ان سے جا کر ملے۔ جب اس کے بعد بادشاہ نے شیخ رکن الدین سے پوچھا کہ اہلِ شہر میں سب سے پہلے کس نے آپ کا استقبال کیا ہے، تو آپ نے سلطان المشائخ کی نسبت اشارہ کر کے فرمایا: "کسیکہ بہترین اہلِ شہر است!" اس کے بعد آپ کی اور سلطان المشائخ کی بڑی پُر لطف صحبتیں رہیں جن میں مذہب،

تصوف اور تاریخ کے دلچسپ نکتے حل ہوتے رہے۔

سیر العارفین میں ضیاءالدین برنی کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جب بنگالہ سے واپسی پر سلطان غیاث الدین تغلق کی اس کے بیٹے جونا خاں (محمد تغلق) نے نوتعمیر چوبیں محل میں ضیافت کی تو آپ بھی موجود تھے۔ کھانا ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ آپ نے بادشاہ سے کہا کہ جلدی باہر نکلو۔ بادشاہ نے کہا کہ کھانا ختم کر کے آتا ہوں۔ آپ باہر نکل آئے۔ لیکن بادشاہ نے آپ کے ارشاد پر فوراً عمل نہ کیا۔ اتنے میں چھت گری اور بادشاہ دب کر مر گیا۔ جب حضرت سلطان المشائخ نے انتقال کیا تو آپ دہلی میں تھے اور نمازِ جنازہ آپ نے ادا کرائی۔

سلطان محمد بن تغلق بھی آپ کا قائل تھا۔ جب کشلو خان نے سلطان کے خلاف بغاوت کی اور سلطان نے اسے شکست دے کر حکم دیا کہ اہلِ ملتان کے خون سے نہریں بہا دو۔ اور قاضی شہر کریم الدین کی کھال کھچوا دی تو شیخ رکن عالم ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس گئے اور اہلِ شہر کی سفارش کر کے ان کی جانیں بچائیں (تاریخ معصومی) عصامی اس واقعہ کی نسبت لکھتا ہے ؎

ابوالفتح، شیخ زماں رکنِ دیں — مگر بُد دراں ہفتہ عزلت گزیں
چو بشنید در شہر طوفانِ خوں — برہنہ سر و پاے آمد بروں
کشادہ زبانِ شفاعت گری — ہمے گفت "شاہا جہاں پروری
بسے خوں فشاندی دریں بوم و بر — ز تیغت گرفتہ جہاں خونِ تر
بر اہل گنہ، نزدِ اہلِ صفا — پسندیدہ تر ہست عفو از جزا
کنوں دست دار از سیاست گری — چو شد نوبتِ عفو و رحم آوری"
چو بشنید آں شاہِ آفاق گیر — شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر
کبیر نکو نام را گفت شاہ — کہ دارند دستے ز اہلِ گناہ
ببرند بندِ اسیراں تمام — گزارند مرغانِ عاجز ز دام

آپ کا مزار قلعہ ملتان کے اندر ایک بڑے عالیشان روضے میں ہے۔

اصل میں یہ روضہ غیاث الدین تغلق نے (شیخ بہاء الدین زکریا کے قریب دفن ہونے کی آرزو میں) اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔ لیکن اس نے دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ اس کے بیٹے سلطان محمد بن تغلق نے یہ روضہ شیخ رکن عالم کی تدفین کے لیے دیا۔ اس روضے کی بلندی سو فٹ کے قریب ہے۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد ہی پچاس فٹ کے قریب بلند ہے، اس لیے عمارت بہت اونچی ہو گئی ہے۔ اور تیس تیس میل سے صاف نظر آتی ہے۔

بالجملہ یہ کہنا صحیح ہے کہ خاندانِ خلجی اور خاندانِ غلاماں کے عہدِ حکومت میں سہروردیوں کا اثر و رسوخ چشتیوں سے کم نہ تھا۔ اور بالخصوص سلطان علاء الدین خلجی، سلطان غیاث الدین تغلق اور سلطان محمد تغلق جس حد تک شیخ رکن الدین کا پاس ادب کرتے تھے، اتنا انھوں نے کسی اور شیخ حتیٰ کہ حضرت سلطان المشائخ کا بھی نہیں کیا۔ شیخ رکن العالم نے یہ اثر خلقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کی خاطر استعمال کیا۔ مثلاً جب آپ سلطان علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں دہلی تشریف لائے تو جس روز آپ آئے اس روز بادشاہ نے دو لاکھ تنکے آپ کی نظر کیے اور پھر جب آپ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو پانچ لاکھ تنکہ دیا۔ آپ کو یہ رقمیں جس جس روز ملیں اُسی روز آپ نے خلقِ خدا میں تقسیم کر دیں[1]۔

اسی طرح سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ جب حضرت شیخ رکن العالم ڈولے میں سوار ہو کر حضرت سلطان المشائخ کی ملاقات کے لیے آئے اور مصنف کے والد ڈولے میں شیخ کے لیے کھانا رکھنے لگے تو ڈولے میں ہر طرف کاغذ ہی کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ مصنف کے والد نے انھیں ایک طرف کر کے کھانا رکھنے کے لیے جگہ نکالنی چاہی تو شیخ رکن العالم نے حضرت سلطان المشائخ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "آپ کو معلوم ہے یہ کاغذات کیسے ہیں" پھر خود ہی کہنے لگے

---

[1] سیر العارفین ص ۱۴۲

کہ یہ حاجت مندوں کی عرضیاں ہیں، جو وہ مجھے اس لیے دے دیتے ہیں تاکہ میں بادشاہ تک پہنچاؤں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ میں آج کس بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں! (ص ۱۲۳)

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ ان سب عرضیوں کے ساتھ جو ضرورت مند آپ کے تخت رواں پر ڈال دیتے بادشاہ کے پاس پہنچتے اور ایک خادم کو ہدایت کرتے کہ یہ عرضیاں بادشاہ کے سامنے رکھے۔ چنانچہ بادشاہ یہ سب عرضیاں آپ کی موجودگی میں پڑھواتا۔ ہر عرضی پر حکم لکھواتا اور جب تک لوگوں کی مطلب برآری نہ ہو جاتی آپ وہاں سے نہ ہلتے۔ (ص ۱۴۳)

تاریخ فیروز شاہی میں آپ اور آپ کے خاندان کی نسبت ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:۔

همچناں در تمامی عصر علائی شیخ رکن الدین کہ شیخ بن شیخ بن شیخ بود۔ بر سجادہ شیخ صدر الدین و شیخ بہاء الدین در ملتان مستقیم بود و کدام شرف و بزرگی و جلالت و منقبت ازاں بہتر و ازاں بالاتر بود کہ پدر او صدر الدین و جد او شیخ بہاء الدین زکریا باشند و در ہم عہد علائی شیخ رکن الدین داد طریقت مشائخ میداد وحق تکمیل مریداں می گزاشت و سجادۂ پدر و جد را منور میداشت و تمامی اہالی دریائے سندھ از ملتان و اچہ و فرود تر و مرلیہ باستان متبرک شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز تشبث و تعلق نمودہ بودند و چندیں علما از شہر و دیار ہند مریداں خدمت او شدہ و در کشف و کرامت شیخ رکن الدین کسے را شبہے و شکے نماندہ بود و مآثر خاندان بزرگوار او از وصف بیرون است و شیخ بہاء الدین زکریا را در میان سالکان و خدا طلباں "باز سپید" گفتندے اعنی ہر کہ خود را بجناح او بر بندد بخدا رسد و شیخ الاسلام صدر الدین با اوصاف کمال و تکمیل سخاوت در غایت افراط داشت و با چندان مال کہ خدمت او را از میراث پدر رسیدہ از وفور اعطا آں بزرگ را بیشتر ایام در قرض گذشتے۔

شیخ رکن الدین کی وفات ۱۳۳۴ء میں ہوئی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ وفات سے تین ماہ پہلے آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ فقط نماز کے لیے حجرہ سے باہر آتے۔ بالآخر ۱۶ رجب کو نمازِ عصر کے بعد آپ نے اپنے خادمِ خاص کو حجرہ میں بُلا کر کہا کہ ہماری تجہیز و تکفین کا انتظام کر لو۔ اس روز نمازِ مغرب کے لیے آپ حجرہ سے باہر نہیں آئے بلکہ امام کو بُلا کر حجرے کے اندر ہی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے نوافل کے لیے سر سجدہ میں رکھا اور اسی حالت میں جان بحق تسلیم کی۔

آپ کی اولاد کوئی نہ تھی۔ آپ کا فیض آپ کے خلفاے عظام نے جاری رکھا اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی وفات کے ساتھ ملتان کے پیرانِ عظام کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور مغربی پنجاب اور سندھ کا روحانی مرکز ملتان سے اچہ میں منتقل ہو گیا۔ جہاں پہلے آپ کے خلیفہ اعظم حضرت مخدوم جہانیاں اور ان کے بھائی سید راجو قتال، اور پھر قادری بزرگوں نے ارشاد و ہدایت کی شمعیں روشن کیں۔

آپ کے خلفا میں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے علاوہ شیخ وجیہ الدین عثمان سیاح سنامی قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر ان قابلِ عزت ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے محسن کُش خسرو خاں کی اشرفیاں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ شیخ رکن الدین ابوالفتح کے ایک اور نامور مُرید حاکم شاہ تھے جو پہلے کیچ مکران کے گورنر تھے بعد میں دُنیا ترک کر دی۔ اور شیخ سے خرقہ حاصل کرنے کے بعد اچہ اور سکھر کے درمیانی علاقے میں ارشاد و ہدایت اور تبلیغ اسلام پر مامور ہوئے۔ آپ کی وفات ۱۳۶۸ء میں ہوئی۔ مزار شریف ریاست بہاول پور میں ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو ریاست بہاولپور کا سرکاری گزیٹیر۔ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ذکر کرام (در حالات بزرگان ریاست بہاولپور) از مولوی حفیظ الدین حفیظ بہاولپوری ص ۱۰۲ تا ص ۱۰۶

سہروردی سلسلہ کے افغان مشائخ[1]

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور ان کے خلفا کا اثر صرف مغربی پنجاب اور سندھ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ افغان علاقے میں بھی ان کے معتقد تھے۔ افغان اپنا سلسلۂ نسب بنی اسرائیل سے ملاتے ہیں، جو نینوہ کے حاکم بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی بربادی کے بعد فلسطین سے نکلے اور پھرتے پھراتے کوہستان غور میں آباد ہو گئے۔ سلطان شہاب الدین نے انھیں کوہستان غور سے نکال کر علاقۂ روہ میں آباد کیا۔ تاکہ وہ غوری حکومت کی پشت و پناہ بنیں اور ان سے ہندوستان میں جہاد کا کام لیا جا سکے۔ سید سلیمان ندوی کا بیان ہے۔ کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے تک بیشتر افغان غیر مسلم تھے[2]۔ روسی مستشرق بارتولڈ کا بھی خیال ہے کہ افغانوں میں اسلام بارھویں صدی عیسوی کے قریب پھیلنا شروع ہوا اور قریب قریب یہ وہی زمانہ تھا جب ۱۱۸۲ء میں شیخ بہاء الدین زکریا کی ولادت ہوئی اور تعلیم و تربیت اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے خلافت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے موجودہ مغربی پاکستان میں اپنے آپ کو ارشاد و ہدایت کے لیے وقف کر دیا[3]۔

---

[1] یہ اندراج تمامتر افغانوں کی قدیمی تاریخ مخزنِ افغانی پر مبنی ہے، جو عہدِ جہانگیری میں خان جہاں لودھی کے ایما پر لکھی گئی۔ کتاب کا انگریزی ملخص ہسٹری آف دی افغانز کے نام سے ۱۸۲۹ء میں اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی لنڈن کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اصل کتاب ابھی مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی۔ ہم نے اس قلمی نسخہ سے استفادہ کیا ہے، جو پروفیسر امام الدین ایم۔ اے نے متعدد نسخوں سے مقابلہ کے بعد اشاعت کے لیے مرتب کیا۔

[2] ملاحظہ ہو "عرب و ہند کے تعلقات" از سید سلیمان ندوی ص ۱۸۹

[3] آپ سے پہلے شیخ دتو شوربانی خوشنگی کا نام ملتا ہے، جنھوں نے چشت میں جا کر خواجہ مودود چشتی سے فیض حاصل کیا۔ اور مرشد کے ایما پر واپس آ کر وطن میں منبع ہدایت بنے۔ ان کی تاریخ وفات خزینۃ الاصفیا میں ۵۵۰ھ (مطابق ۱۱۵۵ء) درج ہے۔ لیکن ان کے فوری جانشینوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

مخزنِ افغانی میں شیخ بہاء الدین زکریا کے دوسرے افغان مریدوں (مثلاً حمید زرکنی) کے نام ملتے ہیں۔ لیکن اس عہد کے افغان بزرگ، جن کے متعلق مخزن میں سب سے زیادہ تفاصیل ہیں، شیخ بہاء الدینؒ کے نہیں، بلکہ ان کے خانوادہ کے ایک دوسرے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں کے مُرید تھے۔ ان کا نام خواجہ یحییٰ بختیار تھا لیکن انھیں مُرشد سے کبیر کا خطاب ملا تھا۔ اور اب وہ عام طور پر خواجہ یحییٰ کبیر کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ ان پر شروع سے ہی محبتِ الٰہی غالب تھی اور لڑکپن میں بھی کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ راہ نما کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک دفعہ خواب میں رسالت مآب نے اشارہ کیا کہ تمھیں مخدوم جہانیاں سے فیض ملے گا۔ چنانچہ وہ ہر کہیں سے کوہ سلیمان اور وہاں سے اوچ تشریف آئے اور مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہو کر مخدوم سید جلال الدین بخاری کی خدمت میں پہنچے۔ اور مُرید ہوئے۔ کئی چلّے طے کیے۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور بڑے فیوض حاصل کیے۔

اس کے بعد وہ مخدوم پیر کالوں اور کئی دوسرے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مخزنِ افغانی میں سب سے زیادہ تفاصیل حضرت یحییٰ کبیر کے متعلق دی گئی ہیں۔ کوئی سولہ صفحے ان کے لیے وقف ہیں۔

شیخ یحییٰ کبیر کی شہرت اپنے علاقے سے باہر، دُور دُور تک پہنچی ہوئی تھی۔ مثلاً مخزنِ افغانی کے انگریزی ملخص میں لکھا ہے کہ بہار کے مشہور بزرگ مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری صاحبؒ نے شیخ یحییٰ کبیرؒ کو ایک خط لکھا اور شکایت کی کہ سُنا جاتا ہے کہ آپ کی محفلِ سماع میں جب درویش رقص کرتے ہیں تو مستورات بھی موجود ہوتی ہیں۔ آگ اور روئی کی یکجائی مناسب نہیں۔ شیخ یحییٰ جو قوالی کے وقت تو موجود ہوتے تھے، لیکن رقص میں شرکت نہ کرتے اور محفل سماع میں عورتوں کی موجودگی کے خلاف تھے، جواب میں لکھا کہ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ لیکن احکم الحاکمین ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ اور طریقے سے بتا دیا کہ اگر خدا چاہے تو

پنبہ اور آتش کی یکجائی بھی شعلہ زنی کا باعث نہیں ہوتی۔

شیخ یحییٰ کبیر کا زیادہ وقت کوہ سلیمان پر گزرا۔ لیکن سہروردی بزرگوں کی طرح بڑے سفر کیے۔ حج کے علاوہ ان کے قربل (افغانستان) غزنی، سمرقند، ہرات پہنچنے کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی عمر شریف میں خدائے تعالیٰ نے بڑی برکت دی اور ایک سو ستائیس سال کی عمر کو پہنچ کر وہ ۲۰ نومبر ۱۴۳۰ء[۱] کو وفات پا گئے۔

شیخ یحییٰ کبیر کی اہمیت ان کی اپنی ریاضت و عبادت اور نیک کاموں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کا فیض کثرت سے دوسروں کو پہنچا۔ جو خود فیضیاب ہو کر ہدایتِ خلق کا ذریعہ ہوئے۔ ان کے اپنے خاندان اور خادمانِ درگاہ میں ہی اُنتیس ایسے بزرگوں کے نام لیے جاتے ہیں، جو درجہ ولایت کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان میں شاید سب سے مشہور آپ کے بھائی شیخ علی تھے۔ جنھوں نے اتنی سخت ریاضتیں کیں، اور اس طرح اپنے جسم کو مار رکھا کہ آپ کے ہمعصر آپ کو شیخ علی ڈنکہ یعنی شیخ علی لاغر کہا کرتے تھے۔

شیخ یحییٰ کبیر کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد تختِ دہلی پر پہلا افغان بادشاہ بہلول لودھی متمکن ہوا۔ اس نے روہ سے آنے والے افغانوں کو ہندوستان میں کثرت سے جاگیریں اور زمینیں دیں[۲]۔ اور اس ملک میں افغانوں کے آنے کا راستا کھل گیا۔ جن میں کئی صاحبِ باطن بزرگ ہوئے۔ ان میں قابلِ ذکر حضرات کا تذکرہ ہم ان کے سلسلے اور زمانے کے مطابق کریں گے۔

---

[۱] یعنی دوم صفر ۸۳۴ھ کو مخزن افغانی کے انگریزی ملخص میں یہ تاریخ درج ہے۔ اور قرائن سے یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

[۲] بالخصوص جب جونپور کے حاکم نے دہلی کا ایک لشکرِ جرار کے ساتھ محاصرہ کیا تو بہلول نے اپنی قلتِ فوج کا اندازہ کر کے روہ کے افغانوں کو محبت آمیز اور ولولہ انگیز خطوط لکھے اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ کثرت سے افغان اس کی مدد کے لیے پہنچے۔ (ملاحظہ ہو مخزن افغانی کا ضمیمہ پنجم)

اس باب میں ہم نے سہروردی سلسلے کے افغان مشائخ کا ذکر کیا ہے ۔ پیر کبار شیخ د تو شوریانی خویشگی اور بریچ قوم کے جن چشتی مشائخ کا زمانہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے بھی پیشتر بتایا جاتا ہے، ان کا ذکر ہم کر چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ دو اہم نام مخزنِ افغانی میں آتے ہیں ۔ ایک حضرت خواجہ اجمیری کے مشہور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ۔ جنھیں عام صوفی تذکرہ نگار اوش یعنی علاقہ ترکستان کے ایک شہر کا باشندہ کہتے ہیں ۔ لیکن جن کا نام مخزنِ افغانی میں افغان مشائخ میں سرِ فہرست درج ہے ۔ دوسرے شیخ (نور الدین) ملک یار پراں کا ۔ جو عہدِ بلبنی کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے ۔ اور دہلی میں جمنا کے کنارے مدفون ہیں ۔ اخبار الاخیار اور دوسرے صوفی تذکروں میں انھیں ایران کے علاقہ لار کا باشندہ لکھتے ہیں جو مرشد کے ایما پر ہندوستان آئے ۔ لیکن افغان تذکرہ نگاروں کے مطابق وہ افغانوں کے غرشیں قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ خزینۃ الاصفیا میں ان کا سالِ وفات ۶۹۵ھ (مطابق ۱۲۹۶ء) لکھا ہے ۔ دو واسطوں سے ان کا سلسلہ شیخ ابو اسحاق گازرونی تک پہنچتا ہے ۔

مخدوم بہاء الدین زکریا کے جس افغان مرید سے سہروردی سلسلے کو سب سے زیادہ فروغ ہوا اور ارشاد و ہدایت کا ایک بڑا مرکز قائم ہو گیا، وہ شیخ احمد ولد رینی شروانی تھے ۔ وہ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ ان کے والد بھیڑ بکریاں پالا کرتے تھے اور نوعمر احمد ان کی دیکھ بھال پہ مامور تھے ۔ ایک دفعہ وہ دامنِ کوہ میں بھیڑ بکریاں چرا رہے تھے کہ چند قلندروں کا اس طرف گزر ہوا ۔ شیخ احمد نے ان کی بڑی خدمت کی بلکہ ان کے کمالات سے متاثر ہو کر چاہا کہ ان کے ساتھ ہی چل دیں ۔ لیکن قلندروں نے روکا ۔ اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں قلندری اور بے نوائی کے لیے نہیں پیدا کیا ۔ تم سے بہت بڑے کام لیے جائیں گے ۔ اور بڑی خلقت تم سے راہِ ہدایت پائے گی ۔ تمھیں چاہیے کہ مخدوم شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں پہنچو اور ان کے مریدوں میں شامل ہو جاؤ ۔ اس کے بعد

قلندروں نے ان کے حق میں دعائے خیر کی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ شیخ احمد پر اس کے بعد ایک عجیب حالت طاری ہوئی۔ اور وہ گھر بار، ماں باپ چھوڑ کر شیخ بہاء الدین کی خدمت میں پہنچے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ مرشد کی نظرِ عنایت سے وہ مرتبۂ کمال کو پہنچے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

شیخ احمدؒ کی وفات کے بعد ان کا سلسلۂ فیض ان کے تین فرزندوں نے جاری رکھا جو تینوں منبعِ فیض تھے۔ لیکن سجادہ نشین دوسرے بیٹے شیخ سلیمان دانا ہوئے، جو شیخ بہاء الدین زکریا کے صاحبزادے شیخ صدر الدین عارفؒ کے مرید تھے۔ مخزنِ افغانی میں لکھا ہے کہ مرشد کی بشارت کے مطابق شیخ سلیمان علاء الدین خلجی کے حملۂ چتوڑ کے وقت وہاں موجود تھے۔ جب چتوڑ کی فتح کے بعد راجپوت عورتوں نے رسمِ جوہر ادا کی اور مرد لڑائی میں کام آئے تو جو لوگ بچ گئے تھے، ان میں سے ایک راجپوت لڑکی کے ساتھ شیخ سلیمان نے نکاح کیا، جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے اور جو دونوں مرتبۂ ولائت کو پہنچے۔ بڑے بیٹے کا نام محمود تھا اور چھوٹے نے ملہمی قتال کے نام سے شہرت پائی۔

شیخ ملہمی قتال نے ابتدائی عمر میں ہی سفر اختیار کیا اور سہوان (سندھ) میں جا کر شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مشہور سندھی خلیفہ مخدوم لال شہباز قلندر کے مرید ہوئے اور عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان سے بہت سے خوارق منسوب کیے جاتے ہیں اور بے شمار خلقت ان کی معتقد ہوئی۔ ان کو قتال دو وجہوں سے کہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ انھیں فتوحات کی قسم سے پہنچتا، اسے بڑی بے دردی اور بے دریغانہ خرچ کرتے۔ دوسرے جو کوئی ان کی نسبت بے ادبی کے الفاظ منہ سے نکالتا، وہ اسی وقت کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ شیخ ملہمیؒ کے دو بیٹے تھے۔ شیخ علی اور شیخ بایزید۔ وہ بھی مرتبۂ ولائت کو پہنچے ہوئے تھے۔ اور ان کے بعد ان کی نسل سے متعدد فقرا و مشائخ ہوئے، جنھوں نے بڑی شہرت پائی اور مرجعِ خلائق

ہوئے۔

شیخ ملہمی کے بڑے بھائی شیخ محمود حاجیؒ اپنے والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ شیخ محمد حاجی اور شیخ برمزید سربنی۔ دونوں بڑے صاحبِ سطوت بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمود کے کئی خلفا تھے۔

شیخ ملہمی اور شیخ محمود کی اولاد اور خلفا کی بدولت سہروردیہ سلسلے کو افغانوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

شیخ احمد بن موسے شروانیؒ جن کے خاندان کا ہم ذکر کر چکے۔ کوہ سلیمان کی چوٹی پر آرام فرما ہیں۔ شیخ اسمٰعیل سربنی کا مزار بھی یہیں ہے۔ شیخ اسمٰعیل نے بڑے سفر کیے۔ اور کئی مشائخ بزرگ کی خدمت میں پہنچے۔ بالآخر اپنے وطن میں مراجعت فرما کر ولائت رود میں مقامِ خواجہ خضر کے پاس ارشاد و ہدائت کا سلسلہ شروع کیا۔ رود میں اس وقت شیخ احمد مسندِ ارشاد و ہدائت کو زینت دے رہے تھے۔ مخزنِ افغانی میں لکھا ہے کہ شیخ احمد اور شیخ اسمٰعیل میں بڑا ارتباط تھا۔ اور وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ حضرت غوث العالم مخدوم شیخ بہاء الدین نے دونوں بزرگوں کے لیے جدا جدا خرقہ اور سجادہ بھیجا اور دونوں کو منشورِ خلافت عطا کیا۔ "ازاں روز شہرتِ ایشاں در اقطارِ ربع مسکوں نافذ گشت۔" شیخ اسمٰعیل کے مزار پر ایک عالی شان گنبد تعمیر ہوا ہے۔ یہ مقام وادیِ خراہ میں ہے۔ یہاں ہر سال موسمِ گرما میں ہزارہا افغان جمع ہوتے ہیں۔ اور دونوں بزرگوں کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے بے شمار بھیڑ بکریاں ذبح ہوتی ہیں۔

شیخ احمد بن موسے شروانیؒ کے متعلق یہ بیان کہ چند جہاں گرد قلندروں کے ایما پر وہ ملتان گئے اور مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کے مرید ہوئے۔ قابلِ قیاس ہے۔ اور شیخ احمد کے تمام خاندان کا ملتان اور اُچ کے سہروردی خاندان سے مسلسل انتساب رہا۔ لیکن شیخ اسمٰعیل سربنی کے متعلق یہ روائت کہ مخدوم نے

ان کی شہرت سن کر انھیں خرقۂ خلافت بھیجا۔ کسی قدر مُستبعد ہے۔ اور شیخ اسمٰعیلؒ کے زمانۂ حیات کے متعلق جو دوسری روایتیں ہیں، وہ بھی ان کے مخدوم ملتانیؒ کے ہم عصر ہونے کے حق میں نہیں۔ افغانی نسب نگار لکھتے ہیں کہ افغانوں کے مورثِ اعلیٰ عبدالرشید قیس المعروف پٹھان کے (جسے رسولِ اکرمؐ کا ہمعصر بتایا جاتا ہے)۔ تین بیٹے تھے۔ سڑبنی۔ بیٹ یا بٹنی اور غرغشتی۔ سب پٹھان قبیلے ان تینوں اور عبدالرشید کے پسرِ خوانده کرانی کی اولاد بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سڑبنی کے اولاد کوئی نہ تھی۔ چنانچہ اس کے بھائی بٹنی نے اس کی درخواست پر اپنا بیٹا اسمٰعیل اس کے پاس بھیج دیا، جو اپنے زُہد و تقوےٰ کی بدولت شیخ اسمٰعیل سڑبنی مشہور ہُوا۔ اور جس کے یُمن و برکت سے سڑبنی کے بہت اولاد ہوئی۔ ظاہر ہے شیخ اسمٰعیل سڑبنی کا زمانہ مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے زمانے سے بہت پہلے ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ جب شیخ احمد شروانیؒ اور دوسرے افغانی مریدوں کی بدولت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کی شہرت افغان علاقے میں ہوئی تو شیخ اسمٰعیل سڑبنی کا انتساب بھی مخدومؒ سے کرلیا گیا۔ ویسے شیخ بیٹ (یا بٹنی) شیخ اسمٰعیل سڑبنی۔ شیخ خرخبون (یا خرشبون) سڑبنی کو نہ صرف صاحبِ کرامت اولیا سمجھا جاتا ہے بلکہ ان کا نام قدیم ترین پشتو شعرا میں بھی آتا ہے۔ جو کلام ان سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے نمونے ادبیاتِ سرحد (پشتو ادب) مؤلفہ رضا ہمدانی میں ملیں گے۔

صوفیہ کے عام تذکروں میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے جس افغان خلیفہ کا زیادہ تر نام ملتا ہے۔ وہ شیخ حسن افغان قدس سرہ تھے۔ مُرشد کو ان پر اتنا ناز تھا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب روزِ قیامت مجھ سے حضرت باری تعالےٰ پوچھیں گے کہ ہماری سرکار میں تم کیا تحفہ لائے ہو۔ تو مَیں کہوں گا کہ "مشغولی و عبادتِ حسن افغان" میرا تحفہ ہے۔ حسن افغان سالہا سال مُرشد کی خدمت میں رہ کر فیض یاب ہوئے۔ اور ان سے کئی خوارق منسوب کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اخبار الاخیار

اور خزینۃ الاصفیا میں حضرت سلطان المشائخ کا بیان ان کی نسبت درج ہے کہ شیخ حسن افغان ایک بہت بڑے ولی تھے۔ اور ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز شیخ حسن ایک گلی میں سے جا رہے تھے کہ مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ شیخ بھی مسجد میں داخل ہوئے اور امام کے پیچھے دوسرے مقتدیوں کی طرح نماز باجماعت ادا کی۔ جب نماز ختم ہو گئی۔ اور لوگ چلے گئے تو وہ امام کے پاس گئے۔ اور کہنے لگے کہ "اے خواجہ! آپ نے نماز شروع کی اور مَیں آپ کے ساتھ بطور ایک مقتدی کے شریک ہو گیا۔ آپ یہاں سے دہلی گئے اور وہاں سے غلام خرید کر لائے۔ پھر ان غلاموں کو لے کر عربستان گئے اور انھیں بیچ کر ملتان واپس آئے۔ مَیں بیچارہ آپ کے پیچھے سرگرداں اور حیران جا بجا پھرتا رہا۔ آخر یہ کیا نماز ہے کہ دل تو تجارت میں ہے اور بظاہر نماز ہو رہی ہے!" امام کو بھی معترف ہونا پڑا کہ واقعی اس کے خیالات پریشان تھے۔

مخزنِ افغانی کے منتشر اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ حسن اصل میں خوجند کے ایک سیّد زادہ تھے۔ وہاں کی ایک خاتون کے ساتھ، جس کی ہمشیرہ ملتان میں بیاہی ہوئی تھیں۔ آپ قحط سالی کے زمانے میں یہاں آئے۔ اس خاتون نے غرغشتی قبیلہ کے ایک افغان (دادی) سے شادی کر لی۔ اور حسن بھی افغانوں میں بس کر اور شادی بیاہ کر کے افغان ہی ہو گئے۔ ان کی اولاد کو خوندی، خوندی یعنی خوجندی کہتے ہیں۔ مخزنِ افغانی میں لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں، ان بچوں کی طرح جو ماں باپ کی نگرانی سے محروم رہ گئے ہوں، آوارہ و آزاد ہو گئے۔ بلکہ چوری اور ڈکیتی کا پیشہ شروع کیا۔ اور غرغشتی قبیلے کے لوگوں نے پشتو میں آپ کا عُرف ہی اُچو یعنی چور رکھ دیا۔ لیکن پھر عنائتِ الٰہی شاملِ حال ہوئی۔ گناہوں سے یک قلم توبہ کی اور شیخ بہاء الدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہو کر مُرید ہوئے۔ ایک عرصہ ان کی خدمت میں گزارا۔ اور بالآخر ایک کامل ولی ہو گئے۔ اس کے بعد مُرشد نے حکم دیا کہ جا کر افغانوں میں

ہدائت و ارشاد کا سلسلہ شروع کرو۔ ("اے حسن برو! در قوم افغاناں ہدائت حق کن")۔ چنانچہ وہ اپنے وطن واپس آئے اور غرشتیوں میں ارشاد و ہدائت کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کے قبیلے کے لوگ زیادہ تر قندھار کے گرد و نواح میں رہتے ہیں۔

خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ آپ کی وفات ۶۸۹ھ یعنی ۱۲۹۰ء میں ہوئی اور ملتان میں اپنے پیر روشن ضمیر کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

اُچہ میں تبلیغی اور صُوفیانہ سرگرمیاں

سیّد جلال الدین بخاریؒ

مغربی پنجاب میں ملتان کے بعد اشاعتِ اسلام کا دُوسرا بڑا مرکز اُچہ تھا جو پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم (پنج ند) کے قریب ایک قدیمی قصبہ ہے۔ اچہ کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک گیلانیہ کہلاتا ہے۔ جہاں قادریہ سلسلے کے بزرگ رہتے ہیں۔ دُوسرا محلہ بخاریاں ہے اور سہروردی سلسلے کا مرکز ہے۔ سب سے پہلے جس سہروردی بزرگ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اچہ کو امتیاز بخشا۔ سیّد جلال الدین مُنیر شاہ میر سُرخ بخاری تھے۔ وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلیفہ تھے۔ آپ کا وطن بخارا تھا۔ پہلے آکر بھکر میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں کے ایک رئیس سیّد بدرالدین بھکری نے آپ سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ لیکن بعض حاسدوں کو ایک نووارد کا اس طرح امتیاز پانا ناگوار ہوا اور انھوں نے آپ کی مخالفت شروع کی۔ آپ ترکِ سکونت کر کے ۱۲۴۴ء میں اچہ آئے اور محلہ بخاریاں کی بنا ڈالی۔ اس زمانے میں اچہ کو دیوگڑھ کہتے تھے۔ اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ آپ کے آنے سے اسلام کو رونق ہوئی۔ راجے نے آپ کی مخالفت کی۔ لیکن بالآخر اسے اپنی ریاست سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اور یہ شہر اشاعتِ اسلام کا

لہ بہاولپور گزیٹیر۔ لیکن بعض تاریخی شواہد اس کے خلاف ہیں۔

ایک بڑا مرکز بن گیا۔ پنجاب میں آپ نے شہر جھنگ سیالاں آباد کیا۔ اور ایک مدت تک مغربی پنجاب میں اشاعتِ اسلام کی۔ راجپوتوں کے کئی قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ جن کی فہرست ریاست بہاولپور کے سرکاری گزیٹیر میں درج ہے۔ ہندوستان کے بخاری سیدوں کا سلسلہ آپ پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کی وفات ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں ہوئی۔ مزار اچہ میں ہے۔

شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ایک اور خلیفہ جنھوں نے اس علاقے میں تبلیغِ اسلام کی، حضرت موسےٰ نواب تھے۔ ان کے دادا کیچ مکران کے نواب تھے۔ اس لیے لفظ نواب ان کے نام کا بھی جزو ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ پر دو قبیلے مسلمان ہوئے۔

اچہ کے ایک اور صاحبِ سطوت بزرگ جن کا ذکر حضرت مخدوم جہانیاں کے ملفوظات اور معاصرانہ تواریخ (مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی) میں آتا ہے، شیخ جمال الدین اچوی تھے۔ وہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید تھے اور ان کے خاندان کو اچہ کے بخاری سجادہ نشینوں کی اتالیقی کی عزت بھی حاصل رہی ہے۔ شیخ جمال کی وفات سنہ ۱۳[illegible]ء میں ہوئی۔ اچہ کے جس حصے میں آپ کا مزار ہے۔ اسے اچہ جمالی بھی کہتے ہیں۔

مغربی پنجاب میں شیخ بہاء الدین زکریا بابا فرید اور ان کے خلفا کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے کی ہلچل ان کی تبلیغی کوششوں کے لیے سازگار تھی۔ علاء الدین خلجی کی فتوحات سے کئی قوموں نے (مثلاً کئی راجپوت قبیلوں نے راجپوتانہ سے) نقلِ مکان کیا تھا۔ اور اس خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کی حالت میں انھیں ان بزرگوں کا پیغام آبِ حیات کی طرح تھا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

اچہ کے جس بزرگ نے سید جلال بخاری سے بھی زیادہ نام پایا حضرت مخدوم جہانیاںؒ تھے، جن کا پورا نام مع القاب کے میر سید جلال الدین مخدوم جہانیاں

---

[1] آپ کے حالات زیادہ تر سیر العارفین۔ اخبار الاخیار۔ معاصرانہ کتب تواریخ اور آپ کے ملفوظات سے ماخوذ ہیں

جہاں گشت بخاری تھا۔ آپ سید جلال الدین منیر شاہ بخاریؒ کے پوتے اور سید صدر الدین مشہور بہ راجو قتال کے حقیقی بھائی تھے۔ آپ کا بہت سا زمانہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ اس لیے آپ کو مخدوم جہانیانِ جہاں گشت کہتے ہیں۔ آپ نے شمالی ہندوستان بہار و بنگال کے علاوہ عرب، مصر، شام، عراقین، بلخ و بخارا کی سیر کی اور اس دوران میں چھتیس ۳۶ حج کیے اور متعدد بزرگوں سے فیض پایا۔

سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا شیخ صدر الدین سے خرقہ حاصل کیا۔ پھر ملتان جا کر شیخ الاسلام شیخ رکن الدین ابو الفتح کے پاس علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ حضرت چراغ دہلی کے بھی مرید تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ نے بہت سا وقت امام عبداللہ یافعی کی صحبت میں گزارا اور مدینہ منورہ میں دو سال قیام کر کے سند المحدثین شیخ عفیف الدین عبداللہ المطریؒ سے عوارف المعارف اور سلوک کی دوسری کتابیں پڑھیں اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔

مشہور ہے کہ آپ کو چودہ خانوادوں میں بیعت کی اجازت تھی اور آپ جس کسی سے معانقہ کرتے اس سے فیض اخذ کر لیتے۔ یعنی جس سالکِ راہ سے سابقہ پڑتا اُس پر اپنی توجہ کرتے اور اس کی اس طرح خدمت کرتے کہ وہ بے اختیار ہو کر اپنی نعمتیں آپ کے سپرد کر دیتا۔

اپنے زمانے میں آپ کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ سلطان محمد تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام کا منصب اور علاقہ سیوستان میں خانقاہ محمدی اور مضافات کی سند عطا کی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ نے سب کچھ ترک کر دیا اور حج کے لیے روانہ ہو گئے۔

فیروز تغلق بھی آپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے ٹھٹہ کا دوسری مرتبہ محاصرہ کیا تو اگرچہ وہ اس سے پہلے سندھیوں کے ہاتھ سے سخت تکلیف اُٹھا چکا تھا۔ اور اس کا دل ان کے خلاف غصے اور جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے مخدوم جہانیان کی سفارش پر انھیں بالکل معاف کر دیا اور

کوئی سزا نہ دی۔

فیروز تغلق شیخ الاسلام شیخ علاء الدین اجودھنی بنبسیرہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کا مرید تھا۔ لیکن مخدوم جہانیاں کا وہ جس طرح پاس کرتا تھا، اس کے متعلق عفیف تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے :-

"روایت ہے کہ حضرت سیّد جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہر دوسرے یا تیسرے سال بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے اچہ سے فیروز آباد تشریف لاتے۔ بادشاہ اور جناب سیّد کے درمیان بے حد محبت تھی اور ہر دو بزرگوار اس محبت میں اضافہ کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

حضرت سیّد جب اچہ سے تشریف لاتے اور فیروز آباد کے نواح میں پہنچے تو بادشاہ مسند تک حضرت کے استقبال کو جاتا اور ملاقات کے بعد جناب ممدوح کو بے حد اعزاز کے ساتھ شہر میں لاتا۔

جناب سیّد کبھی تو منارہ سے متصل کوشک معظم کے اندر اور کبھی شفا خانے میں، کبھی شاہزادہ فتح خان کے خطیرہ میں قیام فرماتے تھے۔

مختصر یہ کہ جناب سیّد اپنے قیام گاہ سے مقررہ طریقے کے مطابق بادشاہ سے ملاقات کے لیے تشریف لاتے اور جیسے ہی حضرت ممدوح محل حجاب میں پہنچ کر سلام کرتے بادشاہ باوجود اس عظمت و شان کے تخت گاہ پر ایستادہ ہو جاتا اور بے حد تواضع کے ساتھ جناب سیّد سے ملاقات کرتا اور اس کے بعد ہر دو بزرگ بالائے بام خانہ تشریف فرما ہوتے۔

جب حضرت سیّد واپس ہوتے اس وقت بھی فیروز شاہ بالائے بام خانہ تعظیم کے لیے ایستادہ ہوتا۔ اور جب تک کہ حضرت ممدوح محل حجاب تک نہ پہنچتے بادشاہ اسی طرح کھڑا رہتا۔

حضرت سیّد بادشاہ کو سلام کرتے اور بادشاہ جواب میں سلام کرتا۔ اور جب حضرت ممدوح نظر سے غائب ہو جاتے اُس وقت بادشاہ بیٹھ جاتا۔

سُبحان اللہ! کیا حُسنِ ادب تھا، جو بادشاہ جنابِ سیّد کے لیے بجالاتا تھا۔ فیروز شاہ بھی دوسرے تیسرے روز جنابِ سیّد کے قیام گاہ پر حضرت سے مُلاقات کرنے کے لیے حاضر ہوتا اور یہ دو بزرگ باہم ایک جا ہو کر محبت آمیز گفتگو فرماتے تھے۔ اچہ اور دہلی کے باشندے اپنی حاجات جنابِ سیّد کے حضور میں عرض کرتے اور حضرت سیّد اپنے خدام کو حکم دیتے کہ ان حاجات کو قلم بند کرلیں۔

جب بادشاہ حضرت کی ملاقات کو آتا تو جنابِ ممدُوح وہ کاغذ فیروز شاہ کی خدمت میں پیش فرماتے اور بادشاہ اس کاغذ کو غور سے ملاحظہ فرما کر ہر حاجتمند کی اس معروضے کے مطابق حاجت روائی کرتا۔ چند روز کے بعد جنابِ سیّد فیروز آباد سے اچہ روانہ ہوجاتے اور حضرت شاہ اسی طرح ایک منزل مشائعت کرتا۔[1]

حضرت مخدوم جہانیاں جس ہمت و استقلال کے ساتھ دوسرے سہروردی بزرگوں کی طرح اپنے اثر و رسُوخ کو حاجتمندوں کی مطلب براری کے لیے صرف کرتے تھے۔ اس کی سیر العارفین میں ایک دلچسپ مثال درج ہے۔ شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ فیروز تغلق کا وزیر خان جہاں تلنگی شروع میں حضرت کا مخالف تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک نویسندہ کے بیٹے کو کسی بات پر قید کرلیا۔ اس کا باپ حضرت مخدوم جہانیاں کے پاس پہنچا اور آپ خان جہاں کے پاس سفارش کے لیے گئے۔ لیکن اس نے اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ نہ میں شیخ سے ملوں گا اور نہ اس کی سفارش مانوں گا۔ اس سے کہدو کہ میرے دروازے پر نہ آئے۔ کہتے ہیں کہ شیخ اُنیس[19] مرتبہ خان جہاں کے دروازے پر گئے اور ہر دفعہ یہی جواب سُنا۔ انیسویں مرتبہ خان نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ اے سیّد! کیا تم میں ذرّہ بھر غیرت نہیں کہ میں نے اتنی مرتبہ جواب دیا اور تم پھر بھی چلے آتے ہو۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے جواب دیا کہ اے عزیزم! میں جتنی مرتبہ آتا ہوں اس کا

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمہ تاریخ فیروز شاہی از عفیف (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ) ص ۵-۳۳۳

ثواب مجھے مل جاتا ہے، لیکن ایک مظلوم کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مظلوم کو تمھاری قید سے رہائی دلواؤں تاکہ اس کا نیک اجر تمھیں بھی ملے۔ یہ سن کر خان جہاں کا دل نرم ہوا۔ وہ باہر آیا۔ حضرتِ شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا، اور ان کے ارشاد کی تکمیل کی۔

آپ کے حالات میں کئی کتب تصنیف ہوئیں۔ مثلاً خزانہ جلالی[1]، تاریخ محمدی، مناقب قطبی۔ ان میں سے کوئی چیز ہماری نظر سے نہیں گزری اور غالباً سب کی سب ابھی زیورِ طباعت سے محروم ہیں[2]۔ لیکن آپ کے ملفوظات کی دو جلدیں الدر المنظوم فی ملفوظا المخدوم[3] کے نام سے اُردو میں ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہیں ان میں فوائد الفواد والی بات کہاں۔ لیکن ان سے ملتان اور اچہ کے رُوحانی

---

[1] اچہ شریف کے سفر میں سجادہ نشینِ حال کی مہربانی سے اس کتاب کا قلمی نسخہ دیکھنے کا موقع ملا۔ مسائل اور ارشادات کی ایک مبسوط کتاب ہے۔ سوانحی حالات بہت کم ہیں۔

[2] سندھ اور مغربی پنجاب کی رُوحانی تاریخ لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ یہاں زیادہ تر سہروردیوں نے کام کیا اور سہروردیوں کی بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً حضرت مخدوم جہانیاں کے ملفوظات اور حالات کے علاوہ شیخ صدرالدین ابن شیخ بہاءالدین زکریا کے ملفوظات کنز الفوائد۔ شیخ رُکن الدین کے ملفوظات اور حالات وغیرہ مثلاً فتاوائے صوفیہ، جمع الاخبار کا اخبار الاخیار میں ذکر ہے۔ لیکن آج ہم ان سے محروم ہیں۔ اسی طرح مولانا آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں تذکرہ مشائخ سندھ کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بھی باوجود تلاش کے ہمیں دستیاب نہیں ہوئی۔

[3] ایک بار ۷۹ھ۳ میں آپ دہلی تشریف لائے۔ اس وقت سلطان فیروز تغلق مہم سامانہ کے سلسلے میں دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ آپ کو اس کی ملاقات کے لیے دہلی میں دس مہینے رُکنا پڑا۔ اس دوران میں لوگ آپ کی مجلس میں حاضر ہو کر مذہبی، فقہی، صوفیانہ مسائل پر سوالات کرتے تھے۔ اور آپ جواب دیتے تھے۔ ان تمام ملفوظات کو آپ کے مریدنے جامع العلوم کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ الدرر المنظوم اس کا اُردو ترجمہ ہے۔

پس منظر سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے۔

آپ کے ملفوظات سے پتا چلتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر شدت سے عامل تھے۔ اور دوسرے سہروردی بزرگوں کی طرح غیر شرعی امور پر سختی سے ملامت کرتے۔ ایک مرتبہ اچہ میں ایک شخص وارد ہوا جو اپنے تئیں ولی اللہ کہتا تھا۔ عوام الناس اس کے پاس کثرت سے آنے جانے لگے۔ مخدوم جہانیاں بھی گئے۔ جب اس کے پہلو میں جا کر بیٹھے تو وہ بڑے جلال سے بولا: "اے سید! ابھی ابھی حق تعالےٰ میرے پاس سے اُٹھ کر گیا ہے۔" آپ یہ سُن کر غضب ناک ہو گئے۔ فرمایا کہ "اے بدبخت! تو کافر ہو گیا۔ پھر سے کلمۂ شہادت پڑھ اور مسلمان ہو۔" اور قاضیٔ شہر کے پاس جا کر شکایت کی کہ اس کو طلب کرو۔ اگر توبہ کرے تو معاف کر دو ورنہ حدِ شرعی جاری کر دو۔ اور قتل کرو۔ چونکہ اس شخص کے ماننے والے کئی تھے۔ اس لیے قاضی کو اس معاملے میں تامل تھا۔ لیکن آپ نے حاکمِ شہر کو کہلا بھیجا کہ ایک شخص شہر میں کفر پھیلا رہا ہے۔ اگر تم نے اسے سزا نہ دی تو میں بادشاہ کے پاس شکائت کروں گا۔ چنانچہ وہ شخص شہر بدر کر دیا گیا۔ (الدرۃ المنظوم ص ۲۱۳)

اسی طرح روہڑی کے قریب ایک غار میں ایک درویش رہتا تھا، جو کہتا تھا کہ خدائے تعالےٰ نے مجھے نماز معاف کر دی ہے۔ آپ اس کے پاس پہنچے۔ اور پوچھا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ رسولِ اکرمؐ کا قول ہے الفرق بَیْنَ المؤمنِ والکافرِ الصَّلوٰۃ۔ درویش نے جواب دیا: سیدا! میرے پاس جبریل آتے ہیں۔ بہشت کا کھانا لاتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کا سلام پہنچاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تمہارے لیے نماز معاف کر دی گئی۔ مخدوم جہانیاں نے غضب ناک ہو کر کہا: بے ہودہ مت بکو۔ محمدؐ رسول اللہ صلعم کے لیے تو نماز معاف نہیں ہوئی۔ تجھ جیسے جاہل کے لیے کیسے معاف ہو سکتی ہے۔ اور وہ تو شیطان ہے، جو تمہارے پاس آ کر کہتا ہے کہ تمہارے

لیے نماز معاف ہوگئی۔ القصّہ اس سے توبہ کرائی اور جو نمازیں فوت ہوئی تھیں ان کی قضا پڑھوائی۔

الدرالمنظوم میں بعض جگہ حضرت مخدوم کے ہاتھ پر ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ گجرات کے ایک راجپوت (مولی الاسلام) کا ذکر ہے، جو حضرت کے ہاتھ پر مسلمان ہُوا۔ اور جسے آپ نے تعلیم دے کر گجرات اس لیے بھیجا کہ "اپنے گھر والوں اور قوم کو مسلمان" کرے۔ (ص ۳۲)

آرنلڈ بھی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ مخدوم جہانیاں نے گجرات میں اشاعتِ اسلام کا کام کیا۔ حضرت قطب عالم اور حضرت شاہ عالم جن کے مزار احمد آباد گجرات میں مرجع خاص و عام ہیں۔ آپ کے پوتے اور پڑپوتے تھے۔

لہ انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے تیئسویں اجلاس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے ایک دستاویز کا ذکر کیا ہے۔ جس سے سلطان محمود بیگڑہ کی فتح گرنار، حضرت مخدوم جہانیاں کی تبلیغی کوششوں اور سہروردیوں کے صوفیانہ نظام پر روشنی پڑتی ہے۔ کاٹھیاواڑ میں شیخ صاحب منگرول کی ریاست ہے۔ جن کے مورث اعلے سید سکندر بن مسعود کو حضرت مخدوم جہانیاں نے اس علاقے میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا تھا۔ جب فیروز تغلق کے بعد حکومتِ دہلی کمزور ہوگئی تو گرنار کے ہندو مقدم نے سر اٹھایا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنی ڈاڑھیاں منڈائیں۔ گاؤکشی سے توبہ کریں اور مسجدوں میں شیولنگ نصب کر کے اس کی پوجا کریں۔ اس پر منگرول (سابق منگلور) کے سجادہ نشین نے حضرت شاہ عالم صاحب کو جو اس وقت احمد آباد میں بڑا اقتدار رکھتے تھے، لکھا کہ ہمارے بزرگوں کو آپ کے پردادا حضرت مخدوم جہانیاں قدس سرہ نے یہاں بٹھایا تھا۔ اور آج ہمارے سر پر یہ گزر رہی ہے۔ شاہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ خدا کارساز ہے۔ آپ فلاں فلاں ورد و وظیفے پڑھتے رہا کریں اور انشاءاللہ مَیں بھی پوری کوشش کروں گا۔ چنانچہ جلد ہی سلطان محمود بیگڑہ نے گرنار فتح کر لیا اور سارا علاقہ اسلامی مقبوضات میں داخل ہُوا۔ (ملاحظہ ہو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کی کارروائی ۱۹۴۶ء)

مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ بہاولپور کے سرکاری گزٹیر میں ان کی فہرست درج ہے۔ ان قبیلوں کی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے۔ اور ان میں کھرل راجپوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔ آپ کا فیض ہندوستان کے سب علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ کبھی اوچ، کبھی دہلی، کبھی پنڈوہ، کبھی جونپور۔ اس سے ارشاد و ہدائت کا ایک وسیع سلسلہ قائم کرنے کا موقع ملا۔ اور آپ کے مریدوں میں اودھ اور بلادِ شرقی کے بھی کئی خالوادے تھے۔ چنانچہ آپ کے خلفا میں سے آپ کے بھائی راجو قتالؒ کے علاوہ لکھنؤ کے شیخ قوام الدین، ایرج کے شیخ یوسف بدہ اور دہلی کے کئی بزرگوں کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کی وفات سنہ ۱۳۸۴ء میں ستتر برس کی عمر میں ہوئی۔

سید راجو قتالؒ

حضرت مخدوم جہانیان کے بھائی سید صدر الدین المعروف راجو قتال بھی جو ان کے بعد آبائی مسند پہ بیٹھے، بڑے صاحب اثر بزرگ گزرے ہیں۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔ اس لیے انھیں قتال یعنی قتالِ نفس کہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غیر معمولی ریاضتوں کی وجہ سے آپ کے مزاج پر کسی حد تک خشکی غالب آگئی تھی۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث آپ کی نسبت لکھتے ہیں: "پیوستہ در عالم استغراق بود و با خلق انبساط و اختلاط نہ کردے"۔

سیر العارفین میں آپ کی جلالی شان اور شدتِ حال کے کئی مظاہرے بیان ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کے اس رنگِ طبیعت اور سہروردیوں کے تبلیغی اسلامی جوش کا اندازہ لواہون نامی ہندو تحصیلدار کے واقعہ سے ہو سکتا ہے، جسے مسلمان بنانے یا کم از کم ثابت کرنے کے لیے سید راجو قتال نے اُچھ سے دہلی کا سفر کیا!

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب حضرت مخدوم جہانیان مرض الموت میں

تھے تو وہاں کا ہندو تحصیلدار بیمار پُرسی کے لیے آیا اور دورانِ گفتگو میں کہنے لگا کہ جس طرح خدائے تعالےٰ نے رسولِ عربی کو ختم الانبیا بنایا تھا، اسی طرح حضرت مخدوم جہانیاں ختم الاولیا ہیں۔ نواہون کے اس فقرے پر سید راجو قتال نے کہا کہ رسُولِ اکرم کو آخری نبی ماننے سے تم مسلمان ہو گئے۔ اب اسلام کے احکام بجالانے تم پر لازم ہیں۔ ورنہ تم مُرتد سمجھے جاؤ گے۔ نواہون مسلمان ہونے پر راضی نہ تھا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر دہلی پہنچا۔ اور فیروز تغلق بادشاہِ دہلی کی خدمت میں سب حال عرض کیا۔ ادھر جب حضرت مخدوم کی تجہیز و تکفین سے سید راجو قتال فارغ ہوئے تو انھوں نے بھی دہلی کا رُخ کیا۔ جب بادشاہ نے یہ خبر سُنی تو اُس نے علما سے اس امر میں استصواب کیا۔ اس نے نواہون کو مسلمان ہونے کے لیے کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ اب بادشاہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈا جائے، جس سے سید صدرالدین بھی ناراض نہ ہوں اور نواہون پر بھی ناواجب جبر نہ ہونے پائے۔ حاضرینِ دربار میں سے قاضی عبدالمقتدر کا لڑکا شیخ محمدؒ ایک تیز طبع اور ذہین نوجوان تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ جب سید آئیں تو ان سے کہنا کہ کیا آپ نواہون کافر کا قضیہ فیصل کرنے آئے ہیں۔ ظن غالب ہے کہ وہ "ہاں" کہیں گے۔ اور پھر ان کے لیے نواہون کو مسلمان کہنا مشکل ہو جائے گا۔ بادشاہ کو یہ بات پسند آئی۔ چنانچہ جب سید راجو قتال تشریف لائے تو بادشاہ نے ان سے یہی سوال کیا۔ لیکن سید صاحب نے فوراً جواب دیا کہ مَیں تو نواہون مسلمان کا، جس نے میرے اور معتبر گواہوں کے سامنے اسلام کا اقرار کیا ہے، فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ اس پر شیخ محمدؒ بن قاضی عبدالمقتدر بولا کہ اس نے مناسب طریقے پر اور دل سے اسلام کا اقرار نہیں کیا۔ اور اس کا اسلام شرعی طریقے پر ثابت نہیں ہوتا۔ آپ اسے کس طرح مسلمان کہتے ہیں۔ اس پر سید راجو قتال کو طیش آیا۔ اُنھوں نے غصے سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ وہ اُسی وقت دردِ شکم سے تڑپنے لگا۔ اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ بادشاہ نے

جب یہ واقعہ دیکھا تو اس نے چُپ چاپ نواہون کو سیّد قتال کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اسے مسلمان ہونے کے لیے کہا۔ لیکن وہ نہ مانا اس پر آپ نے ارتداد کا الزام دے کر اس کی گردن کاٹ دی[1]۔

ملکی تاریخ میں آپ کا نام اس واقعے کی وجہ سے آجاتا ہے۔ لیکن آپ کا اصل کام اُچہ میں اشاعتِ اسلام اور گجرات وغیرہ کے صاحبِ ہمت بزرگوں کی تربیت ہے جنھیں آپ نے علومِ باطنی سے مالا مال کر کے گجرات کے قدیمی دارالخلافے میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجا۔ آپ کی وفات ۸۲۷ھ میں ہوئی۔

آپ کے بعد اس خاندان کے اور کئی بزرگوں نے اچہ کو صُوفیانہ ارشاد و ہدایت اور اشاعتِ اسلام کا بڑا مرکز بنائے رکھا۔ لیکن جب پندرھویں صدی کے آخر میں سیّد محمدؒ غوث گیلانی قدس سرہ یہاں اقامت پذیر ہوئے اور سہروردیہ سلسلے کے علاوہ قادریہ سلسلے کا بھی یہ مقام مرکز بن گیا تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ یہاں ملتان، لاہور اور دہلی کی طرح کسی بزرگ کی قبر پر کوئی عالی شان روضہ نہیں۔ لیکن پھر بھی اچہ کی خاکِ پاک میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ لکھتے ہیں: "گویند زمینِ اچہ وصحرائے او کیفیتے وحالتے دارد کہ در زمین ہائے دیگر نیست!"

مغربی پنجاب میں اشاعتِ اسلام

ملتان اور اُچہ کے بزرگوں کے جو حالات ہم نے صفحاتِ بالا میں درج کیے ہیں وہ بیشتر اولیا کے تذکروں اور مشائخ کے ملفوظات سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں یہ کتابیں بڑی کارآمد ہیں اور اگر عقیدت مند مرید انھیں ترتیب نہ دے جاتے تو مذہبی زندگی کے کئی باب کورے رہتے لیکن افسوس ہے کہ ان کتابوں میں زور ان باتوں پر دیا گیا ہے جن کی قدر و قیمت زمانے کے ہاتھوں کم ہو گئی

---

[1] سیر العارفین ص ۱۵۹-۱۶۰

ہے ۔ کرامات اور خارق العادت واقعات کے تو ان تذکروں میں طومار بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن بزرگوں کے تبلیغی کارناموں اور ان کی خالص بشری خوبیوں اور اخلاق وعادات سے بڑی بے اعتنائی برتی گئی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تفتیشِ حالات کے لیے کوئی اور ماخذ نہ ہوتا تو معترض کہہ سکتے تھے کہ چونکہ صوفیائے کرام کے اپنے تذکروں میں اشاعتِ اسلام کا خاص ذکر نہیں۔ اس لیے دورِ حاضر کے مسلمانوں کا یہ دعوٰے کہ ہندوستان میں اسلام بادشاہوں کی تلوار سے نہیں بلکہ اہل اللہ کے فیض و برکت سے عام ہُوا ہے ۔ درخورِ اعتماد نہیں ۔

لیکن خوش قسمتی سے تحقیق واقعات کا ایک اور اہم ماخذ بھی ہے ۔ گورنمنٹ نے مختلف اضلاع اور علاقوں کے جو گزیٹر مرتب کرائے ہیں، ان میں مقامی باشندوں کی مذہبی سرگزشت کا بھی ذکر آتا ہے ۔ بعض رپورٹیں (مثلاً صوبہ سرحد اور بلوچستان اور صوبہ سندھ کے اضلاع کی) تو اس بارے میں بڑی مایوس کُن ہیں اور ان میں سطحی معلومات کو دوسری رپورٹوں اور عام مروجہ کتب سے نقل کر دیا گیا ہے، لیکن جہاں کہیں یہ رپورٹیں قابل اور اہلِ علم افسروں کے قلم سے لکھی گئی ہیں، وہاں مقامی معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جس سے علاقے کی مذہبی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ مغربی پنجاب اس معاملے میں بڑا خوش قسمت رہا ہے اور ملتان، منٹگمری اور ریاست بہاولپور کی رپورٹوں سے مذہبی مورخ کو بیش قیمت مدد ملتی ہے ۔

ضلع ملتان کا گزیٹر مسٹر ایڈورڈ میکلیگن نے مرتب کیا تھا، جو ایک زمانہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نائب صدر رہے ۔ اور اپنی تاریخی تصانیف کی وجہ سے اہلِ علم میں ممتاز ہیں ۔ اپنی رپورٹ میں سر ایڈورڈ نے علاقے کی مذہبی تاریخ پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے ۔ اور ممالک اسلامی میں تاتاریوں کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"ایک لحاظ سے خراسان اور مغربی ایران کی تباہی سے ہندوستان کے اس

حصہ (مغربی پنجاب) کو فائدہ پہنچا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے علما و صلحا کی ایک کثیر تعداد یہاں آگئی۔ جن میں سے بعض تو دارالسلطنت دہلی کی طرف چلے گئے لیکن بہت سے ملتان کے علاقے میں ہی بس گئے۔ غوری افغانوں کی ابتدائی ہلچل کے زمانے میں ہی گردیزی سیدوں کا ایک خاندان اس ضلع میں آباد ہوا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد لیہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے قریب کوٹ کروڑ میں خوارزم سے آکر قریشیوں کا ایک خاندان آباد ہوا جس میں شیخ بہاء الدین زکریا بہا الحق پیدا ہوئے، جنھوں نے تمام اسلامی دنیا کی سیر و سیاحت کے بعد ملتان کو اپنا مستقر بنایا۔ اسی زمانے میں سبزوار سے پیر شمس تبریز اور کاشان سے قاضی قطب الدین ملتان تشریف لائے اور پاکپتن میں بابا فرید گنج شکر اور دہلی میں (ملتان کے راستے سے) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رونق افروز ہوئے۔ اچہ میں سید جلال بخاری جو ملتان، مظفر گڑھ اور بہاولپور کے کئی خانوادوں کے مورثِ اعلےٰ ہیں۔ اسی زمانہ میں تشریف لائے اور انھی ایام کے لگ بھگ سلطان سخی سرور نے فروغ پایا۔ جن کے والد بخارا سے آکر ضلع ملتان کے شہر سکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔

ان مقدس ہستیوں اور ان کے بے شمار رفقائے کار نے اس علاقے کے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کا بیڑا اٹھایا اور یہ ان بزرگوں کی تلقین اور ان کے اثر کا، نہ کہ کسی بادشاہ کی تیغ آزمائی کا نتیجہ ہے کہ اب مغربی پنجاب کے اکثر باشندے مسلمان ہیں۔ ابتدا میں مسلمانوں نے اشاعتِ اسلام سے جو سرد مہری برتی تھی، وہ اس مذہبی جوش کی وجہ سے جو منگولوں اور مسلمانوں کی کشمکش میں پیدا ہوا، جاتی رہی۔ اب ایک بادشاہ کے مقبرے میں ایک مذہبی بزرگ (شیخ رکن العالم) کو جگہ ملی اور اس زمانے سے ملتان کی ان مقدس ہستیوں اور مقدس مقامات کا آغاز ہوا جن کی بدولت ملتان کو تمام اسلامی دنیا میں ایک غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔

سر ایڈورڈ میکلیگن نے مختلف قبیلوں کا ذکر کرتے ہوئے بعض مشہور قبائل

کے قبولِ اسلام کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ مثلاً راجپوتوں میں سیال ایک مشہور قبیلہ ہے، جو ملتان، منٹگمری، جھنگ (سیالان) میں کثرت سے آباد ہے۔ یہ قبیلہ بابا فرید گنج شکر کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ نون مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ اور جویہ راجپوتوں کو شیخ رکن العالم نے مسلمان کیا۔

سر ایڈورڈ میکلیگن نے مختلف قبائل کی نسبت جو تفصیلات دی ہیں، ان پر مسٹر پورن اور مسٹر ڈیس نے، جنھوں نے منٹگمری کا گزیٹیر مرتب کیا ہے۔ بعض باتیں اضافہ کی ہیں۔ وہ کھرل راجپوتوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کا مورثِ اعلیٰ ہستناپور کا راجا کرن تھا۔ اس کے ایک جانشین بھوپا نے ہستناپور چھوڑ کر اچہ میں رہائش اختیار کی اور یہاں بھوپا اور اس کے بیٹے کھرل نے حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اچہ سے یہ قبیلہ بڑھتا بڑھتا دریائے راوی کے دونوں طرف پھیل گیا۔ اسی طرح وٹو قبیلہ کو جو ستلج کے دونوں بانہوؤں پر ساٹھ میل تک اور علاقہ گوگیرہ میں آباد تھا، بابا فرید نے مسلمان کیا۔ سیالوں کی نسبت اس گزیٹیر میں لکھا ہے کہ وہ ۱۲۵۸ء کے قریب بابا فرید کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

بزرگانِ کبار کی ان کوششوں کے علاوہ اس گزیٹیر کے ایک اندراج سے اسلام کی ان جمہوری خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے، جن سے اشاعتِ اسلام کا کام آسان ہو گیا۔ اچھوت اقوام کے ضمن میں اس رپورٹ میں لکھا ہے: "مُصلّی، اگرچہ اب کی مردم شماری سے اچھوت اقوام میں شمار نہیں ہوتے۔ لیکن ان کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو چوہڑے تھے، جو مسلمان ہو کر مُصلّی بن گئے۔ ان کی تعداد اس ضلع میں چھیالیس ہزار سے زیادہ ہے۔ دیہات میں تو وہ خاکروبی اور کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں، لیکن شہروں میں وہ مختلف اقسام کے کئی پیشے جنھیں ہندو چوہڑے اختیار نہیں کر سکتے، اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جولاہوں، باورچیوں، بہشتیوں، رنگسازوں کا بھی کام کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر چوہڑے اور اس طرح کے دوسرے پسماندہ قبیلے جن پر ہندو ہونے کی صورت میں ذلیل ترین پیشوں کے علاوہ باقی سب اقتصادی دروازے بند تھے ۔ مسلمان ہو کر تمدنی لحاظ سے اس طرح ترقی کر سکتے تھے تو پھر ان کے لیے مسلمان ہونا کس قدر آسان اور دنیوی نقطۂ نظر سے بھی کس قدر مفید ہو گا ۔

سندھ میں اشاعتِ اسلام

سیاسی حالات ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سندھ میں عرب حکومت کے کمزور ہو جانے پر شمالی سندھ میں ملتان اور جنوبی سندھ میں منصورہ دو خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں، جن پر ایک زمانے میں قرامطہ قابض ہو گئے ۔ سلطان محمود غزنوی نے انھیں شکست دے کر یہ مقامات اپنی سلطنت میں شامل کر لیے، لیکن جب وہ ان دور افتادہ مقامات پر اپنا ضبط قائم نہ رکھ سکے تو قرمطیوں نے پھر سر اٹھایا اور سلطان محمد غوری کو از سرِ نو انھیں زیر کرنا پڑا ۔ اس کے بعد کچھ دیر تک سندھ حکومتِ دہلی کے ماتحت رہا ۔ صوبیدار کا صدر مقام ملتان تھا اور وہ مغربی پنجاب اور سندھ کا حکمران ہوتا تھا ۔ ملتان کے تین صوبیدار ناصر الدین قباچہ، خان شہید ابن غیاث الدین بلبن اور غازی ملک المعروف غیاث الدین تغلق تاریخ میں خاص طور پر مشہور ہیں ۔

اس زمانے میں سندھ کے بعض حصوں کو ایک حد تک خود مختاری حاصل تھی اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جن میں سے بعض ہندو راجاؤں کے تابع تھیں، دہلی اور ملتان کے منتظم اور با اثر حاکموں کی تو اطاعت کرتیں، لیکن جب موقع ملتا، خود مختاری کا رنگ اختیار کر لیتیں ۔ ان حکمرانوں میں سے ٹھٹھہ کا سومرہ خاندان خاص طور پر مشہور ہے ۔ جس کا اثر اور اقتدار کسی نہ کسی صورت میں صدیوں تک برقرار رہا ۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ وہ عراق کے شہر سامرہ سے حجاج بن یوسف کے عہد میں آئے تھے ۔ لیکن ان لوگوں کے

نام ہندوانہ تھے۔ انگریز مورخین کی رائے ہے کہ وہ اصل میں راجپوت تھے اور مسلمانوں اور عربوں میں اپنا اثر بڑھانے کے لیے اپنے حسب و نسب کے متعلق غلط دعوے کرتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ وہ "عربی ہند و مخلوط تھے"۔ اسمٰعیلی مذہب کے پیرو تھے اور جس طرح قرمطی اور اسمٰعیلی اسلامی عقائد کے ساتھ ہر جگہ کے کچھ مقامی مراسم اور اعتقادات کو شامل کر لیتے تھے، تبلیغ میں آسانی کے لیے ان لوگوں نے بھی یہی کیا تھا۔ اس لیے ان میں ہندوانہ نام اور رسمیں آگئی تھیں۔ دونوں رائیں قیاس پر مبنی ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ سومری صحیح طور پر عرب سُنی مسلمان نہ تھے۔ ان کے نام اور کئی رسمیں ہندوانہ تھیں۔

محمد تغلق کے زمانے میں شاہِ دہلی اور سومریوں میں کشمکش شروع ہوئی اور اس دوران میں جنوبی سندھ کی حکومت سومریوں سے نکل کر سمہ قوم کے ہاتھ میں آگئی۔ اس موقع پر فرشتہ لکھتا ہے "در آخر عہد شاہ محمد تغلق شاہ بسعی و امداد مسلمانان دولت از خاندان طبقہ سومرگان بفرقہ سمگان منتقل شد و اکثر حکام ایشاں بدولت اسلام اختصاص داشتند" اس سے خیال ہوتا ہے کہ سومری صحیح طور پر مسلمان نہ تھے بلکہ سمہ قبیلے کے سارے حکام بھی دولتِ اسلام سے شرفیاب نہ تھے!

سمہ خاندان سے سلطان فیروز شاہ تغلق کی چپقلش ہوئی۔ شروع میں تو بادشاہ کو کامیابی نہ ہوئی اور اسے گجرات ناکام واپس جانا پڑا۔ لیکن اگلے سال وہ زیادہ فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ سمہ سردار نے کام بگڑتا دیکھا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پاس بمقام اچہ قاصد بھیجا۔ اور درخواست کی کہ بادشاہ سے مصالحت کرادیں۔ حضرت مخدوم تشریف لائے اور فریقین میں مناسب شرائط پر صلح کرادی۔ ان شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ سمہ سردار (تماچی) اور دوسرے اُمرا فیروز تغلق کے ساتھ دہلی جائیں گے اور وہاں رہیں گے۔ اس خاندان کے پہلے تین سرداروں کے نام ہندوانہ ہیں (جام اونر، جام جونا، جام تماچی) فرشتہ نے اس سے قیاس کیا ہے کہ پہلے تین سردار ہندو تھے اور بعد کے مسلمان ہوئے

سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ لوگ شروع میں اپنا قومی نام رکھتے تھے۔ بعد میں سلاطین دہلی کی پیروی میں عربی القاب اختیار کرنے لگے، لیکن سلطنت پانے سے پہلے ہی سب مسلمان ہو گئے تھے۔ سندھ گزیٹیر کے مصنف کا خیال ہے کہ علاقہ کچھ کے جادیجہ راجپوتوں کی طرح جو سمہ لوگوں کے ہم قوم تھے (اور جن کی نسبت ان کے راجا کا بیان ہے کہ دو ہزار جادیجوں میں سے تین کو بھی پتا نہیں کہ ان کا مذہب کیا ہے!) یہ لوگ بھی ایک عرصہ تک مخلوط مذہب کے پیرو ہوں گے اور پھر مسلمان ہو گئے۔ چوتھا (یا ایک ترتیب سے پانچواں) سمہ سردار بچپن میں ہی بطور یرغمال دہلی گیا تھا۔ اس کا نام تاریخ میں خیر الدین درج ہے۔ وہ دہلی کی اسلامی فضا سے متاثر ہوا اور قرین قیاس ہے کہ اپنے عہد حکومت میں اس نے اپنی قوم کو ایک ڈھب پر لانے کی کوشش کی ہوگی۔ سمہ لوگوں کی حکومت سندھ میں دیر تک رہی اور ٹھٹھہ کے علاوہ ایک وقت بھکر اور سہوان تک کا سب علاقہ ان کے قبضے میں تھا۔

سمہ خاندان کا سب سے بڑا حاکم جام نظام الدین عرف جام نندا تھا۔ جس نے ساٹھ سال حکومت کی اور موجودہ شہر ٹھٹھہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے پیشرو جام سنجر کا ایک دلچسپ قصہ بیان کرتے ہیں، جو معاصرانہ حالات اور سندھی حکام کی قدیمی روش پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک دفعہ جام سنجر نے سُنا کہ شہر بھکر کا قاضی (قاضی معروف) مقدمات فیصل کرنے کے وقت مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے رشوت لیتا ہے۔ جام نے اسے بُلا بھیجا اور استفسار کیا۔ قاضی نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ میں دونوں فریقوں سے کچھ نہ کچھ لیتا ہوں اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ گواہوں سے بھی کچھ وصول کروں۔ لیکن وہ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ جام یہ سُن کر ہنسا۔ اس پر قاضی نے کہا کہ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ میں تو سارا دن مقدمات میں سر کھپاتا ہوں اور گھر پر میرے بیوی بچے بھوکے مرتے ہیں۔ جام نے یہ سُن کر سمجھ لیا کہ سرکاری عمال کو بہت تھوڑی تنخواہ دینا غلطی ہے

اور قاضی کے مشاہرے میں اضافہ کر دیا۔

سمہ حکومت کے اختتام کے بعد تھوڑا عرصہ سندھ ارغون اور ترخان ترکوں کے قبضے میں رہا اور بالآخر ۱۵۹۲ء میں اکبر نے مرزا جانی بیگ کو شکست دے کر سندھ کو پھر حکومتِ دہلی کا باجگزار صوبہ بنا دیا۔

مخدوم لال شہباز قلندرؒ

مشہور اولیا میں سے سب سے پہلے شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے سندھ کی طرف توجہ کی۔ تحفۃ الکرام میں لکھا ہے: "اہلِ سندھ اغلب از مریدانِ آں در آمدہ و اوّل کسے کہ از مشائخ سلسلہ ارشاد در جنبانیدہ اوست" ان کا ذکر ہم کسی قدر تفصیل سے کر چکے ہیں، ان کے ایک پیر بھائی اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید شیخ نوح بھکریؒ ان سے پہلے ہی سندھ میں موجود تھے۔ وہ بڑے پاک سیرت بزرگ تھے لیکن ان سے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ اتنا وسیع نہیں ہُوا جتنا حضرت زکریا ملتانیؒ سے۔ شیخ بہاء الدین کے مشہور مرید جن کا ذکر ہندوستان کے تذکروں میں عام ملتا ہے اور جن کا مزار سندھ کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ مخدوم لال شہباز قلندرؒ ہیں۔ ان کا وطن تبریز کے قریب ایک گاؤں مرند میں تھا۔ اصل نام شیخ عثمان تھا۔ تیرہ سلسلوں سے آپ کا نسب امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے جب آپ سن بلوغت کو پہنچے تو بابا ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے اور ایک سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد خرقۂ خلافت پاکر ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور شیخ فریدؒ گنج شکر اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر رہ کر فیض یاب ہوئے۔ شیخ صدر الدین عارفؒ سے آپ کی اکثر صحبت رہتی تھی اور بلبن کا بیٹا خان شہید بھی آپ کا معتقد تھا۔ ضیاء الدین برنی نے

لہ آپ کے حالاتِ زندگی ایک قلمی تذکرہ دلیل الذاکرین میں درج ہیں۔ یہ کتاب پیر حسام الدین راشدی کے کتب خانے میں ہے۔

لکھا ہے کہ خان شہید نے بڑی کوشش کی کہ آپ ملتان میں اقامت پذیر ہو جائیں اور اس مقصد کے لیے ایک خانقاہ کی تعمیر بھی شروع کی لیکن آپ نہ مانے ۔ البتہ آپ گاہے گاہے خان شہید کی محفل میں جاتے تھے اور شیخ صدرالدین عارف کے ساتھ سماع و رقص میں حصہ لیتے تھے ۔

تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ آپ پھرتے پھراتے حضرت بوعلی قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے، لیکن انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں تین سو قلندر رہیں ۔ بہتر ہے کہ آپ سندھ میں ہی تشریف لے جائیں ۔ چنانچہ شیخ سندھ میں آ کر سیوستان میں مقیم ہوئے اور یہاں آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ آپ کو مُرشد نے شہباز کا خطاب دیا تھا ۔ چونکہ آپ اکثر سُرخ لباس پہنتے تھے، اس لیے آپ کو لال شہباز کہتے[1] تھے ۔ آپ اہل علم اور شروع میں شرع کے پابند تھے لیکن قلندری مشرب اختیار کرنے کے بعد بالکل آزاد ہو گئے ۔ اور جذب و سکر کی حالت میں رہنے لگے[2] ۔ آپ کے طریقے کے قلندروں کو لال شہبازیہ کہتے ہیں

---

[1] برٹن نے ہسٹری آف سندھ میں اس لقب کی ایک مختلف توجیہ کی ہے (ص ۲۰۷) اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ بڑے عالم اور لسانیات اور صرف و نحو میں ماہر تھے ۔ (ص ۲۱۱) چنانچہ برٹن کے زمانے (۱۸۵۱ء) میں صرف و نحو کی جو کتابیں رائج تھیں ۔ مثلاً میزان صرف اور صرف صغیر کے متعلق قسم دوئم (؟) وہ حضرت لال شہباز قلندر سے منسوب کی جاتی تھیں ۔ صوفیانہ تذکروں سے برٹن کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی ۔

[2] ہم لکھ چکے ہیں کہ سہروردیہ سلسلے میں عام طور پر سماع کا رواج نہیں اور شاید چشتیہ کی نسبت اس سلسلے میں شرع کی زیادہ پابندی ہے ۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ اس سلسلے کے کئی بزرگ ملامتیہ اور بے شرع گروہ میں داخل ہو گئے (مثلاً شیخ بہاءالدین زکریا کے خلیفہ لال شہباز قلندر، شیخ صدرالدین عارف کے خلیفہ شیخ احمد معشوق ۔ احمد آباد کے شاہ موسیٰ سہاگ) قلندروں کا ایک گروہ اپنے آپ کو سید جلال بخاری سہروردی کے نام پر

(باقی اگلے صفحے پر)

آپ کی وفات ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ء میں ہوئی۔ اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں ملک اختیار الدین والیٔ سیوستان نے مزار پر ایک شاندار روضہ تعمیر کرایا۔

سندھ میں تبلیغِ اسلام

مخدوم لال شہباز کے ایک دو ہمعصر بزرگوں (مثلاً پیر منگھو یا مگر پیر) کے نام ملتے ہیں۔ اور چند ایک ایسے مشائخ کے مزار بھی سندھ میں موجود ہیں جو حضرت لال شہباز سے دو ایک صدیاں بعد مقبولِ عوام تھے۔ لیکن آج کل سندھ میں پیروں کے جو مشہور سلسلے ہیں، ان کا آغاز مغل بادشاہ بابر کے زمانے سے اور بعض صورتوں میں اس سے بھی بعد ہوا۔ سندھ گزیٹر کے مصنف کا خیال ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کو اکثریت گزشتہ دو تین صدیوں میں حاصل ہوئی ہے۔ وہ کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن کا بیان نقل کرتا ہے، جس نے ۱۶۹۹ء میں شہر ٹھٹھہ دیکھا اور وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دس اور ایک کی نسبت پائی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حالت بالکل مختلف ہو گئی تھی۔ سندھ گزیٹر کے مصنف کا خیال ہے کہ اس تبدیلی میں بالائی سندھ کے ان خاندانوں (کلہورا۔ تالپور) کی پالیسی کو دخل ہے، جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سندھ میں برسرِ اقتدار ہوئے اور جنھوں نے زیریں سندھ کے ان شہروں اور علاقوں پر، جہاں ابھی تک ہندو اثرات

جلالی کہتا ہے (اگرچہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں کہ حضرت نے قلندروں کا یہ سلسلہ شروع کیا۔ اور شاید برٹن کا یہ بیان صحیح ہے کہ جلالی فقیر وہ ہیں جو شانِ جلالی دکھانے کے قائل ہیں) اسی طرح مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت جو بے شرع رسول شاہی فرقہ شروع ہوا اس کے بانی بھی ایک سہروردی بزرگ تھے۔ قادریوں میں آزاد مشرب قلندروں کی اتنی افراط نہیں جتنی سہروردیہ میں ہے۔ لیکن ان میں بھی (لاہور کے) "شیخ حسین اور مادھو لال قادری" کے نام نظر آجاتے ہیں۔ البتہ چشتیوں، بالخصوص نظامی چشتیوں میں سماع کے شوق کے باوجود آزاد اور بے شرع حضرات کے نام بڑی مشکل سے ملیں گے۔

اثرات غالب تھے، قبضہ جمالیا۔ اس کے علاوہ بلوچ قوم کے عروج نے بھی ان اسلامی رجحانات کو ترقی دی۔ کیپٹن ہملٹن کے زمانے میں اگرچہ حکومت مسلمانوں کی تھی، لیکن ہندوؤں کو پوری آزادی حاصل تھی اور وہ اپنے دن اور تہوار اسی دھوم دھام سے مناتے تھے، جس طرح اپنی حکومت کے دوران میں۔ لیکن تالپور خاندان کے عہدِ حکومت میں بلوچوں کے عروج سے صورتِ حالات مختلف ہو گئی۔

سندھ گزیٹیر میں دو ایسے قبیلوں کے نام لکھے ہیں، جو موجودہ زمانے میں مسلمان ہوئے۔ ایک دھاریجہ قوم کے لوگ ہیں، جو تھوڑا عرصہ ہوا راجپوتانہ سے آکر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ تحصیل گھوٹکی (ضلع سکھر) میں کاشتکاری کرتے ہیں۔ دوسرا قبیلہ اندھر کہلاتا ہے۔ وہ گھوٹکی، شکارپور اور سکھر میں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جنیو (زنار) علاقہ بہاولپور میں پیر موسے نواب کی درگاہ پر جمع ہیں۔

سندھ کے مسلمانوں میں پیر پرستی زوروں پر ہے اور گاہے گاہے پیر پرستی کے عجیب وغریب کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال حُر لوگوں کا نظام ہے، جو پیر پگاڑو (پگڑی والے پیر) کے معتقد ہیں۔ ان لوگوں کا مرکز روہڑی کے نزدیک لنگری نام ایک گاؤں ہے جس میں پیر کا کوٹ آباد تھا۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے مُرشد کا مورثِ اعلیٰ پیر شاہ علی مکی محمدؐ بن قاسم کے ساتھ سندھ آیا اور ایک نومسلم کی بیٹی سے شادی کی۔ وہ کثیر الاولاد تھا اور اس کے مُریدوں کی تعداد بھی بہت ہو گئی۔ اس خاندان نے مرورِ زمانہ سے بڑی وسعت حاصل کر لی۔ جانشینی کے سلسلے میں کئی دفعہ دعویداروں میں مخالفت کا بازار گرم ہُوا۔ ایک دفعہ ایک ہنگامے میں پیر صبغت اللہ صاحب (جن کے مولنا سید احمد بریلوی سے گہرے تعلقات تھے) کے مُعتقدوں نے عہد کیا کہ وہ سوائے پیر پگاڑو کے یعنی اس پیر کے جسے پیشرو سے دستارِ خلافت ملی ہو، کسی کے قائل نہ ہوں گے۔

پیر نے ان راسخ الاعتقاد مریدوں کو حرؒ کا خطاب دیا۔ ان لوگوں نے اپنے مُرشد کی خوشنودی اور ان کے مخالفین بلکہ اس کے اقربا اور خلفا کا قلع قمع کرنے میں انتہائی سرگرمی دکھائی ہے۔ اور اب سندھ میں ان کا شمار جرائم پیشہ اقوام میں ہوتا ہے۔ ان کی روک تھام کے لیے ایک خاص ایکٹ ہے۔ ان کے ساتھ پولیس کی کئی جھڑپیں ہوئی ہیں اور بعض اوقات تو فوج کی مدد منگانی پڑی ہے۔ خواجہ حسن نظامی اپنی کتاب فاطمی دعوتِ اسلام میں لکھتے ہیں :۔

"حُر فرقے کے ہزاروں آدمی پیر صاحب کو ذاتِ الٰہی کا مظہر اور اوتار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص پیر صاحب کے برابر بیٹھ جائے یا ان سے مصافحہ کرے تو یہ جاہل لوگ اس کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عقیدے میں پیر صاحب نور کا ایک پُتلا ہیں۔ اور خاکی انسان جو گناہوں کی پوٹ ہے۔ اگر پیر صاحب کے قریب بیٹھے یا ان سے ہاتھ ملائے تو نورِ خدا کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس واسطے وہ واجب القتل ہے۔ حُر قوم کے آدمی پیر صاحب کے مکان کے دروازے کا دیدار کر کے چلے جاتے ہیں"۔

بنگال میں اشاعتِ اسلام

شیخ جلال الدین تبریزیؒ سب سے پہلے جو بزرگ شمالی ہندوستان کے راستے بنگال تشریف لے گئے، شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔ آپ ایرانی النسل تھے۔ پہلے شیخ ابو سعید تبریزی کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے اپنے مُرشد کی اس طرح خدمت کی کہ شاید ہی کسی مرید نے اپنے پیر کی کی ہو۔ شیخ شہاب الدین ہر سال حج کے لیے جاتے تھے اور چونکہ اب وہ بہت بُوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ اس لیے گرم اور زود ہضم غذا کے سوا کچھ کھا نہ سکتے تھے۔

شیخ جلال الدین کی نسبت مشہور ہے کہ وہ اپنے سر پہ ایک انگیٹھی اور دیگچی اُٹھائے رکھتے تھے تاکہ جس وقت مُرشد طلب کرے۔ اسے گرم کھانا دے سکیں[1]۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں ہی آپ کی شیخ بہاء الدین زکریا سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ آپ نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ لیکن دونوں پیر بھائیوں کی دوستی نبھی نہیں۔ وجہ اس کی سیر العارفین میں اس طرح لکھی ہے کہ دونوں بزرگ سیر و سیاحت میں مشغول تھے کہ وہ ایک ایسے شہر میں جا پہنچے جہاں شیخ فرید الدین عطارؒ مقیم تھے۔ ان دونوں کا قاعدہ یہ تھا کہ منزل پر پہنچنے کے بعد شیخ بہاء الدین تو عبادت میں مشغول ہو جاتے اور شیخ جلال الدین شہر کی سیر کو نکلتے۔ شیخ جلال الدین نے جب شیخ فرید الدین عطار کو دیکھا تو ان کے دل پہ ان کی روحانیت کا بڑا اثر ہُوا۔ واپس جا کر انھوں نے اپنے پیر بھائی سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ آج مَیں نے ایک ایسا زبردست شہباز دیکھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ شیخ بہاء الدین نے پوچھا کہ کیا اس وقت اپنا مُرشد بھی یاد نہ رہا؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اُس کے سامنے مجھے کسی چیز کا خیال نہ رہا۔ شیخ بہاء الدین کو اپنے مُرشد سے شیخ تبریزی کی یہ سرد مہری اچھی نہ لگی اور انھوں نے اپنے پیر بھائی کی رفاقت ترک کر دی[2]۔

اس کے بعد شیخ جلال الدین تبریزی دہلی تشریف لائے۔ یہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے آپ کی دوستانہ مُلاقاتیں ہوتی تھیں۔ لیکن شیخ الاسلام دہلی شیخ نجم الدین صغرا آپ کا سخت مخالف ہو گیا۔ اور بالآخر اس نے آپ پر ایک شدید الزام لگا کر علما اور مشائخ کی ایک مجلس اس امر کا تصفیہ کرنے کے لیے بُلائی۔ اس مجلس نے تو بقول سیّد خورد مبارک کرمانی مصنف سیر الاولیا آپ کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور سُلطان التمتش نے شیخ

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۸۰ [2] سیر العارفین ص ۱۶۹

نجم الدین صغرا کو معزول کر کے شیخ بہاء الدین زکریا کو اس کی جگہ شیخ الاسلام مقرر کیا،[1] شیخ جلال الدین بھی اس کے بعد دہلی نہ رہے۔ وہاں سے، پہلے بدایوں اور پھر بنگالہ کا رُخ کیا۔ دہلی چھوڑتے وقت آپ نے کہا: "چوں من دریں شہر آمدم زر صرف بودم ایں ساعت نقرہ ام۔ تا بیشتر چہ خواہد شد[2]۔ لیکن آپ کا انجام بڑا شاندار ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے ولایتِ بنگالہ میں آپ سے بڑے کام لیے۔

فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ جب شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں میں تھے اور ایک گھر کی دہلیز پر بیٹھے تھے کہ ایک شخص چھاچھ کا مٹکا سر پر لیے پاس سے گزرا۔ وہ شخص قریب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا، جہاں کے لوگ ڈاکہ زنی میں مشہور رہتے۔ اور وہ بھی انھی میں سے تھا۔ لیکن شیخ کی نورانی صورت دیکھ کر وہ بڑا متاثر ہُوا۔ دل میں کہنے لگا کہ ہیں، مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں (تیز در روے شیخ دید بگفت کہ در دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایں چنیں مرداں ہم مے باشند)۔ چنانچہ وہ شیخ کے ہاتھ پر ایمان لایا۔ اور علی اس کا اسلامی نام رکھا گیا۔ جب شیخ بدایوں سے لکھنوتی جانے لگے تو وہ بھی پیچھے پیچھے روانہ ہُوا۔ لیکن شیخ نے اسے فرمایا کہ اس شہر کی ہدایت تمھارے ذمّہ ہے۔ تم یہیں رہو۔[3]

بدایوں میں ہی شیخ جلال الدین نے مولانا علاء الدین اصولی کو جو بعد میں سلطان المشائخ کے اُستاد ہوئے اور اس وقت خود ایک طفلِ مکتب تھے۔ اپنا لباس عطا کیا۔[4]

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب آپ بنگالہ پہنچے تو وہاں مخلوقِ خدا جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مُرید ہوئی۔ حضرت نے اس جگہ

---

[1] سیر العارفین صر ۱۶۷ - ۱۶۹
[2] فوائد الفواد صر ۱۱۳
[3] فوائد الفواد صر ۱۳۲
[4] فوائد الفواد صر ۱۹۵

ایک خانقاہ تعمیر کی۔ اور کئی باغ اور بہت سی زمین خرید کر لنگر کے لیے وقف کی۔ اس جگہ کو بندر دیوہ محل کہتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا تالاب تھا، جس کے قریب ایک ہندو راجے نے بے حد روپیہ خرچ کر کے ایک بُت خانہ تعمیر کیا تھا۔ حضرت نے اس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا اور بُت خانے کو اپنی جائے قیام بنایا۔ اب آپ کا مزار اسی جگہ ہے۔ اور اس مندر کی نصف آمدنی آپ کے لنگر کے لیے وقف ہے۔ (سیر العارفین ص ۱۷۱)

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی بنگالے میں ۱۱۹۵ء اور ۱۲۰۰ء کے درمیان کسی ایسے وقت میں پہنچے، جب وہاں لکشمن سین کا راج تھا اور مسلمانوں نے بنگالہ فتح نہیں کیا تھا۔

حضرت سلطان المشائخ شیخ جلال الدین کے بڑے مُعتقد تھے۔ ان کے مبینہ ملفوظات افضل الفوائد میں ایک اندراج ہے:

"پھر حکایت بیان فرمائی کہ ولایت اسی بات کا نام ہے جو شیخ جلال الدین تبریزی قدس سرہ العزیز کو حاصل تھی۔ چنانچہ جب آپ نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا تو آپ ایک ایسے شہر میں پہنچے، جہاں ایک دیو ہر رات آدمی کھایا کرتا تھا۔ آپ نے اس دیو کو کوزے میں بند کر دیا۔ اس شہر کے باشندے سب کے سب ہندو تھے۔ جب انھوں نے آپ کی یہ کرامت دیکھی تو سب مسلمان ہو گئے۔ آپ کچھ مُدت وہاں رہے اور حکم دیا کہ خانقاہ بناؤ۔ خانقاہ تیار ہو گئی تو ہر روز ایک گداگر لا کر اس کا سر مونڈتے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خدا رسیدہ بنا دیتے۔ اس طرح آپ نے پچاس آدمیوں کو صاحب سجادہ اور صاحب کرامت کیا۔ اور پھر ان کو وہاں قائم کر کے آپ آگے چل دیے۔"

افضل الفوائد کی تاریخی صحت مُشتبہ ہے۔ لیکن حضرت گیسو دراز کے ملفوظات میں اس واقعے کی بعض دوسری تفاصیل درج ہیں۔ اور حقیقت

سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ شیخ جلال الدین تبریزی پر جادو یا جن و پری کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا فرمایا:۔

"اور یہاں (بدایوں) سے شیخ دیوہ محل آئے۔ ایک کمہار یا مالن کے ہاں قیام کیا۔ دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ و شیون کا طوفان برپا ہے۔ پوچھا تو پتا چلا کہ اس شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک نوجوان دیو کے سامنے بھیجا جاتا اور وہ اسے کھا لیتا۔ اس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی۔ شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو۔ مجھے بھیجو۔ لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمھیں قبول نہ کیا تو راجا مجھے قتل کرا دے گا۔

چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو نہلایا دھلایا۔ نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا۔ شیخ بھی ساتھ تھے۔ بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو تو رخصت کر دیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے۔ جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کر دیا۔ صبح کو راجا اپنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا۔ دیکھا کہ اس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے۔ راجا خود آگے بڑھا۔ شیخ نے کہا تم بغیر کسی ہراس کے آگے آؤ۔ دیو کو میں نے ہلاک کر دیا ہے۔ لوگوں نے دیکھا۔ واقعی ایسے ہی تھا۔ چنانچہ سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہوئے۔" (ترجمہ از جوامع الکلم ص ۱۵۷)

شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے حالاتِ زندگی کے متعلق کئی الجھنیں ہیں جو ابھی تک حل نہیں ہوئیں۔ سیر العارفین کے مطابق آپ کی وفات ۶۴۲ھ یعنی ۱۲۴۴ء میں ہوئی۔ یہی تاریخ آئینِ اکبری اور خزینۃ الاصفیا میں ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ابنِ بطوطہ کہتا ہے کہ وہ خود ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۴۵ء میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور لکھتا ہے:۔

"سانگام سے میں کامروپ کے پہاڑوں کی طرف ہو لیا، جو یہاں سے ایک

مہینے کے راستے پر ہے۔ میرا ارادہ اس مُلک میں جانے سے یہ تھا کہ میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی جو مشہور اولیا اللہ تھے۔ زیارت کروں۔ یہ شیخ اپنے وقت کے قطب تھے۔ ان کی کرامتیں مشہور ہیں۔ عمر بھی ان کی بہت زیادہ ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خلیفہ مستعصم باللہ کو بغداد میں دیکھا۔ اور جس وقت اُس کو قتل کیا ہے، میں وہاں موجود تھا۔ وہ ایک سو پچاس برس کی عمر پوری کر کے مرے ہیں۔ اور چالیس سال سے وہ برابر روزہ رکھتے تھے۔ دس دس دن کے بعد ایک دفعہ افطار کرتے تھے۔ بدن کے ہلکے پھلکے تھے۔ قد لانبا تھا اور رُخسارے لگے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اس (پہاڑی) مُلک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس مُلک کے ہندو مسلمان سب شیخ کی زیارت کو آتے ہیں اور ان کے واسطے تحفے اور نذر لاتے ہیں۔ اس میں سے فقرا اور مساکین کھاتے ہیں اور شیخ فقط اپنی گائے کے دودھ پر گزارہ کرتے ہیں[1]۔"

ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ وہ حضرت کی زیارت کے لیے علاقہ کامروپ (آسام) میں گیا۔ اس سے سفرنامہ کے انگریزی مترجموں (مثلاً پروفیسر گِب) نے قیاس کیا ہے کہ جس بزرگ کی اس نے زیارت کی، وہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ نہ تھے۔ بلکہ سلہٹ کے شیخ جلالؒ تھے۔ ابنِ بطوطہ کے بیان میں بعض اُلجھنیں ہیں۔ اور تیقّن سے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پروفیسر گِب وغیرہ کا نظریہ تسلیم کرنے میں بھی کئی دُشواریاں ہیں۔ کیونکہ شاہ جلال سلہٹی کی وفات ۷۴۰ھ میں ہوئی اور ابنِ بطوطہ نے کامروپ کا سفر ۷۴۶ھ میں کیا۔ اس کے علاوہ اس نے جو واقعات بیان کیے ہیں (مثلاً شیخ کا بغداد میں قیام۔ طویل عمر) وہ شیخ جلال الدین تبریزی کے متعلق ہیں۔

---

[1] سفرنامہ ابنِ بطوطہ (مترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین) جلد دوم ص ۳۸۵

شیخ جلال الدین تبریزی کی عظمت و اہمیت کے باوجود وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا مزار کہاں ہے۔ سیر العارفین میں، جسے سکندر لودھی کے اُستاد شیخ جمالی نے تالیف کیا۔ بندر دیوہ محل کا ذکر ہے۔ ابو الفضل نے بھی یہی بیان دُہرایا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ بندر کہاں ہے۔ خان بہادر محمد حسین نے سفرنامہ کے حواشی میں لکھا ہے کہ بنگالہ کے قدیم دار الخلافہ پانڈوہ کے قریب دیو محل ایک جگہ ہے۔ ممکن ہے اس جگہ مزار ہو۔ پنڈوہ (ضلع مالدہ صوبہ مغربی بنگال) سے آٹھ دس میل دُور قصبہ تبریز آباد کے نواح میں ایک جگہ دیوتلہ یا دیوتلاو ہے۔ لیکن یہاں بھی شیخ جلال الدین تبریزی کا چلہ خانہ ہے۔ مزار نہیں۔ بنگالہ کے سفر میں بعض اہلِ تحقیق نے راقم الحروف سے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شیخ نے اخیر عمر میں عزلت نشینی اختیار کر لی تھی۔ اور اب وہ گوہاٹی (صوبہ آسام) سے چند میل دُور ایک پہاڑی پر ایک دُشوار گزار اور نسبتاً غیر معروف بلکہ ہیبت ناک جنگل میں مدفون ہیں[1]۔ پنڈوہ میں جہاں آپ کے چلہ خانہ اور مسجد (بائیس ہزاری) سے ۲۲ ہزار ایکڑ کی زمین وابستہ تھی۔ آپ کا عُرس ۲۱ ۔ ۲۲ رجب کو ہوتا ہے۔

آئینہ ہندوستان شیخ سراجؒ

شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے علاوہ دوسرے کئی بزرگ اس زمانے میں بنگال کی طرف آئے اور یہاں اس زمانے میں صوفیہ کثرت سے تھے[2]۔ ابنِ بطوطہ بنگالے کے ایک بادشاہ ملک فخر الدین کی نسبت لکھتا ہے "فخر الدین صوفیوں اور فقیروں سے اس قدر محبت رکھتا

---

[1] شیخ جلال الدین تبریزی کے حالات میں بنگالی حروف میں لکھی ہوئی ایک سنسکرت کتاب دستیاب ہوئی ہے۔ اس کے مطابق ۱۲۲۳ء میں شیخ بنگال سے چلے گئے۔

[2] ایشوری پرشاد صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۰ ا پر سفرنامہ ابن بطوطہ کے حوالے سے چودھویں صدی کے بنگال میں فقرا و صوفیہ کی ۱۵۰ گدیوں کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ہندوستان میں اسلامی حکومت کی تاریخ (انگریزی) از ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔

تھا کہ اس نے ایک صوفی شیدا نام کو سانگاؤں میں اپنا نائب مقرر کیا۔ سلطان المشائخ کی اس ولائت کی طرف خاص نظر تھی اور انھوں نے اپنے ایک مرید خاص شیخ سراج الدین عثمان (متوفی ۱۳۵۷ء) کو تعلیم و تربیت دے کر بنگال کی طرف بھیجا۔ شیخ سراج الدین عثمانؒ کا وطن بنگال کا دار الخلافہ لکھنوتی تھا۔ لیکن وہ ایام طفولیت میں ہی وہاں سے آکر شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہو گئے اور ان کی خانقاہ میں رہنے لگے۔ ہر سال کے بعد لکھنوتی (بنگال) میں اپنی والدہ محترمہ سے ملنے کے لیے جاتے۔ اور پھر واپس آکر اپنے مُرشد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ عطائے خلافت کے وقت شیخ نے انھیں فرمایا کہ اس کام میں علم سب سے زیادہ درکار ہے۔ اور تمھیں علم سے ابھی وافر حصہ نہیں ملا۔ اس پر شیخ کے ایک فاضل مرید مولانا فخر الدین زرادی نے عرض کیا کہ میں اسے چھ ماہ میں عالم بنا دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے شیخ سراج الدین عثمانی کو (اس بڑی عمر میں) پڑھانا شروع کیا۔ ان کے لیے صرف کی ایک کتاب لکھی اور اس کا نام عزیز شاگرد کے نام پر عثمانی رکھا[۵]۔ اس کے بعد شیخ سراج الدین نے مولانا رکن الدین سے کافیہ۔ مجمع البحرین اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ اور حضرت سلطان المشائخ کی وفات سے تین سال بعد تک تعلیم جاری رکھی۔ اس کے بعد شیخ کی بعض کتابیں، پرانے کپڑے اور خلافت نامہ لے کر بنگالے کا رُخ کیا۔ شیخ نظام الدین انھیں آئینۂ ہندوستان کہا کرتے تھے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان المشائخ کی وفات کے بعد آپ حضرت چراغ دہلی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور درجۂ کمال کو پہنچ کر ان سے خرقۂ خلافت بنگالہ پایا۔ جب حضرت چراغ دہلی آپ کو بنگالے کی طرف رخصت کر رہے تھے، تو آپ نے عرض کیا کہ اس ولایت میں تو شیخ علاءالدین ایک صاحب اثر و اقتدار

---

۵ سیر الاولیا ص ۲۸۱

بزرگ ہیں۔ میرے جانے سے کیا ہوگا۔ حضرت چراغ دہلی نے بزبانِ ہندی فرمایا :
"تم اوپر وے تل" یعنی تمہارا مرتبہ ان سے اُوپر رہے گا۔ اور ان کا تم سے نیچے۔ چنانچہ فی الحقیقت ایسا ہُوا۔ اور یہ شیخ علاء الدین آپ کے مُرید ہوئے[1]۔

بنگالے میں آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور وہاں کا بادشاہ آپ کا مُرید ہُوا۔ آپ کی وفات ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء میں ہوئی۔ وفات سے پہلے اپنا مدفن منتخب کیا۔ اور سب سے پہلے حضرت سلطان المشائخ کے عطا کردہ کپڑے اس میں دفن کیے اور ارشاد فرمایا کہ میری وفات کے بعد مجھے ان کی پائینتی میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ مزار گور میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

آپ کے ایک مشہور ہمعصر شیخ رضا بیابانی بادشاہِ وقت سلطان شمس الدین الیاس کے مرید تھے۔ جب انھوں نے ۷۵۴ھ ۱۳۵۳ء میں وفات پائی تو فیروز تغلق نے بنگالے پر یورش کر رکھی تھی۔ اور الیاس قلعہ ایکدالہ میں محصور تھا۔ لیکن اپنے پیرو مُرشد کی وفات پر اس نے جان ہتھیلی میں لی اور جنازے میں شریک ہونے کے لیے بھیس بدل کر قلعہ سے باہر آیا۔ (برنی)

شیخ علاء الدین علاء الحق بنگالی لاہوری

شیخ علاء الدین علاء الحق، شیخ اسعد لاہوری کے بیٹے تھے۔ آپ امراو ارکین سلطنت میں شمار ہوتے تھے۔ اور بہت مغرور سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کو لوگ گنج نبات کہتے تھے۔ اور چونکہ گنج نبات کا درجہ گنج شکر سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے مشہور ہے کہ بابا فرید گنج شکر کے خلیفہ حضرت سلطان المشائخ نے اس پر خفگی کا اظہار کیا[2]۔ بعد میں آپ سب کچھ ترک کر کے شیخ سراج الدین عثمان کے مُرید ہوئے۔ مُرشد کی اتنی خدمت کی کہ ناظرین حیران ہوتے تھے۔ وہ شیخ جلال الدین تبریزی کی طرح اپنے مُرشد کا کھانا گرم رکھنے کے لیے انگیٹھی اپنے سر پر اُٹھائے رہتے

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ جلد دوم صہ ۳۹۹۔۔۔۴۰۰   [2] خزینۃ الاصفیا جلد اوّل صہ ۳۶۸

تھے۔ حتیٰ کہ آپ کے سر کے بال جل گئے۔ آپ اس حالت میں اپنے عزیزوں کے سامنے آتے جو ارکانِ حکومت میں سے تھے۔ وہ لوگ آپ کا مذاق اڑاتے، لیکن آپ ذرا بھی متاثر نہ ہوتے۔

جب مُرشد سے فیض حاصل کرنے کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے تو آپ نے بڑی جُود و سخا اور خلقت پروری شروع کی۔ حتےٰ کہ بادشاہِ وقت نے اس پر اعتراض کیا۔ شیخ کے والد مہتمم خزانہ تھے۔ بادشاہ کو خیال ہُوا کہ شاید اس کی مدد سے یہ فیاضی جاری ہے۔ چنانچہ شیخ کو دارالخلافہ چھوڑ کر سنار گاؤں[1] جانے کا حکم ہُوا۔ اور آپ دو سال سنار گاؤں رہے۔ خادم کو حکم تھا کہ جو خرچ پہلے ہوتا تھا، اس سے دو چند کرو۔ چنانچہ عطائے الٰہی سے یہ سلسلہ جاری رہا۔[2]
آپ کی وفات ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں ہوئی۔ مزار مُبارک حضرت پنڈوہ میں ہے، جو بنگال کے قدیم دارالخلافہ گوڑ سے سات میل کے فاصلے پر بڑی زیارت گاہ ہے۔
آپ کے خلفا میں سے علاوہ آپ کے فرزند ارجمند قطب عالم شیخ نورالحقؒ کے میر سید اشرف جہانگیری سمنانیؒ خاص مرتبہ کے بزرگ تھے۔ وہ سید اسمنان میں ہوئے۔ سیر و سیاحت کے لیے (میر سید علی ہمدانی کے ساتھ) ہندوستان آئے۔ بالآخر جونپور کے علاقے میں قصبہ کچھوچھہ میں بس گئے۔ آپ کے زمانے میں پہلے سکندر بادشاہ بنگالے کا حکمران تھا۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین

---

[1] ڈھاکہ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلی مرتبہ حاکم بنگالہ طغرل کے تعاقب میں سُلطان غیاث الدین بلبن کے یہاں آنے کا ذکر ملتا ہے۔ اس وقت یہاں ایک ہندو باجگزار راجا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں سنار گاؤں مقبوضاتِ شاہی میں داخل ہُوا اور ایک زمانے میں مشرقی بنگالہ میں اسلامی حکومت کی توسیع کا بڑا مرکز بن گیا۔ لیکن ابتدا میں ایک سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں کی رہائش مقبول عام نہ تھی۔ اور پنڈوہ، لکھنوتی والوں کے لیے ایک طرح کی جلاوطنی تھی۔ [2] اخبار الاخیار ص ۱۴۳

تخت نشین ہوا۔ جس نے خواجہ حافظ کو شیراز سے آنے کی دعوت دی تھی۔ خواجہ نہ آئے لیکن ایک غزل لکھ کر بھیجی۔ جس کے دو شعر یہ تھے ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند | زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ مے رود
حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطاں غیاث دیں | خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ مے رود

حضرت نور قطب عالمؒ

شیخ علاء الحقؒ سے بھی زیادہ فروغ ان کے صاحبزادے نور الحق المعروف نور قطب عالم نے پایا۔ جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں :۔

"شیخ نور الحق والدین رحمۃ اللہ علیہ المشہور بہ شیخ نور قطبِ عالم فرزند و مرید خلیفہ علاء الحق است، از مشاہیر اولیاے ہندوستان و صاحب عشق و محبت و ذوق و شوق و تصرّف و کرامت"۔

اس کے بعد دو صفحوں میں ان کے ارشادات اور ریاضتوں کا حال لکھا ہے قطبِ عالم[۱] کے والد شیخ علاء الدین نے اپنے مرشد کی بڑی خدمت کی تھی، لیکن اس منزل میں وہ اپنے والد سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ اپنے والد کی خانقاہ کے تمام درویشوں کی ساری خدمتیں بجا لاتے۔ ان کے کپڑے دھوتے۔ ان کے لیے پانی گرم کرتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو ساری خدمتیں جو ایک مامتا بھری ماں بیمار بچے کی بجالاتی ہے، پوری کرتے۔ آٹھ سال تک اس خانقاہ کے لیے انھوں نے لکڑیاں کاٹی ہیں۔ ایک روز والد نے فرمایا کہ نور الحق جس جگہ عورتیں کوئیں سے پانی نکالتی ہیں، وہاں زمین پھسلنی ہو گئی ہے۔ پاؤں پھسلتے ہیں اور برتن ٹوٹ جاتے ہیں۔ تم اپنے سر پر انھیں پانی نکال دیا کرو۔ چار سال تک حضرت نور قطبِ عالم نے یہ خدمت انجام دی۔ آپ پانی نکال کر چوبچہ میں ڈال دیتے۔ اور وہاں سے اہل ضرورت لے جاتے۔ آپ کے بڑے بھائی شیخ اعظم خان وزیرِ سلطنت تھے۔ وہ انھیں اس حالت میں

---

[۱] آئینِ اکبری کے مطابق حضرت نور قطب عالم کی ولادت لاہور میں ہوئی۔

دیکھتے تو افسوس کرتے۔ اپنے پاس آنے کی تلقین کرتے، لیکن آپ ہنس کر ٹال دیتے۔ اور کہتے کہ خانقاہ کی ہیزم کشی میرے لیے وزارت سے بہتر ہے۔[1]

آپ کے مزاج میں درد اور خلوص بہت تھا۔ آپ کے خلیفہ شیخ حسام الدین مانکپوری لکھتے ہیں کہ ایک روز آپ سوار ہو کر جا رہے تھے اور بے اندازہ خلقت آپ کے دیدار کے لیے راستے پر دو رویہ کھڑی تھی۔ اس حالت میں گریہ سے آپ بے ہوش ہوئے جاتے تھے۔ شیخ حسام الدین نے آگے بڑھ کر ماجرا پوچھا تو فرمانے لگے کہ آج خدا نے اتنے لوگوں کو ہمارا مسخر کیا ہے جو ہمارا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ کل کو پتا نہیں، روزِ قیامت ہمارا کیا حال ہو گا۔ خدا کرے۔ ہمارا سر انھی لوگوں کے سامنے پامال نہ ہو![2]

طبیعت میں بے حد مسکینی اور کسرِ نفسی تھی۔ ایک روز ایک شخص، مکہ معظمہ سے آیا اور کہنے لگا کہ میں نے آپ کے ساتھ خانہ کعبہ میں ملاقات کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اتنے لوگ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں کہ تمھیں سہو ہُوا ہو گا۔ اس نے اصرار کیا تو آپ نے اسے کچھ دیا اور رخصت کیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ اس طرح کی باتیں نہ کیا کریں (اخبار الاخیار ص ۱۵۴)

شیخ حسام الدین لکھتے ہیں کہ آپ سوائے سخت سردی کے گودڑی نہ پہنتے۔ سجادہ پر بھی کبھی نہ بیٹھتے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ سجادہ پر بیٹھنے کا اسے حق ہے جو اس پہ بیٹھ کر نہ دائیں دیکھے نہ بائیں۔ رخصت کے وقت آپ نے شیخ حسام الدین کو نصیحت کی کہ سخاوت میں سورج کی طرح ہونا اور عاجزی میں پانی کی طرح۔ اور تحمل میں زمین کی طرح اور لوگوں کے سب مظالم برداشت کرنا۔ آپ نے شیخ حسام الدین کو یہ بھی نصیحت کی تھی کہ "مرد وہ ہے جو درویشی (طریقت) اور دانشمندی (شریعت) دونوں کو اپنی ذات میں جمع کرے۔"

---

[1] و [2] اخبار الاخیار ص ۱۵۳

شیخ عبدالحق آپ کے مکتوبات کی نسبت لکھتے ہیں "شیخ نور قطب عالم را مکتوبات است بغایت شیریں و لطیف۔ بر زبانِ اہلِ درد و محبت۔"
یہ مکتوبات، جن کی تعداد ۱۲۱ ہے (گلزارِ ابرار) مولانا حسام الدین مانکپوری نے فراہم کر کے مرتب کیے۔ زیادہ خطوط اپنے بیٹے شیخ فضل اللہ (المعروف قاضی شاہ) کے نام ہیں، جو پنڈوہ میں آپ کے جانشین ہوئے۔ باقی خطوط آپ کے نواسوں اور مریدوں کے نام ہیں۔
آپ کا ایک خط اخبار الاخیار میں درج ہوا ہے۔ جس سے چند سطور ہم تبرکاً و تیمناً نقل کرتے ہیں۔

نورِ بجانبِ نجم

بیچارہ حزین نورِ مسکین، عمر بباد دادہ و بوے مقصود نیافتہ در طۂ حیرت و میدان حسرت چوں گوے سرگردان شدہ ؎

ہمہ شب برآریم شد کہ صبا ندا دبوئے
ندمید صبحِ بختم چہ گنہ نہم صبارا

عمر از شصت گزشتہ و نیز از شست جستہ و از شرِ نفسِ امارہ یک ساعت نرستہ۔ بجز باد بر دست و آتش در جگر و آب در دیدہ و خاک بر سر نہ پیوستہ بجز ندامت و خجالت دست آویزے نہ بجز درد و آہ پلے گریزے نہ ؎

دلِ مردانِ دیں پُر درد باید زمحنت فرقِ شاں پُر گرد باید

آپ کے مکتوبات میں لطیف و دلآویز اشعار کثرت سے ہوتے تھے چنانچہ اس مکتوب میں آگے چل کر لکھا ہے ؎

گفتم مگر کہ کار بساماں شود، نشد یار از جفائے خویش پشیماں شود، نشد
گفتم مگر زمانہ عنایت کند، نکرد بختِ ستیزہ کار بفرماں شود، نشد

ایک اور پُرسوز شعر ہے ؎

راہ نا ایمن است و منزل دُور مرکبت لنگ و یار سخت غیور!

یہی باہمت اور مشقت طلب ہستیاں تھیں، جنھوں نے اسلام کی شمعیں ملک کے کونے کونے میں روشن کیں۔ اور جن کے ذکر سے آج بھی دل و دماغ منوّر ہوتا ہے۔

مکتوبات کے علاوہ آپ کے قلم سے ایک اور کتاب انیس الغربا کے نام سے نکلی جو چھپ چکی ہے۔ قریباً ساٹھ صفحے کا مختصر رسالہ ہے۔ جس میں رسُولِ اکرم کی بعض احادیث۔ ان کا ترجمہ اور صوفیانہ رنگ میں ان کی شرح کردی ہے۔ حضرت نور قطب عالم نے امیرانہ ماحول میں پیدا ہونے کے بعد فقر کی دُنیا اختیار کی تھی اور اپنے قدیمی ماحول سے سخت بیزار تھے۔ اس لیے ان کی تصانیف پر بھی زہد و رہبانیت کا رنگ غالب ہے۔ لیکن ان میں ایک عجیب طرح کی ادیبانہ دلآویزی ہے جو آپ کے مذاقِ سلیم اور دل گداختہ کا پتا دیتی ہے۔

حضرت نور قطب عالم صرف ایک بڑے خدا رسیدہ اور خادم خلق بزرگ اور صاحبِ طرز اہلِ قلم نہ تھے۔ بلکہ بنگالہ کی تاریخ ریاض السلاطین کے بیان کے مطابق واقعات نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ملکی معاملات میں بھی اہم حصہ لیں۔ یُوں تو ویسے بھی حضرت کا خاندان امارت اور شرافت میں ممتاز تھا۔ لیکن حضرت کا رسُوخ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ بادشاہِ وقت سلطان غیاث الدین آپ کا ہم درس تھا۔ دونوں شیخ حمید الدین گنج نشین ناگوری (۱۲۵۶ء۔ ۱۳۶۰ء) کے شاگرد تھے۔ اور بادشاہ نہ صرف آپ کی رُوحانی پاکیزگی کا مُعتقد تھا بلکہ بچپن سے دونوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ واقعات بھی ایسے پیش آئے کہ حضرت نور قطب عالم کو معاملاتِ ملکی میں دخل دینا پڑا۔ ریاض السلاطین میں جو بنگالے کی سیاسی تاریخ ہے، لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین دیناج پور کے ایک ہندو زمیندار راجا کنس (گنیش) کی سازش سے قتل ہُوا۔ اس کے بعد مختصر مُدت کے لیے دو اور بادشاہ ہوئے اور بالآخر راجا گنیش خود تخت نشین ہُوا۔ اس نے سخت ظلم و ستم سے کام لینا شروع کیا۔ بہت سے علما و مشائخ کو قتل کیا اور اس امر

کے درپے ہُوا کہ مُلک سے اسلام کی بُنیادیں اُکھاڑ دے ("اکثرے علما و مشائخ را مقتول تیغ ستم کرد۔ و مے خواست کہ بیخ اسلام را از قلمرو خود مستاصل سازد"[1])
حضرت نور قطب عالم نے یہ حالت دیکھ کر جونپور کے بادشاہ سلطان ابراہیم شرقی کو مدد کے لیے لکھا۔ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے بھی جو ابراہیم کے دربار میں تھے، بادشاہ کو "فوائد دینی و دنیوی" بتا کر اس کی ترغیب دی اور جونپور سے ایک بڑی فوج بنگالے کی سمت روانہ ہوئی۔

اب گنیش ڈرا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ آپ نے کہا کہ میں ایک کافر ظالم بادشاہ کی بادشاہ اسلام کے پاس کس طرح سفارش کر سکتا ہوں اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو اور بات ہے۔

ریاض السلاطین میں لکھا ہے کہ گنیش اسلام قبول کرنے پر آمادہ تھا، لیکن اس کی دھرم پتنی مانع ہوئی۔ اور بالآخر اس نے کہا کہ مَیں تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں ترکِ دنیا کرتا ہوں۔ آپ میرے بیٹے (جدو) کو مسلمان کر لیں تاکہ وہ بنگالے کا بادشاہ بن سکے۔ آپ نے یہ بات قبول کی۔ جدو آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہُوا اور آپ کی سفارش پر جونپور کی فوج واپس چلی گئی۔

جب یہ خطرہ دُور ہُوا تو گنیش نے چاہا کہ جدو پھر سے ہندو ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے سونے کی چند دیو ہیکل گائیں بنوائیں۔ جدو کو ان کے اندر سے گزارا اور سارا سونا برہمنوں میں تقسیم کر دیا۔ برہمن دوبارہ جدو کو ہندو برادری میں لینے پر آمادہ تھے، لیکن وہ حضرت قطب عالم کی بزرگی کا قائل تھا۔ اس نے ایک ایسے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد مرتد ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جب گنیش مرا تو اس کی وفات پر جدو سلطان جلال الدین ابو مظفر محمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہُوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں اسلام کو

---

[1] ریاض السلاطین ص ۱۰۸۔۱۱۰

بڑی رونق ہوئی۔ اس زمانے میں حضرت نور قطب عالم کا انتقال ہو چکا تھا لیکن سلطان جلال الدین نے ان کے بیٹے شیخ زاہد کو سنارگاؤں سے بلایا۔ ان کا ہر طرح احترام کیا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

ریاض السلاطین کے مصنف نے اپنی کتاب اُس وقت لکھی جب وہ ضلع مالدہ میں جس کے اندر گوڑ اور پنڈوہ کے مقامات ہیں، مقیم تھا۔ اس کا بیان مقامی روایات یا صوفیانہ تذکروں پر مبنی ہے۔ اور اس میں دو ایک چیزیں نظر کو کھٹکتی ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی جس انداز سے شاہانِ بنگالہ نے حضرت نور قطبِ عالم کے مزار پر اپنی توجہ صرف کی ہے۔ اس سے اور دوسری کتب سے اس اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو حضرت نور قطبِ عالم کو اس دُنیا کی نظروں میں بھی حاصل تھی۔

حضرت نور قطب عالم کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ شیخ عبدالحق محدث نے آپ کی تاریخ ۸۱۳ھ (یعنی ۱۴۱۰ء) لکھی ہے۔ لیکن اب عام خیال یہ ہے کہ نور منور شد کی تاریخِ وفات کے مطابق آپ نے (یعنی ۱۴۱۵ء کو) وفات پائی۔ مزار مبارک پنڈوہ ضلع مالدہ (مغربی بنگال) میں ہے۔

آپ کے بعد آپ کا فیض آپ کے بیٹوں (شیخ رفعت الدین و شیخ انور) نے جاری رکھا۔ ان کا رنگِ طبیعت بھی آپ کا سا تھا۔ لیکن آپ کے سب سے مشہور خلیفہ شیخ حسام الدین مانکپوری تھے۔ جو ایک اہلِ علم اور صاحبِ ذوق خاندان کے چشم و چراغ تھے اور خود بھی ایک منبعِ فیض ثابت ہوئے۔ آپ کے مریدوں میں دوسرے خلفائے کبار کے علاوہ شیخ نورؒ کے نواسوں (شیخ زاہد، شیخ اکمل، شیخ راجن، شیخ اخوند عالم) کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔ شیخ حسام الدین کے ایک مرید راجی حامد شاہ تھے، جن کے خلیفہ شیخ حسن طاہر جونپوری ثم دہلوی تک امام الہند شاہ ولی اللہ کا سلسلہ نسب جاتا ہے[1]۔

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کی دادی شیخ قطب عالم کی پوتی تھیں اور وہ خود شیخ حسن طاہرؒ کے پوتے تھے۔

شیخ حسام الدین صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ان کے ملفوظات رفیق العارفین نامی ایک کتاب میں جمع ہوئے ہیں۔ وہ تو غالباً ابھی تک زیورِ طبع سے محروم ہے لیکن ان کی ایک اور تصنیف انیس العاشقین کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں تصوف کی اصل وحقیقت پر دلچسپ پیرائے میں تبصرہ کیا ہے اور مضمون کو جابجا آیات واحادیث، دلگداز فارسی اشعار اور ہندی دوہوں سے موثر بنایا ہے۔ آپ کے مکتوبات ابھی شائع نہیں ہوئے۔

حضرت نور قطب عالم کے خلفا کی فہرست دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کا فیض صوبہ بنگالہ تک محدود نہ تھا بلکہ آپ کی شمع علم وعمل کی روشنی سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کے فرزندوں اور دوسرے خلفا نے آپ کا فیض بنگالے میں جاری رکھا۔ شیخ حسام الدین کا زیادہ وقت کڑہ مانکپور (موجودہ صوبجات متحدہ کے مشرقی حصے) میں گزرا۔ قصبہ بہار شریف میں آپ کے ممتاز خلیفہ مخدوم عطاء اللہ بغدادی مدفون ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے ایک خلیفہ شیخ شمس الدین طاہر تھے، جو زیادہ تر اجمیر میں رہے۔ ایک اور خلیفہ حضرت شاہ کاکو (شیخ کاکو) تھے، جو لاہور کی مایہ ناز ہستیوں میں سے تھے۔ تمام عمر ترویجِ اسلام میں مشغول رہے۔ آپ نے موجودہ لنڈا بازار لاہور کے علاقے میں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم کی تھی، جو مغلیہ حکومت کے زوال تک علم اور روحانیت کی مرکز بنی رہی۔ آپ کے جانشینوں میں سے آپ کے صاحبزادے شیخ اسحاق کاکو، ان کے شاگرد، مثلاً شیخ سعد اللہ بن اسرائیل، شیخ منور اور ان کے جانشین شیخ کبیر (ملاحظہ ہو بدایونی کی منتخب التواریخ) خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ کا مزار ایک بڑی زیارت گاہ تھا۔ حضرت میاں میر یہاں زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن جولائی ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے ساتھ یہ زیارت بھی شہید ہو گئی۔ (اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۳۷ء)

شیخ جلال مجرد سلہٹی
(وفات ۱۳۴۰ء)

تقسیمِ پاک وہند کے بعد شاہ نور قطب عالم اور دوسرے بزرگانِ پنڈوہ کے مزار ہندوستان میں رہ گئے ہیں اس وقت

مشرقی پاکستان کی سب سے اہم زیارت سلہٹ میں ہے، جو سلطان شمس الدین فیروز شاہ والی بنگالہ کے عہدِ حکومت میں حضرت شیخ جلال مجرد سہروردیؒ کی مدد سے فتح ہُوا ؎

سلہٹ زشرف فلک برابر باشد　　ہر سنگ درو بہ تاب گوہر باشد
ہر قطرہ از و بوسعت دریائیست　　ہر ذرۂ اش آفتاب دیگر باشد

ضلع سلہٹ کے سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے :-

"گوڑ یا سلہٹ کو مسلمانوں نے ۱۳۸۴ء[۱] میں فتح کیا - آخری ہندو راجا گوبند کو سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے بے بس کر دیا - شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ علاقہ صوبہ بنگالہ میں داخل کیا گیا اور نظم و نسق کے لیے ایک علٰحدہ صوبیدار مقرر ہُوا -

"اس ضلع کے قریباً ترپن ۵۳ فیصدی باشندے گزشتہ مردم شماری کے مطابق مسلمان ہیں"

مندرجہ بالا بیان سرکاری گزیٹیر کا ہے - حال میں محکمہ آثار قدیمہ کو پتھر کا ایک پرانا کتبہ دستیاب ہُوا ہے، جو پہلے درگاہ شاہ جلال میں لگا ہُوا تھا - اور اب ڈھاکہ میوزیم میں محفوظ ہے - یہ کتبہ ۹۱۸ ہجری یعنی ۱۵۱۲ء میں لگایا گیا - اس کے مطابق "بہ عزت شیخ المشائخ مخدوم شیخ جلال الدین مجرد بن محمدؒ اول فتح اسلام عرصہ سری ہٹ (سلہٹ) بہ دستِ سکندر خاں غازی بعہدِ سلطان فیروز شاہ دلوئی (کذا) سنہ ثلث و سبع مائتہ ......"

حضرت شاہ جلال کا ذکر مشائخ کے عام تذکروں میں بالکل نہیں ملتا، لیکن خوش قسمتی سے ہمیں غوثی مالوی کے گلزار ابرار کا اردو ترجمہ موسومہ اذکار الابرار دستیاب ہُوا - اصل کتاب ۱۶۱۳ء میں لکھی گئی - اس میں شیخ جلال کے متعلق ذیل کا اندراج ہے

یادِ شیخ جلال الدین مجرّد!

---

[۱] یہ تاریخ غلط ہے - پہلی مرتبہ سلہٹ ۷۰۳ھ یعنی ۱۳۰۳ء میں فتح ہُوا -

آپ ترکستانی تھے مگر پیدائش بنگالے کی ہے۔ سلطان سید احمد کے خلیفہ تھے۔ کہتے ہیں ایک روز روشن ضمیر پیر کی خدمت میں عرض کیا۔ میری آرزو یہ ہے کہ جس طرح حضور کی راہنمائی کی بدولت جہادِ اکبر میں کسی قدر فتح مندی حاصل ہوئی ہے اسی طرح حضور کی کام بخش ہمت کے طفیل میں جہادِ اصغر سے بھی دل کی تمنا پوری کروں۔ اور جو مقام دار الحرب ہو' اس کے فتح کرنے میں کوشش کر کے غازی یا شہید بنوں۔ پیر بزرگوار نے التماس قبول فرما کر اپنے بزرگ خلفاء میں سے سات سو آدمی آپ کے ہمراہ کیے۔ الحمد للہ۔ جہاں کہیں مخالفین سے لڑائی ہوئی فتح حاصل کی۔ زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس دور دراز بھاگ دوڑ میں روزی کا مدار صرف غنیمت کے مال پر تھا۔ اور توانگرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جو گھاٹیاں اور مویشی فتح ہوتی تھیں، ہمراہیوں میں سے کسی ایک کو دے کر وہاں اسلام کی اشاعت اور راہنمائی اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ القصہ صوبہ بنگالہ کے پرگنات میں ایک قصبہ ہے سریہر (سلہٹ) اس قصبے پر جب آپ پہنچے تو تین سو تیرہ آدمی ہمراہی میں باقی رہے تھے۔ ایک لاکھ پیادہ اور کئی ہزار سوار کا مالک گوڑ گوبند قصبے کا حکمران تھا۔ وہ اس کم تعداد گروہ کے مقابلے میں بہت قوی تھا کیونکہ یہ گروہ اس بے انتہا لشکر کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا تھا جو نمک کو کھانے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب لڑائی آن پڑی تو تقدیر کے پردے سے کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ کی کرامت ظاہر ہوئی۔ اور وہ پیکر پرست بھاگ کر ملکِ عدم کی طرف سوائے تنہا جان کے کچھ نہ لے جا سکا۔ اور تمام زمین غازیوں کے ہاتھ آئی۔ شیخ مجرد نے تمام مفتوحہ زمین کا حصہ کر کے اپنے ہمراہیوں کو تنخواہ میں دے دی اور ہر ایک کو کتخدا ہونے کی بھی اجازت دے دی۔ اس تقسیم میں ایک قصبہ شیخ نور الہدیٰ ابوالکرامات سعیدی حسنی کے حصے میں بھی آیا۔ وہاں پر آپ عیالمند ہو گئے اور فرزند بھی ہوئے۔ شیخ علی شیر[1] انہی کی نسل سے ہیں۔ شیخ علی شیر نے یہ بیان

---

[1] شیخ علی شیر عہد اکبری کے مشہور بزرگ شیخ غوث گوالیاری کے خلفاء میں سے تھے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

شرح نزہت الارواح کے مقدمے میں لکھا ہے۔" (اذکار الابرار ص ۱۲۴ - ص ۱۲۵)

شاہ جلال سلہٹی کے حالات میں مولوی نصیر الدین حیدر منصف سلہٹ نے ۱۸۵۹ء میں دو پرانی کتب کی مدد سے ایک کتاب سہیلِ یمن مرتب کی تھی۔ سہیلِ یمن کے کئی اندراجات ناقابلِ تسلیم ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدیمی کتبے اور غوثی کے بیان کو اس پر ترجیح دی جائے گی، لیکن چونکہ شیخ جلال کے متعلق مغربی پاکستان میں بالکل بے خبری ہے اور مشرقی بنگال کی روحانی تاریخ میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لیے ہم سہیلِ یمن کا خلاصہ سطورِ ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

"شاہ جلال قریش نسل سے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد تھا، جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اور شیخ الشیوخ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ دادا کا نام محمد ابراہیم تھا۔ آپ کی والدہ خاندانِ سادات سے تھیں۔ اور آپ کی پیدائش کے تین ماہ بعد انتقال کر گئیں۔ آپ کے والد بھی جہاد میں شہید ہوئے۔" اس پر آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں سید احمد کبیر سہروردی نے اپنے ذمے لی، جو ایک بلند پایہ درویش تھے۔ اور مشہور و معروف بزرگ شاہ جلال الدین بخاری کے تربیت یافتہ تھے۔[۲]

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۳۱۵) بڑے عالم اور صاحب تصانیف تھے۔" کچھ اوپر نوسو نوّے ہجری" میں وفات پائی۔ احمد آباد میں مزار ہے (اذکار الابرار ص ۲۸۹ ص ۳۰۸)

[۱] یعنی روضۃ الصالحین (محررہ ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء بعہد بادشاہ فرخ سیر) اور رسالہ از معین الدین خادم درگاہ (محررہ ۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء)

[۲] حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کے والد بزرگوار کا نام سید احمد کبیر سہروردی تھا۔ اور وہ اچہ کے مشہور بزرگ شاہ جلال الدین (سرخ پوش) بخاری کے مرید و فرزند تھے۔ سہیلِ یمن میں درج شدہ شجرے سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت شاہ جلال مجرد سلہٹی اچہ (بہاولپور، پنجاب) کے مشہور سہروردی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کم از کم ان کی والدہ ماجدہ اس خاندانِ عالیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

تیس سال تک شاہ جلال نے ایک غار میں عبادت کی۔ اس کے بعد آپ کے ماموں نے آپ کی ایک کرامت دیکھ کر آپ کو مٹی کی ایک مٹھی دی۔ اور کہا کہ اب تم دُنیا کی سیر کرو۔ اور جس جگہ اس رنگ و بُو کی مٹی ملے، وہاں اقامت پذیر ہو جانا۔ چنانچہ آپ نے رختِ سفر باندھا اور یمن[1] کے ایک شہر اور دہلی کی سیر کرتے ہوئے، (جس کے دوران میں آپ کی حضرت سلطان المشائخ سے ملاقات ہوئی) اپنے ساتھی فقیروں کے ساتھ سلہٹ پہنچے۔

ان دنوں سلہٹ میں ایک مسلمان برہان الدین نامی رہتا تھا۔ اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو اس نے اس تقریب پر ایک گائے ذبح کی۔ قضارا چیل گوشت کا ایک ٹکڑا لے گئی، جو اس سے ایک برہمن کے گھر میں گر پڑا۔ برہمن اس پر بہت بگڑا اور سلہٹ کے راجا گوڑ گوبند[2] کے پاس شکایت لے کر گیا۔ راجا نے

---

[1] حضرت شاہ جلال کے مزار پر ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں جو کتبہ لگایا گیا، اس میں ان کا نام "شیخ جلال مجردِ کنیائی" لکھا ہے۔ یمنی نہیں لکھا گیا۔ تاریخ جلالی (قلمی) کے مرتب مولوی اظہر الدین سلہٹی لکھتے ہیں "کتاب جغرافیہ مجمع البلدان وغیرہ میں یمن کا کوئی گاؤں کنیا کے نام سے نہیں ملتا۔ ہاں زائرین سرحد کابل نے ان (حضرت شاہ جلال) کو بخاری کے نام سے مشہور کیا ہے..... واللہ اعلم"

[2] سہیلِ یمن میں گوڑ گوبند کے متعلق لکھا ہے۔ "چوں زاد بومش ملک گوڑ بود، اورا گوڑ گوبند گفتندے۔ چوں قدوۃ الواصلین شاہ جلال گنج روانی گوڑ را بہ تیغِ جہاد مسخر فرمود۔ آں سم اندیش از آں براہِ فرار قدم زد۔ و بشہر سلہٹ آمد۔ واز شہریاری قدم زد"۔ شاہ جلال گنج روانی کے نام سے کسی بزرگ کا نام تذکروں میں نہیں ملتا۔ لیکن اخبار الاخیار میں شاہ جلال گجراتی کا ذکر ملتا ہے، جو گوڑ چلے گئے تھے۔ اور وہاں بادشاہوں کی طرح تخت نشینی کرنے لگے۔ چنانچہ حاکمِ وقت نے انھیں قتل کروا دیا۔

بزرگانِ اورنگ آباد کے سلسلے میں شاہ جلال گنج رواں ایک بزرگ کا ذکر ملتا ہے، جو گجرات سے وہاں تشریف لائے تھے۔

تحقیق حالات کے بعد حکم دیا کہ نومولود بچّے کو تو قتل کر دیا جائے اور اس کے باپ کا ایک ہاتھ کاٹ لیا جائے۔ اس پر برہان الدین فریاد لے کر گوڑ پہنچا، جو بنگال میں مسلمانوں کا دارالحکومت تھا۔ وہاں سے سلطان سکندر کے زیرِ قیادت جو بادشاہِ وقت کا بھانجا تھا، ایک لشکر اس ظلم کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہُوا لیکن یہ لشکر ناکام رہا۔ سہیلِ یمن میں لکھا ہے کہ گوڑ گوبند ایک بڑا جادوگر تھا۔ اس نے جنوں بھوتوں کا ایک لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجا[1] اور مسلمان ہار گئے۔ سلطان سکندر نے اپنے ماموں کو اطلاع دی تو وہاں سے ایک اور فوج نصیر الدین سپہ سالار کی زیرِ سرکردگی روانہ ہوئی لیکن ابھی تک مسلمانوں میں گوڑ گوبند کے جادو کا تھوڑا بہت اثر باقی تھا۔ اور فیصلہ ہُوا کہ شاہ جلال سے جو تین سو ساٹھ فقیروں کے ساتھ اس علاقے میں مصروفِ کار تھے، مدد کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ سلطان سکندر اور نصیر الدین شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انھوں نے ان کا دل بڑھانے کے لیے ایک دُعا پڑھی اور کہا کہ میں اور میرے ساتھی فقیر تمھاری فوج میں شامل ہوکر دشمن کو نیست و نابود کر دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ گوڑ گوبند کے جادو سے اب مسلمان ڈرتے نہ تھے۔ اور نہ ہی ان پر اس کا کوئی اثر ہُوا۔ اور سلہٹ بآسانی فتح ہو گیا[2]۔

---

[1] خان بہادر مولوی محمد حسین سفرنامہ ابنِ بطوطہ کے حواشی میں آسام کے جادو کا ذکر کر کے (جس کی ابوالفضل نے بھی آئینِ اکبری میں تفصیلات دی ہیں) لکھتے ہیں: "اس ملک پر کئی دفعہ مسلمانوں نے حملہ کیا۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے کچھ تو جنگل اور پانی کی فراوانی سے گھبرا گئے اور کچھ اس قسم (جادو) کی افواہ جو تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔ ہر ایک ارضی و سماوی و اتفاقی آفت کو ان کے سامنے جادوگر کی صورت میں پیش کرتی تھی۔"

[2] اس سے پہلے مسلمان دو مرتبہ سلہٹ کے راستے کامروپ (آسام) پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ (۱۲۰۵ء میں محمد بختیار خلجی اور ۱۲۵۳ء میں بنگالے کا گورنر طغرل) لیکن دونوں مہموں کا کوئی دیرپا نتیجہ نہ نکلا۔

شاہ جلال نے اس دوران میں دیکھا کہ سلہٹ کی مٹی خوشبو اور رنگ میں اُس مٹی سے ملتی ہے جو ان کے ماموں نے ان کو دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ان فقیروں کے ساتھ جو اس پر آمادہ ہوئے، سلہٹ میں بس جانے کا فیصلہ کیا۔

ہمیں سلہٹ جانے اور درگاہ جلالی میں حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ کارکنانِ الاصلاح لائبریری (سلہٹ) کی فیاضی سے سہیل یمن کا قلمی نسخہ دیکھنے اور یادداشت مرتب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مولوی اظہر الدین احمد صدیقی سلہٹی کی اردو تالیف تاریخ جلالی (قلمی) جس میں انھوں نے سہیلِ یمن کا خلاصہ مرتب کر کے اس پر تنقیدی نگہ ڈالی ہے، نظر سے گزری۔ اور خود مولوی صاحب سے تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگرچہ سہیلِ یمن کے بعض اندراجات غلط اور ناقابلِ تسلیم ہیں، لیکن اس سے حضرت شاہ جلال کی تاریخی اہمیت اور رُوحانی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سہیلِ یمن کے علاوہ نہایت قدیمی کتبے[1] اس امر کے شاہد ہیں کہ سلہٹ کی فتح "بہ عزمت شیخ المشائخ مخدوم شیخ جلال الدین مجرد بن محمدؒ" وقوع پذیر ہوئی۔ اور لطف یہ ہے کہ فتح سلہٹ کی نسبت جو کچھ مسلمان تذکرہ نگار کہتے ہیں، اس کی پوری تائید ہندو روایات سے ہوتی ہے (ملاحظہ ہو سر جادو ناتھ سرکار کی تاریخ بنگالہ جلد دوم صفحہ ۷۹)

۱۳۰۳ء میں سلہٹ فتح ہوا۔ اور ۲۰ ذلقیعد ۷۴۰ھ یعنی ۱۸ مئی ۱۳۴۰ء کو حضرت شاہ جلال نے وفات پائی۔ (آپ کی تاریخ وصال "شاہ جلال مجرد قطب بود" کے جملے سے نکلتی ہے)۔ قیام سلہٹ کے سینتیس ۳۷ سال میں کچھ وقت تو شاہ صاحب نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد و ہدایات میں۔ ضلع سلہٹ میں چار ایسے مشہور مقامات ہیں، جہاں مقامی روایات کے

---

[1] فی الحال یہ کتبہ (مورخہ ۹۱۸ھ) ڈھاکہ میوزیم میں ہے۔

مطابق حضرت شاہ صاحب نے اپنے ساتھی پیروں کو بسایا اور ان سے ارشاد و ہدایت کا کام لیا۔ یعنی سلہٹ، لاتو، ہاپینیہ ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ، شیخ جلال کے مزار کے پاس ایک قدیمی مسجد ہے، جس کے اخراجات کے لیے حکومت سے زرِ امداد ملتا ہے۔ بلکہ انگریزی حکومت کی ابتدا میں ہر نئے حاکم ضلع (کلکٹر) کو شیخ جلال رح کے مزار پر حاضری دینی پڑتی تھی۔ شیخ جلال رح کے ساتھی فقرا کی قبریں سلہٹ کے گلی کوچوں میں پائی جاتی ہیں۔

بنگال کے غازی اولیا

بنگال کی روحانی تاریخ کی ایک دلچسپ خصوصیت "غازی اولیا" یا ایسے بزرگوں کی افراط ہے، جن کی اصل دلچسپی تو خدا اور دوسری دنیا سے تھی، لیکن جنھیں حالات کے تحت عسکری کوششوں میں حصّہ لینا پڑا۔ اور جن کی مدد سے اسلامی حکومت کی توسیع ہوئی۔ بنگال اسلامی حکومت کی سرحد پر واقعہ تھا۔ شروع میں اسلامی حکومت بیشتر شمال مغربی بنگال تک محدود تھی۔ اس کے جنوب اور مشرق میں وسیع علاقے ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے۔ اسلامی حکومت کی توسیع کے بعد بھی وسائلِ آمد و رفت کی مشکلات کی وجہ سے کئی علاقے خود مختار زمینداروں اور راجاؤں کے زیرِ نگیں رہے، جو اکا دُکا مسلمان جا پہنچتا، اسے مذہبی رسوم کی ادائگی میں مشکلات پیش آتیں۔ اور ایک کشمکش کا آغاز ہو جاتا۔ اس کے علاوہ جہاد کا جوش بھی تھا، جو ان خدا رسیدہ بزرگوں کو میدانِ کارزار میں لے آتا۔

بنگال میں غازی اولیا میں سب سے اہم سلہٹ کے شاہ جلال رح ہیں، جن کا ہم ذکر کر چکے۔ مُلک کے اکثر حصّوں میں ایسے بزرگوں کے مزارات ہیں۔ جن کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے ہندو راجاؤں سے کشمکش کے بعد علاقے میں اسلامی جھنڈا بلند کیا۔ مثلاً ضلع ہگلی میں ایک مقام پنڈوہ اہلِ علم اور اشراف مسلمانوں کی ایک ممتاز بستی ہے، جہاں ابتدائی انگریزی حکومت میں کئی قاضی اور قاضی القضاۃ ہوئے۔ مشہور ہے کہ یہ خاندان اس جگہ عہدِ مغلیہ سے پہلے

آباد ہوئے اور اسلامی حکومت کے آغاز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کوئی چھ سات سو سال پہلے یہاں شاہ صفی الدین رہتے تھے۔ انھیں مقامی راجے نے تنگ کیا تو انھوں نے مسلمان بادشاہ کے پاس جا کر شکایت کی اور فوج بلا کر پنڈوہ کو فتح کرایا۔ ایک دوسرے اسلامی مرکز، منگل کوٹ، ضلع بردوان کے پیر راہی کی نسبت بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ساتگاؤں میں ظفر خاں اسی قسم کے مجاہد ولی تھے، جو مقامی روایات کے مطابق ہندو راجا کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئے، لیکن ان کے ایک بیٹے نے یہ مقام (تری بھینی) فتح کر لیا۔ شاہ اسمٰعیل غازی کے مزار تو ضلع رنگ پور میں کئی جگہ بتلائے جاتے ہیں، لیکن مشہور مزار کانتا دوار میں ہے، جہاں کے مجاور سے گزشتہ صدی میں پیر محمد شطاری کا لکھا ہوا رسالۃ الشہدا ملا تھا۔ اس کے مطابق راجا کامردیپ کے ساتھ لڑائی میں گوڑ کے مسلمان بادشاہ نے شاہ اسمٰعیل غازی سے مدد لی۔ اور فتح کے بعد اس علاقے کی حکومت ہی ان کے سپرد کر دی۔ لیکن گوڑاگھاٹ کے ایک ہندو نے بادشاہ کے کان بھرے۔ اور بادشاہ نے ۱۴۷۴ء میں انھیں شہید کرا دیا۔ اسی طرح ضلع ڈھاکہ میں سونار گاؤں کے بکرم پور کے مقام پر، جہاں بختیار خلجی سے شکست کھانے کے بعد ہندو راجا بلال سین نے اپنی راجدھانی منتقل کر دی تھی۔ بابا آدم شہید کا مزار ہے، جن کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ہندو راجا کے ساتھ کشمکش میں شہید ہوئے۔ مزار کے قریب ایک مسجد ہے، جو ۱۴۸۳ء میں بادشاہ بنگالہ نے تعمیر کرائی تھی۔

روحانی اور مادی سربلندی کے اس اتصال نے بعض جگہ مختلف صورتیں اختیار کیں۔ مثلاً مشرقی پاکستان کے ساحلی مقام کھلنا کے قریب، جو چٹاگانگ کے بعد اس صوبے کی بڑی بندرگاہ اور صنعتی مرکز بنتا جاتا ہے۔ باگھا ہاٹ میں حضرت خان جہان علی کا مزار ہے، جو ۱۴۵۸ء میں وفات پا گئے۔ ضلع جیسور کے گزیٹیر کے مطابق یہ بزرگ، جو عوام الناس کے نزدیک فقط ایک صاحب سطوت ولی تھے۔ سندربن کے وسیع جنگلات اور دلدلوں کے اس حصے کو آباد کرنے والے تھے۔ اس وقت یہ

علاقہ ویران تھا۔ وہ یہاں ساٹھ ہزار مزدوروں کے ساتھ آئے۔ یہاں ایک پختہ سڑک بنائی۔ تالاب کھدوائے۔ جنگلات کو صاف کیا۔ اور وسیع پیمانے پر کاشتکاری شروع کرائی۔ بالآخر وہ دُنیا سے دست بردار ہو گئے۔ اور اب زمانہ انھیں صرف بطور ایک ولی کے جانتا ہے۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان کی وفات کے ساتھ، ان کا کام بھی ختم ہو گیا۔ اور جنگل ایک بار پھر سارے علاقے میں پھیل گیا۔

شاہ جلال گجراتی
۱۴۷۶ء

روحانی اور مادی کوششوں کے اِتصال کی ایک اور مثال شاہ جلال رح کے ضمن میں ملتی ہے، جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں: ”در گوڑ بنگالہ بر تخت نشستے و حکم کردے چنانچہ بادشاہاں بنشینند و حکم کنند۔ بادشاہ گوڑ اورا شہید کرد۔ از جہت توہم و دغدغہ، کہ بقول غرض گویاں بخاطر اوراہ یافت“۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ شاہ جلال اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے اور گوڑ میں شہید ہوئے۔ لیکن اصل میں یہ وہی بزرگ ہیں، جو بنگالے میں شاہ جلال دکنی کہلاتے ہیں۔ اور جن کا مزار ڈھاکے کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ ڈھاکہ اس زمانے میں حکومتِ گوڑ کے تابع (اور سنار گاؤں سے اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر) ایک فوجی چوکی تھا۔ اور چونکہ شاہ جلال کو شہید کرنے کا حکم گوڑ کے بادشاہ یا اس کے افسروں نے دیا تھا۔ اس سے شیخ عبدالحق کو سہو ہوا ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ شاہ جلال گلبرگہ (دکن) کے حضرت سید گیسو دراز رح کے تربیت یافتہ بزرگ شیخ پیارا کے مرید تھے۔ اور اولیائے دکن کے تذکرے اس امر پر شاہد ہیں کہ یہ شاہ جلال اصل میں گجرات کے تھے۔ پھر دکن تشریف لے گئے۔ چونکہ وہاں سے وہ بنگال میں تشریف لائے۔ اس لیے بنگالے میں وہ دکنی مشہور ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث شاہ جلال کی نسبت لکھتے ہیں۔ ”از کاملانِ وقت بود۔ صاحب تصرف وکرامت وظاہر و باطن۔ مرتبہ عظیم وشانے رفیع داشتند“۔ اور بیان کیا ہے کہ جب بادشاہ کے سپاہی خانقاہ میں آئے،

اور شیخ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کرنا شروع کیا تو جس وقت کسی مرید پر تلوار چلاتے تو شیخ "یا قہار" "یا قہار" کہتے۔ جب ان کی باری آئی اور ان پر تیغ زنی شروع ہوئی تو انھوں نے "یا رحمان" "یا رحمان" کہنا شروع کیا۔ اور انھی الفاظ کے ساتھ جاں بحق تسلیم ہوئے۔

خزینۃ الاصفیا کے بیان کے مطابق شاہ جلال کی شہادت ۸۷۰ھ ۱۴۶۶ء میں ہوئی۔ آسودگانِ ڈھاکہ میں حکیم حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں: "حضرت جلال دکنی کا مزار بہت مشہور ہے۔ اور سب لوگ جانتے ہیں کہ آپ موتی جھیل میں ایک گنبد کے اندر آسودہ ہیں۔ ایک کتبہ بھی ہے۔ مگر اس میں صرف کلمۂ طیبہ کندہ ہے...... گنبد کے شمالی جانب سو قدم کے فاصلے پر ایک پکی قبر نظر آتی ہے۔ اور اس کے بعد چار دیواری کے اندر دوسری قبر ہے۔ اس احاطے کے بالکل مشرق میں ایک خاصا بڑا صحن نما قطعہ ہے، جو لوگ زامزار کہلاتا ہے۔ یہ یقیناً گنج شہیداں ہے۔ یعنی آپ کے ساتھ جن لوگوں نے شہادت پائی۔ سب ایک ہی بڑی سی قبر میں دفن کر دیے گئے ہیں۔ حضرت نعمت اللہ بت شکن کے احاطے میں جو تین گنبد کی مسجد موجود ہے، یہ دکنی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے اور یہی پرانے نقشوں میں درج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جلال قدس سرہ العزیز کے وقت ہی میں یہ مسجد بنی تھی۔"

خدا کی شان ہے کہ جس جگہ حضرت شاہ جلال کی خانقاہ تھی۔ اور جہاں ایک تخت پر بیٹھ کر وہ احکام جاری کیا کرتے تھے، اسی جگہ آج "گورنمنٹ ہاؤس" ہے۔ اور وہیں صوبے کے حاکم اعلیٰ مسند نشین ہیں۔ "آج موتی جھیل کی مالک نواب اسٹیٹ ہے۔ مگر پورا احاطہ گورنمنٹ کے قبضے میں ہے۔ کہ یہاں گورنمنٹ ہاؤس ہے۔ اجازت کے ساتھ زیارت کی اجازت مل سکتی ہے۔"

جن لوگوں نے شاہ جلال کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ ان میں ملّادہ (ضلع قنوج) کے مصباح العاشقین شیخ محمد تھے۔ جن کے مرید شیخ عبدالحق دہلی کے

دادا (شیخ سعد اللہ) اور چچا (شیخ رزق اللہ مشتاقی) تھے۔

شاہ جلال گجراتی کے مرشد شیخ پیارا تھے۔ جن کی "تربیت" حضرت میر سید محمد گیسو دراز نے کی لیکن جو مرید حضرت گیسو دراز کے پوتے سید ید اللہ کے تھے۔ وہ چشتی، نظامی سلسلے سے تھے۔ اور غالباً یہی سلسلہ شاہ جلال گجراتی کا تھا۔

شاہ جلال کے مزار سے کچھ فاصلہ پر باغ دلکشا کے پاس حضرت شاہ نعمت اللہ بت شکن کا مزار ہے۔ ان کی نسبت روایت مشہور ہے کہ ان کے اشارے سے بت ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لیے ان کو بت شکن کہتے تھے۔ لیکن ان کے زمانہ حیات کی نسبت کوئی صحیح اطلاع نہیں۔ خیال ہے کہ آپ عہد مغلیہ سے پہلے ڈھاکے تشریف لائے۔ شہر ڈھاکہ سے تقریباً سات میل شمال کی طرف میر پور کی مشہور بستی میں ایک قدیمی مسجد کے اندر حضرت شاہ علی بغدادی کا مزار ہے۔ مسجد پر جو کتبہ لگا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ ۸۸۵ھ میں یہاں ایک مسجد بنی تھی۔ جو شکستہ ہو گئی تو پھر تعمیر ہوئی۔ شاہ علی بغدادی اس مسجد کے اندر معتکف ہوئے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔ حکیم حبیب الرحمان نے آسودگان ڈھاکہ میں ان کا سال وصال ۹۸۵ھ لکھا ہے (ص ۱۲۸) "بنگال میں یہ عہد یعنی نویں اور دسویں صدی مبلغین اسلام کے ورود کا خاص سال ہے۔" صرف شہر ڈھاکہ اور ضلع میں اس عہد میں تشریف لانے والوں میں حضرت شاہ جلال گجراتی، سنارگاؤں میں حاجی بابا صالح اور حضرت شاہ منگر کے نام معلوم ہیں۔ "قریباً یہ حضرات ہم عہد ہیں۔"

اشاعتِ اسلام

بنگال میں صوفیائے کرام نے اشاعتِ اسلام میں جو کارہائے نمایاں کیے، ان کے متعلق بنگالے کی مفصل انگریزی تاریخ میں ایک ہندو اہل قلم کا ذیل کا اندراج ہے:-

"مسٹر سٹیپلٹن لکھتے ہیں:- "اس زمانے میں بنگالے میں اولیا اور غازیوں[1]

---

[1] یعنی وہ رضاکار جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے خود تیغ بکف رہیں۔

کی اتنی بڑی تعداد آگئی تھی کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حالات ضرور سلاطینِ دہلی کی بنگالے کے متعلق کسی خاص سوچی ہوئی پالیسی کا نتیجہ تھی۔" فی الحقیقت یہ قیاس بے جا نہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے ان اولیاے مجاہد "Soldier Saints" کا اسلام کی تاریخ میں وہی مرتبہ ہے جو صلیبی لڑائیوں کی تاریخ میں ان ٹمپلر مجاہدین کا تھا۔ (جو مسلمانوں سے لڑنے اور عیسائی مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی زندگی وقف کرتے تھے) اگرچہ ان اولیاے کرام کی اخلاقی حالت مسیحی بہادروں یعنی (Knights) سے بہتر تھی اور دنیاوی حکام کے بھی وہ ان سے زیادہ وفادار تھے۔ اگر گوڑ گوبند کی شکست اور سلہٹ کی فتح یا ہگلی پانڈوا راجا کے متعلق مسلمانوں کی عام روایات میں حقیقت کا عنصر موجود ہے تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان اولیا کے ساتھ نسبتاً غیر محتاط پیروؤں کا بھی ہجوم ہوتا تھا، جو ہندو راجاؤں کے علاقے میں کوئی ذرا سا بہانہ لے کر جم جاتے تھے اور پھر اسلامی حکومت کی باقاعدہ فوج کو بلا لیتے تھے۔ تاکہ وہ آن کفار راجاؤں کو مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کی سزا دے"! سلطان جلال الدین کی رحم دلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (جس نے مسلمانوں کا خون بہانے کی بجائے ایک ہزار ٹھگوں کو کشتیوں میں بھر کر بنگالے بھیج دیا تھا) مسٹر اسٹیپلٹن لکھتے ہیں: "بنگالے کے سلاطین کے لیے ایسی جلاوطنیوں کے اثر کو زائل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ ان نوواردوں کو اپنی بیرونی افواج (Foreign Legion) میں بھرتی کر لیتے اور بنگالے کی سرحد پر کافر راجاؤں سے لڑائیاں لڑنے پر لگا دیتے"۔

بلبنی سلاطین[1] کے عہدِ حکومت میں نہ صرف بنگالے میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں بھی اور گہری ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اولیاے کرام

---

[1] یعنی بنگالے کے وہ بادشاہ جو بغرا خاں ابنِ سلطان غیاث الدین بلبن کی نسل سے تھے۔ مضمون نگار کی رائے ہے کہ بنگالے کے مشرقی حصے میں (یعنی سنار گاؤں (موجودہ ڈھاکہ سے مشرق کی طرف) حکومتِ اسلام کی توسیع اور ملک میں اسلام کی اشاعت ان ہی بلبنی شاہوں کے عہدِ حکومت میں ہوئی (مترجم)

نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عملی پارسائی، قوتِ عمل اور دُور اندیشی میں بڑھ کر تھے۔ وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی، جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی بلکہ ان کا مذہبی جوش اور ان کی عملی زندگی۔ وہ نچلے طبقے کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت بھی (ہمیشہ کی طرح) توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے شکنجے میں گرفتار تھے۔ دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہو کر اسلامی حکومت کے لیے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہو گئے۔ بنگالے کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد (اسلامی) صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے، اس سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مندروں اور ہندو خانقاہوں کو تباہ و برباد کر کے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زر و جواہر پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہو سکتی تھیں اور نہ ہی ان غیر فانی روحانی خزائن کا خاتمہ ہو سکتا تھا، جن پر ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں۔ مسلمان اولیا نے اخلاقی اور روحانی فتح کے عمل کو مکمل کیا اور اس مقصد کے لیے ہندو دھرم اور بدھ مت کے پرانے استھانوں پر (جو اب برباد ہو گئے تھے) ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کر دیں۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں میں ہندو مت کے احیاء کا امکان جاتا رہا اور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے کہانیاں رائج ہو گئیں جن کے مطابق یہ نو وارد قدیمی مقدس ہستیوں کے جانشین ہو گئے۔ ہندو عوام جو صدیوں سے ان مقامات کو مقدس مانتے آتے تھے، ان کی پرانی تاریخ کو بھول گئے۔ اور بڑی آسانی سے انھوں نے اپنی ارادت کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کر دیا جو ان مقامات پر قابض ہو گئے تھے۔ مذہبی دائرہ میں اس ارتباط کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بالآخر ایک رواداری کی فضا پیدا ہو گئی، جس نے ہندوؤں کو اپنی سیاسی شکست سے بے پروا کر دیا۔ ہندو سوسائٹی بالخصوص نچلے طبقے کے ہندو اولیا

اور غازیوں کی کرامات کے ایسے قصّوں کی بدولت جو بسا اوقات قدیم ہندو اور بودھی روائتوں پر مبنی تھے، آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ شاید ہندو تیرتھوں پر اس یورش کی سب سے نمایاں مثالیں دو ہیں۔ ایک راجگیر میں سرنگی رشی کنڈ کا مخدوم کنڈ بن جانا اور دوسرے دیو اوتار روایات کے معجزہ باز بدھ کا ایک مقدس مسلمان ولی مخدوم صاحب میں تبدیل ہو جانا!

ہم کسی اور جگہ ان اولیا اور دوسری مقدس ہستیوں کے ہاتھوں جن کے مزار اور استھان تمام ملک میں بکھرے ہوئے ہیں، بنگال کی رُوحانی فتح کی تفصیلات بیان کریں گے[1]۔

مندرجہ بالا بیان ڈاکٹر کالی کا راجن قانونگو کا ہے۔ سر جادو ناتھ سرکار خود اس مسئلے پر لکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی فتح بنگالہ کے وقت (١٢٣٠ء) سے کئی صدیاں پہلے مشرقی بنگال کے عوام (اور فی الحقیقت بہت سے شرفا کا) مذہب ہندو مت کا تن ترک طریقہ "Tantric Hinduism" تھا، جو بعد میں بدھ مت کی ارواح پرستی اور جادو سے، جو اب بھی تبت میں رائج ہے۔ مختلف نہ تھا۔ ہندو راجاؤں کے عہدِ حکومت میں سنسکرت کے عالم، ہندو وید، اور بڑے بڑے ہندو پنڈت مغربی بنگال سے دریا کو عبور کر کے مشرق میں آتے اور مشرقی بنگال میں آباد ہو جاتے۔ اسی طرح مشرقی بنگال کے درباروں اور مشہور استھانوں کی زیارت کرتے۔ لیکن وہ سوسائٹی کے اونچے طبقے سے متعلق تھے اور مشرقی بنگال کے بڑے شہروں اور دولت مند استھانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب ندیا اور گوڑ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو یہ تمدنی آمدورفت بھی ختم ہو گئی اور اس کے بعد عرصہ تک ہنسا برہماپتر کے مشرقی علاقے میں لوگ ہندو رہے، لیکن ان کا مذہب گوڑ کے ہندوؤں کا سا نہ تھا۔ ان کے ہاں نہ تو پڑھے لکھے برہمن پوجاری تھے، نہ سنسکرت کی مقدس

---

[1] تاریخ بنگالہ مرتبہ سر جادو ناتھ سرکار (جلد دوم) صفحہ ٦٨-٧٠۔

کتابیں تھیں اور نہ ہی ویدک رسومات رائج تھیں۔ قریب قریب ہر جگہ ان کی عبادت اَن پڑھ، مظاہر پرست پجاریوں (بلکہ صحیح طور پر یہ کہنا چاہیے کہ بھوت پریت کے ماننے والے "Witch Doctors") کے ہاتھوں ہوتی۔ اس وقت مشرقی بنگال کے ہندو عوام کی یہ حالت تھی کہ تعلیم یافتہ آریا پروہت انھیں نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے درمیان کوئی برہمن ایسے موجود نہ تھے جو انھیں مذہبی تعلیم دیتے یا ان کی مذہبی رسومات کو پوری طرح بجالاتے۔ فی الحقیقت کامروپ اور اراکان کے منگولی بُدھ مت والوں کی طرح وہ بھیڑوں کا ایک ایسا گلہ تھے، جس کا گلہ بان کوئی نہ ہو۔ اس لیے جب سلہٹ کے شاہ جلال اور اسلام کے دوسرے مبلغین وہاں اشاعتِ مذہب کے لیے پہنچے تو ان کے مقابلے کے لیے ہندومت کا کوئی لائق بجاری سامنے نہ آیا اور مشرقی بنگال کے ہندو بڑی آسانی سے ارواح پرستی چھوڑ کر (خواہ اسے آپ بعد کا بدھ مت کہہ لیں یا تنترک طریقے کا ہندو مذہب، کیونکہ فی الحقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں) گروہ در گروہ مسلمان ہو گئے۔ سلہٹ اور راج گیر (جنوبی بہار) کے ابتدائی مسلمان مبلغین اور ان کے ہاتھوں مقامی ہندو پروہتوں یعنی "جوگیوں" کی زورِ کرامت سے شکست کا فی الحقیقت اصل مطلب یہی ہے! (ص ۲۲۷ - ۲۲۸)

بنگال میں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں شاہ جلال تبریزیؒ حضرت شیخ نور قطب عالمؒ شاہ جلال یمنی سلہٹیؒ اور ان کے لاتعداد ساتھیوں کا کام قابلِ تعریف ہے۔ لیکن شاید ان بزرگوں کی کوششوں سے بھی زیادہ اسلام کی کامیابی کی اصل وجہ اسلامی روحانیت اور مساوات تھی۔ اسلام نے شہروں سے زیادہ دیہات میں اور اونچی ذاتوں سے زیادہ نیچی ذاتوں میں فروغ پایا۔ اس کی وجہ ڈاکٹر ہنٹر یہ بیان کرتے ہیں:۔

"ان لوگوں کے لیے جن میں مفلس ماہی گیر، شکاری، قزاق اور ادنیٰ قوم کے کاشتکار تھے۔ اسلام ایک اوتار تھا، جو ان کے لیے آکاش سے اترا تھا۔

وہ حکمران قوم کا مذہب تھا۔ اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے۔ جنھوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا، جس کو سب ذلیل و خوار سمجھتے تھے۔ اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند تر تخیل پیدا کر دیا۔ اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہو کر بڑی ذلت و خواری کے دن کاٹ رہی تھیں، اسلام نے بلا تامل اپنی اخوت کے دائرے میں شامل کر دیا۔[1]

گجرات میں اشاعتِ اسلام

پٹن ساحلی مقامات کو چھوڑ کر گجرات کے جس شہر میں اسلامی مبلغ سب سے پہلے آئے وہ نہروالہ (یا انہلواڑہ) پٹن ہے، جو احمد آباد کی تعمیر سے پہلے ایک بڑا پُر رونق شہر اور گجرات کے ہندو راجاؤں کا دار السلطنت تھا۔ خوش قسمتی سے اس شہر کے بزرگوں کے حالات شیخ جہاں سید احمد صاحب نے منازل الاولیا میں جمع کر دیے تھے۔ اور ان کا خلاصہ گجرات کی مشہور تاریخ مرآۃ احمدی میں درج ہے۔ انھیں دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے مسلمان مشائخ اور داعی کہاں کہاں جا پہنچے تھے!

سب سے پہلے جس بزرگ کا ذکر ملتا ہے، وہ ایک بوہرہ داعی تھے، جنھیں یمن سے تبلیغ کے لیے بھیجا گیا۔ ان کا نام مختلف رواتیوں میں عبداللہ اور محمد لیا جاتا ہے۔ آپ پہلے کھنبائت آئے۔ پھر راجا سدھ راج جے سنگھ (المتوفی ۵۳۸ھ) کے زمانے میں پٹن گئے۔ اور برہمنوں کے لباس میں اس کے ملازم ہوئے۔ بیس سال تک آپ نے اس کے باورچی کی حیثیت سے کام کیا۔ بالآخر اُسے

---

[1] منقولہ در پریچنگ اوف اسلام صر: ۲۸

پتا چل گیا۔ اور اس نے تنہائی میں آپ سے دریافت کیا۔ آپ نے مسلمان ہونے کا اقرار کیا تو اس نے آپ کو زندہ جلانا چاہا۔ لیکن معتقدین کہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی وفات پا گئے اور لاش پھولوں کا ڈھیر ہو گئی۔ (غالباً احباب لاش مخفی طور پر اٹھا لے گئے اور پھول رکھ گئے۔ جیسا کہ اس عہد میں متعدد واقعات ایسے ہوئے ہیں[1]")

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ آپ نے راجا سدھ راج جے سنگھ کو مسلمان بنایا تھا، لیکن وہ پھر مرتد ہو گیا۔ بوہروں کی تاریخ کوکب فلک میں لکھا ہے کہ سدھ راج جے سنگھ کو سیدی احمد نے مسلمان بنایا جو مصر سے براہ یمن گجرات کی مشہور بندرگاہ کھنبائت میں آئے اور کچھ مدت کے بعد سدھ راج کو مع وزیر بہارمل اور تارمل کے مسلمان بنایا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اسمٰعیلی شیعہ تھے، اس لیے تا عمر تقیہ کرتے رہے۔ اور جب سدھ راج مر گیا تو اس کی وصیت کے مطابق اسے مخفی طور پر دفن کر دیا گیا۔ اور اس کی چارپائی پر پھول رکھ کر لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ چوں کہ نیک دل عابد راجا تھا، اس لیے اس کی لاش کو دیوتا اٹھا لے گئے[2]۔

پٹن پر اس زمانے میں شاہانِ اسلام کے حملے ہو رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی تو ۴۱۶ھ ۱۰۲۵ء میں ہی سومنات جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ لیکن محمود کا حملہ بادوباراں کا طوفان تھا۔ جو آیا اور چلا گیا اور اس کی کوئی مستقل یادگار قائم نہ ہوئی۔ اس کے بعد سلطان محمد غوری نے ۵۷۴ھ میں اچہ کے رستے ریگستان کو طے کر کے گجرات پر حملہ کیا۔ مگر شکست کھا کر واپس ہوا۔ کوئی بیس سال بعد قطب الدین ایبک نے گجرات فتح کر کے نیا نائب وہاں مقرر کیا۔ لیکن گجرات کے راجے نے اس سے یہ ملک چھین لیا۔ گجرات کی

---

[1] تاریخ اولیاے گجرات (ترجمہ مراۃ احمدی) از مولوی ابوظفر ندوی صر ۱۲۶ نیز دیکھو بمبئی گزیٹیر جلد نہم حصہ دوم۔ صر ۲۶۰۔ [2] تاریخ اولیاے گجرات صر ۱۲۷

ہند و حکومت کا مستقل خاتمہ سلطان علاء الدین خلجی نے کیا، جس نے ۱۲۹۷ء میں گجرات کے سابق وزیر مادھو کے شوق دلانے سے، جو راجہ کے ظلم و ستم کا شاکی تھا، گجرات فتح کیا۔ اور اسے مقبوضات دہلی میں شامل کیا۔

مشہور صوفی سلسلوں میں نظامی اور سہروردی بزرگوں نے پٹن پر خاص توجہ کی ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کے تین خلفا کے نام (سید موسے وراق الحسنی والچشتی، مخدوم سید حسین خنگ سوار، شیخ حسام الدین عثمانی) پٹن کے بزرگوں میں ملتے ہیں۔ لیکن اولیت کا شرف شیخ حسام الدین کو حاصل ہے۔ ان کا وطن ملتان تھا۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے خاص خلیفہ تھے۔ ۶۹۵ھ میں پٹن تشریف لائے[۱] اور اکتالیس[۲] برس تک رشد و ہدایات میں مشغول رہے۔ ۱۸ ذیقعد ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔ سید حسین خنگ سوار ان کے برادر زادہ تھے۔ ۷۰۲ھ میں پٹن تشریف لائے اور ۷۹۸ھ میں وفات پا گئے۔ شیخ حسام الدین کے وجود مسعود سے ملتان اور اُچہ کے کئی اور بزرگ یہاں تشریف آور ہوئے۔ ان میں سے ایک شیخ صدر الدین آپ کے بھانجے تھے، جو مع اہل و عیال کے ملتان سے تشریف لائے۔ پہلے ناگور میں (جو ریاست جودھپور میں ایک مشہور اور قدیم مقام ہے) مقیم ہوئے۔ اور آپ کی توجہ سے اسلام کو وہاں وقار حاصل ہوا۔ راجہ کی لڑکی سے آپ نے نکاح کیا۔ پھر آپ کو شیخ حسام الدین نے مع اپنی بہن اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے پٹن بُلا لیا۔ اس زمانے کے ایک اور بزرگ شیخ جمال الدین اچی ۷۳۰ھ میں پٹن تشریف لائے اور پندرہ سال ارشاد و ہدایت کے بعد ۷۴۵ھ میں انتقال کیا۔ حضرت چراغ دہلوی کی بھی پٹن کی طرف توجہ رہی ہے۔ چنانچہ ان کے مُرید اور عزیز شیخ الاسلام شیخ سراج الدین یہیں آرام فرما ہیں۔

---

[۱] یہ بیان تذکرہ اولیائے گجرات کا ہے۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ شیخ حسام الدین اس وقت گجرات گئے جب سلطان محمد تغلق لوگوں کو دہلی چھوڑ کر دولت آباد جانے پر مجبور کر رہا تھا۔

گجرات بالخصوص احمد آباد میں نظامی سلسلے سے زیادہ سہروردی سلسلے نے فروغ پایا۔ اس سلسلے کے مرکز ملتان اور اچہ تھے۔ اور سندھ میں اس کے ماننے والے کثرت سے تھے۔ سندھ اور گجرات میں دُور کا فاصلہ نہیں۔ اس لیے اس سلسلے کے بزرگ کثرت سے گجرات آئے۔ اور ان تعلقات کا آغاز اس زمانے میں ہو گیا تھا، جب ابھی احمد آباد تعمیر نہ ہُوا تھا۔ اور پٹن کی آبادی بارونق تھی۔ حضرتِ مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ کے بھائی سید راجو قتالؒ نے گجرات کی طرف خاص دھیان رکھا۔ آپ کے کئی مُرید (مثلاً سید محمد خدا بخش، سید احمد مخدوم جہان شاہ) پٹن میں دفن ہیں۔ آپ نے ہی حضرت قطب عالم کو دو سال خاص طور پر تعلیم دے کر فرمایا کہ اہلِ گجرات کی ہدایت آپ کے ذمّہ کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت قطب عالم اپنی والدہ کے ساتھ پہلے پٹن تشریف لائے اور جب احمد آباد تعمیر ہُوا (۸۱۳ھ) تو سلطان احمد کی استدعا پر احمد آباد تشریف لے گئے۔

احمد آباد کی بنا سے پٹن کی رونق کم ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اس شہر میں بڑے بڑے فخرِ روزگار علما و فضلا پیدا ہوتے رہے۔ ان میں سے ایک مولانا محمد طاہر پٹنی تھے، جن کے حالات ہم تفصیل سے دوسری جگہ درج کریں گے۔ انھی کے خاندان سے عہدِ عالمگیری کے قاضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب، قاضی شیخ الاسلام اور دوسرے مشہورِ زمانہ علما پیدا ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی پٹن کی نسبت لکھتے ہیں:۔

> در پٹن کہ بلدۂ قدیمہ ولایتِ گجرات است، مشائخ بسیار آسودہ اند۔ و در حقیقت دراں سرزمین بوئے عشق و محبت می آید۔ واز ویرانہائے دے نورِ برکت و ولایت مے تابد۔ و ہنوز ایں شہر از وجُودِ اہلِ دل خالی نیست و نبودہ است ؎
>
> بہر زمیں کہ نسیمے ز زلفِ او زدہ است
>
> ہنوز از سرِ آں بُوئے عشق مے آید!"

احمد آباد ۸۱۳ھ میں آباد ہُوا اور نیک نیت بانئ شہر نے آبادی کے وقت

بزرگانِ دین سے استمداد کی۔ مشہور ہے کہ اس شہر کی ابتدائی بُنیاد احمد نام کے چار بزرگوں نے کی۔ ایک سلطان احمد بن محمد شاہ بن مظفر شاہ بانی شہر۔ دوسرے شیخ احمد کھٹو گنج بخشؒ۔ تیسرے مُلک احمد۔ چوتھے قاضی احمد۔ بزرگانِ دین کی دُعا اور شاہانِ گجرات کے اقبال سے جلد ہی یہ شہر اس علاقے کے باقی شہروں سے بازی لے گیا۔ اور بزرگانِ دین اور علما و فضلا اس شہر میں کثرت سے جمع ہو گئے۔ اور ایک زمانے میں تو علم و فضل کے لحاظ سے احمد آباد کو دہلی پر فضیلت حاصل تھی۔

بھروچ

ان بزرگوں کے ساتھ جو کسی مشہور سلسلے سے منسلک نہیں صوفیہ کے تذکروں میں جس طرح بے رُخی برتی گئی ہے' اس کا اندازہ باوا ریحان کے ذکر سے ہوتا ہے' جن کا مزار بھروچ کے باہر گجرات کی ایک قدیمی زیارت گاہ ہے۔ گجرات بلکہ سارے صُوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ دیہاتی آبادی اسی علاقے میں ہے۔ بمبئی میں عام طور پر وہ آبادی کا دس فیصدی کے قریب ہیں' لیکن ضلع بھروچ میں ان کی آبادی بیس فیصدی سے زیادہ ہے۔ اس وجہ سے خیال ہو سکتا تھا کہ اس علاقے کے بزرگوں سے بے اعتنائی نہ برتی جائے گی۔ لیکن حقیقتِ حال اس سے مختلف ہے۔ مراۃ احمدی میں باوا ریحان کی نسبت فقط ایک سطر ہے۔ "بھروچ میں قبر ہے۔ ۶ شعبان کو عُرس ہوتا ہے"۔ نہ کوئی حالات دیے ہیں نہ جائے پیدائش نہ تاریخ وفات۔ لیکن زیادہ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ باوا ریحان' جن کا اصل نام خدا معلوم کیا تھا' بڑے صاحبِ سطوت بزرگ گزرے ہیں۔ مسٹر فاربس نے ان کی نسبت اپنی کتاب (Oriental Memoires) میں لکھا ہے:۔

"۱۰۷۰ء اور ۴۹۲ھ میں جب بھروچ کے علاقے میں ہندوؤں کا راج تھا' بغداد سے ایک بزرگ باوا ریحان مشائخ اور فقرا کی بڑی تعداد کے ساتھ اشاعت اسلام کی غرض سے یہاں وارد ہوئے۔ لیکن راجہ نے ان کی مخالفت کی۔ اور اپنے بیٹے رائے کرن کو ایک بڑی فوج دے کر باوا ریحان کے مقابلے کے لیے

بھیجا۔ رائے کرن باوا صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے
باوا صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اور ملک محمد اپنا نام رکھا۔ ان دونوں
کی کوششوں سے راجے کی بیٹی بھاگ دیوی اور اس کے علاوہ بے شمار
دوسرے ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر باوا ریحان کے مرید ہو گئے۔ لیکن رائے کرن
کے باپ نے ان کی مخالفت کی اور بالآخر باپ اور بیٹے میں بڑا سخت معرکہ
ہوا۔ باپ کامیاب رہا۔ اور رائے کرن، اس کی بہن اور نو مسلموں کی بھاری
تعداد لڑائی میں شہید ہوئی۔ اس کے بعد راجا نے باوا صاحب سے صلح کر لی۔
اور جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بھروچ سے باہر ایک بلند ٹیلے پر دفن ہوئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ باوا ریحان کا وطن ماوراالنہر تھا۔ اپنے بھائی بابا احمد
اور چالیس فقرا کے ساتھ پانچویں صدی ہجری میں بھروچ تشریف لائے اور راجے
سے معرکے کے بعد ۴۳۰ھ میں مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر کی۔ بعد میں ایک گجراتی
سردار عماد الملک نے آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کروا دیا۔

ضلع بھروچ کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد سنی بوہروں کی ہے، جو کاشتکاری
کرتے ہیں اور اپنے کام میں مستعد، ہوشیار اور کفایت شعار ہیں۔ ان کے علاوہ
اس علاقے میں تھوڑی تعداد راجپوت نو مسلموں کی ہے جنھیں "مولے سلام"
کہتے ہیں۔ ان کے نام اور بہت سی رسمیں ہندوانہ ہیں۔

راندیر ضلع سورت میں مسلمانوں کی سب سے قدیم بستی راندیر میں ہے، جو سورت
سے تین میل دور دریائے تاپتی کے دوسری طرف واقع ہے۔ اب بھی
مسلمان اس شہر کی کل آبادی کا چالیس فیصد ہوں گے۔ یہ شہر سورت کی ترقی
سے پہلے بڑا مشہور تھا۔ اور قدیم تاریخوں مثلاً البیرونی کی تصانیف میں اس کا
ذکر ہے۔ ۱۲۲۵ء میں یہاں جینیوں کی حکومت تھی۔ اس وقت عرب تاجروں
اور ملاحوں کی ایک جماعت یہاں آکر آباد ہوئی۔ جین حاکموں سے ان کا مقابلہ ہوا
اور انھوں نے جینیوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ عرب نوائط کہلاتے

تھے۔ اور چونکہ وہ دُور دراز کے ملکوں سے تجارت کرتے تھے۔ ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ اب اس شہر میں نوائط بہت تھوڑے ہیں، لیکن ان کی جگہ سُنی بوہروں نے لے لی ہے، جو برما، مشرقی افریقہ اور دوسرے ملکوں سے تجارت کرتے ہیں۔ اور عام طور پر بڑے خوشحال ہیں۔ اس شہر کی بعض مسجدیں بڑی خوبصورت ہیں۔ اور یہاں ایک تابعی کا مزار بھی بتایا جاتا ہے۔

کھنبائت راندیر سے بھی مشہور بندرگاہ کھنبائت کی ہے، جو قدیمی ایام سے عرب اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت کا راستہ بنی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں شروع سے ہی عربوں کی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ابتدائی بوہرے مبلغ اور کئی دوسرے بزرگ اسی بندرگاہ کے رستے یمن اور عرب کے دوسرے حصّوں سے ہندوستان آئے۔ اور آکر گجرات اور کچھ میں اپنے عقائد کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ مشہور بوہرہ فاضل محمد علی جنھیں پیر پرواز بھی کہتے ہیں، پہلے کھنبائت میں تشریف لائے۔ ان کا مزار آج بھی بوہروں کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

کھنبائت میں اور بھی کئی بزرگوں کے مزار ہیں۔ ابنِ بطوطہ یہاں ۷۴۳ھ میں آیا۔ وہ یہاں کی مسجدوں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور دو خانقاہوں کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ ایک حاجی ناصر کی، جو عراق کے شہر دیار بکر کے باشندے تھے اور دوسری خواجہ اسحٰق کی جہاں فقیروں کو لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ تذکرۂ اولیائے گجرات (ترجمہ مراۃ احمدی) میں کھنبائت کے بزرگوں کا صحیح طور پر ذکر نہیں۔ ایک معذرت آمیز نوٹ ہے۔ "واضح ہو کہ بندر کھنبائت ایک پرانی آبادی ہے۔ اور بزرگانِ دین بے شمار قدیم ایام سے آج تک وہاں آرام فرما رہے ہیں۔ ان تمام لوگوں کا حال لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ کتنے ایسے ہیں، جن کے حالات سے آگاہی نہیں ہوئی۔" مصنف نے صرف تین بزرگوں کی نسبت ایک ایک دو دو سطریں لکھی ہیں۔ ایک مولانا میاں۔ دوسرے قاضی نورالدین جو

حضور ؒ کے نام سے مشہور۔ تیسرے بابو چشتی جو صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ۸۷۱ھ میں وفات پائی۔

متفرق

دکن اور گجرات کے عوام میں داول شاہ کا نام اسی طرح لیا جاتا ہے جس طرح شمالی ہندوستان میں سید سالار مسعود غازی کا۔ ان کی یاد میں کئی مقامات پر چلّے قائم ہیں۔ اور ہر ایک مقام پر سالانہ عرس ہوتا ہے۔ آپ کا نام شیخ عبد اللطیف تھا۔ اور سلطان محمود بیگڑہ بادشاہ احمد آباد کے اُمرا میں سے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے آپ کو داور الملک کا خطاب حاصل تھا، جسے بگاڑ کر عوام نے داول شاہ کر لیا۔ آپ امورِ ظاہری و باطنی دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ بادشاہِ وقت کی طرف سے بھی آپ فوجی خدمتوں پر مامور ہوتے تھے۔ اور بادشاہِ معنوی حضرت شاہ عالم ؒ کے بھی چہیتے مرید تھے۔ حضرت شاہ عالم نے آپ کو شہید ہونے کی بشارت دی۔ چنانچہ آپ قوم گراسیہ کے چند افراد کو مطیع کرنے گئے تھے کہ انھوں نے فریب سے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۸۷۹ھ کا ہے[1]۔ آرنلڈ کا بیان ہے کہ کچھ کے کئی لوگوں کو آپ نے مسلمان کیا۔

عرب تاجروں کے علاوہ مسلمان سپاہی بھی کئی ہندو سلطنتوں میں ملتے تھے۔ جنھیں ہندو حکمرانوں نے اپنے مُلک کی حفاظت کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا۔ مثلاً سومنات کے راجے کے پاس مسلمان افسروں کی ایک تعداد تھی۔ اور احمد آباد کے قصباتی کہتے ہیں کہ وہ ان خراسانی سپاہیوں کی اولاد ہیں، جو واگھیلہ راجاؤں کی فوج میں ملازم تھے۔

گجرات میں اسمٰعیلی مبلّغین کی کوششوں کا تفصیلی ذکر ہم آیندہ سطور میں کریں گے۔ لیکن یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سُنّی مسلمانوں نے صرف غیر مُسلموں میں ہی تبلیغ نہیں کی۔ بلکہ شیخ طاہر الدین پٹنی اور دوسرے بزرگوں نے کئی اسمٰعیلیوں بالخصوص

---

[1] تاریخ اولیاے گجرات (ترجمہ مولوی ابو ظفر ندوی) ص ۱۷)

بوہروں کو سُنّی عقائد پر مائل کیا۔ جب ۱۳۹۱ء میں (سلطان) مظفر اوّل دہلی سے گجرات کا صوبیدار ہو کر آیا تھا تو وہ اپنے ساتھ سُنّی علما کی ایک بڑی جماعت لایا تھا چنانچہ اب گجرات میں سُنّی مسلمان غالباً شیعہ مسلمانوں سے زیادہ ہیں۔ اور دونوں کل آبادی کا دسواں حصّہ ہیں۔

میمن جماعت

اہلِ سنت والجماعت کی جس تبلیغی کامیابی کا سب سے زیادہ اثر گجرات کاٹھیاواڑ پر پڑا۔ وہ گجرات سے باہر حاصل ہوئی۔ اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے تجارت پیشہ طبقے میں میمن جماعت کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے آبا و اجداد ہندو تھے۔ اور لوہانہ[1] اور ایک دو دوسری ذاتوں میں منقسم تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی میں علاقہ سندھ میں اسلام قبول کیا۔ اور پھر وہاں سے کاٹھیاواڑ، گجرات، بمبئی وغیرہ میں منتقل ہوئے۔

میمن کہتے ہیں کہ پیرانِ پیر حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے آخری وقت اپنے بیٹے تاج الدین کو تلقین کی تھی کہ وہ سندھ میں جا کر اشاعتِ اسلام کریں۔ وہ تو غالباً نہ کر سکے۔ لیکن ان کی نسل میں سے ایک بزرگ سیّد یوسف الدین قادری ۱۴۲۱ء میں عراق عرب سے سندھ تشریف لائے۔ اس وقت ٹھٹہ سندھ کا دارالخلافہ تھا۔ سیّد صاحب نے اسی کو ارشاد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ اور جلد ہی لوہانہ خاندانوں اور ان کے سرگروہ اور ان کے بیٹوں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ میمن انھی خاندانوں کی نسل سے ہیں۔ سیّد یوسف الدین تو وفات سے پہلے عراق واپس تشریف لے گئے۔ اور ان کے جانشینوں نے کاٹھیاواڑ کے راجے کی دعوت پر کاٹھیاواڑ کے مقام مندرہ کو اپنا مرکز بنایا۔ لیکن جو بیج سیّد صاحب نے بویا تھا، وہ پھلا پھولا اور اسلامیانِ ہند و پاکستان میں ایک

---

[1] میمنوں کی روایات کے مطابق لوہانے علاقہ ملتان کے ایک قصبہ لوہانپور سے آئے تھے۔

محنتی، سمجھدار، راسخ الاعتقاد اور مخیر جماعت کا اضافہ ہوا۔

عام طور پر اسمٰعیلی، مصر کے فاطمی خلفا کو اپنا سیاسی اور مذہبی سرگروہ مانتے تھے اور ہندوستان کے دو اسمٰعیلی فرقوں کا اختلاف ان خلفا کی جانشینی پر ہوا۔ ان خلفا میں سے خلیفہ مستنصر کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام نزار تھا اور چھوٹے کا مستعلی۔ خلیفہ کی وفات کے بعد ان میں جانشینی پر لڑائی ہوئی۔ اور دو فرقوں کا آغاز ہوا۔ نزار سے جو فرقہ چلا۔ اس کی ترجمانی خوجے کرتے ہیں۔ اور بوہرے مستعلی کی جانشینی کے قائل ہیں۔ لیکن یہ اختلاف فقط شخصی نہ رہا۔ نزاریوں میں حسن بن صباح (متوفی ۱۱۲۴ء) نے اسمٰعیلی مذہب کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ مذہب کی اشاعت و تبلیغ کے نئے اصول وضع کیے اور اپنا رشتہ مصر سے توڑ لیا۔ اب ان کی دعوت کا مرکز ایران تھا۔ مصر و یمن کے اسمٰعیلی مستعلی کی امامت کے قائل اور قدیم مذہبی روایات کے پابند رہے۔ اور جب مصر میں انھیں زوال ہوا تو انھوں نے اپنی دعوت کا مرکز یمن میں منتقل کر لیا، جہاں سے ہندوستان میں ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی رہی۔

قرامطہ اسمٰعیلی خیالات کی سب سے پہلی جماعت جس کا ذکر پاک و ہند کی تاریخ میں ملتا ہے، قرامطہ ہے۔ جن کے داعی نویں صدی عیسوی ہی میں قاہرہ، عراق، حضر موت اور یمن سے مغربی پاکستان میں آنے شروع ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ انھوں نے سندھ اور مغربی پنجاب میں بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ مذہب کے لیے ان کے دل میں بڑا جوش تھا۔ ملتان پر قابض ہونے کے بعد انھوں نے شہر کا قدیمی مندر جسے محمد بن قاسم نے برقرار رہنے دیا تھا، مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ان کی تبلیغی کوششیں بھی بڑی وسیع اور منظم تھیں۔ لیکن اہل سُنّت والجماعت سے ان کے شدید مذہبی اور سیاسی اختلافات تھے۔ اور ہندوستان پر محمود غزنوی کی حملوں کا ایک مقصد قرمطیوں کی بیخ کنی بھی تھا۔ چنانچہ اس نے منصورہ کے اسمٰعیلی گورنر کو شکست دے کر ایک سُنّی مسلمان کو

حکومت تفویض کی۔ محمود کے جانے کے بعد ان لوگوں نے پھر غلبہ پالیا۔ اور محمد غوری کو دوسری دفعہ یعنی ۱۱۷۵ء میں ملتان ان کے قبضے سے چھڑانا پڑا۔ سلطان محمد غوری کی موت بھی اسی فرقے کے ایک فدائی کے ہاتھوں ہوئی۔

اسلامی حکومت کے استحکام اور سُنّی خیالات کی اشاعت کے بعد قرامطہ کا زور جاتا رہا۔ اب وہ آپ ہی آپ اور خود رَو طریقے سے اسمٰعیلی بن رہے تھے۔ لیکن غزنوی اور غوری ان سب کو ملاحدین سمجھ کر (سیاسی اور مذہبی اسباب کی بنا پر) ان کی بیخ کنی میں سختی سے کوشاں تھے۔ اب جو لوگ اسمٰعیلی خیالات کے تھے انھوں نے یا تو اپنے خیالات کے اظہار میں اخفا سے کام لیا۔ یا حکومت کے مرکز سے دُور گجرات اور کچھ کی طرف چلے گئے۔ ان لوگوں کے مذہبی عقاید اور سیاسی عزائم میں بھی کچھ تبدیلی ہوگئی۔ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد قرامطہ کا ذکر ہندوستانی تواریخ میں نہیں ملتا۔ لیکن ان کے جانشین خوجے اور بوہرے موجود ہیں جن کی اہمیت ان کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

خوجے بوہروں اور عام مسلمانوں کے عقائد و عبادات میں وہ اختلاف جو عام اسمٰعیلیوں کو فرقۂ اہلِ سُنّت والجماعت سے ہے موجود ہے اور ان میں بعض ہندوانہ باتیں بھی ایسی ہیں جو نومسلم بوہرے اپنے قدیم مذہب سے لے آئے۔ یا جنھیں بوہرہ مبلغوں نے مقامی سہولتوں کے لحاظ سے اختیار کر لیا۔ لیکن ان بُنیادی اور گنے چُنے اختلافات کے علاوہ بوہرے ٹھیٹھ مُسلمان ہیں۔ اُنھوں نے نزاریوں کی طرح اصُول اسلام کو توڑ موڑ کر غیر مسلموں کے حسبِ مذاق نہیں بنایا۔ اسمٰعیلیوں کی دوسری جماعت یعنی آغاخانی خوجوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کے نظام و عقائد میں کئی باتیں نیم مسلم بلکہ خالص طور پر غیر اسلامی ہیں۔ ہمیں کئی ایسے خوجوں کے ساتھ رہنے سہنے اور نماز و عبادت کا موقع ملا ہے، جنھیں عام مسلمانوں سے تمیز کرنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن جماعت کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور ان میں کئی ایسے طبقے شامل ہیں، جن کا اسلام سے بہت دُور کا تعلق ہے۔

نور ست گرو ۔ خوجے زیادہ تر پنجاب، سندھ، کچھ، کاٹھیاواڑ اور صوبہ بمبئی میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پہلے داعی کا اصلی نام غالباً نورالدین یا نور شاہ تھا۔ لیکن وہ عوام الناس میں نور ست گرو کے نام سے مشہور تھے۔ انھیں بارھویں صدی میں قلعہ الموت سے بھیجا گیا۔ انھوں نے گجرات میں تبلیغ کی۔ پہلے وہ گجرات کے دارالخلافہ پٹن میں آئے۔ پھر کچھ عرصے کے لیے ایران چلے گئے۔ واپس آ کر نوساری کے قرب وجوار میں ارشاد وہدایت شروع کی۔ اور اسماعیلی روایات کے مطابق نوساری کے ہندو راجے کی بیٹی سے شادی کی۔ اپنی کرامات سے بہت سے لوگوں کو مسخر کرلیا۔ اپنا نام ہندوانہ رکھا۔ لیکن مسلمان انھیں نورالدین یا سید سعادت کہتے تھے۔ اور انھوں نے کنبی، کہار اور کولی قوم کے لوگوں کو جو گجرات کی نیچ ذاتیں تھیں۔ اسمٰعیلی مذہب میں شامل کیا۔[۱]

مورخین نے سلطانہ رضیہ کے واقعات حکومت کے ضمن میں لکھا ہے کہ ۱۲۳۷ء میں نور ترک نامی ایک شخص نے گجرات، سندھ وغیرہ کے "قرامطہ وملاحدہ" کے ساتھ دارالخلافہ دہلی پر خروج کیا۔ اس واقعہ کے متعلق طبقات ناصری میں ذیل کا اندراج ہے:۔

"اور ان واقعات میں سے جو سلطانہ رضیہ کے ابتدائے عہد حکومت میں رونپذیر ہوئے سب سے اہم یہ تھا کہ ہندوستان کے قرامطہ وملاحدہ نور ترک نامی ایک عالم نما شخص کے اکسانے پر ہندوستان کے دوسرے حصوں مثلاً گجرات اور سندھ، دارالخلافہ دہلی کے گرد ونواح اور جمنا اور گنگا کے کناروں سے جمع ہوئے۔ اور مل کر بیعت کی اور اس نور ترک کی انگیخت پر اہل اسلام پر حملہ کیا۔ یہ نور ترک وعظ کہا کرتے تھے اور عوام الناس اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہ

---

[۱] آرنلڈ۔ دعوات اسلام۔ ان کا مزار ریاست بڑودہ کے شہر نوساری میں بتایا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ صوبہ بمبئی کا گزیٹر، جلد نہم۔ حصہ دوم۔ ص ۶۶۳)

اہلِ سنت والجماعت کو ناصبی اور مرجی کہتا تھا اور عوام الناس کو حنفی اور شافعی علما کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن مقرر ہُوا اور ملاحدہ و قرامطہ کا یہ سارا گروہ ۶۔ رجب ۶۳۴ھ کو بروز جمعہ، قریباً ایک ہزار آدمی کے ساتھ تلواروں ڈھالوں اور کلہاڑوں سے مسلح ہو کر ایک فوج کی صورت میں جامع مسجد دہلی میں آگھسے۔ ان کا ایک حصّہ نئے قلعے کی طرف سے جامع مسجد کے شمالی دروازے میں آیا اور دُوسرا گروہ بازار بزازان میں سے ہوتا ہُوا مدرسہ معزی کو جامع مسجد سمجھ کر اس میں آن گھسا۔ اور دونوں طرف سے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ تو ملاحدہ کی تلواروں کا شکار ہوئے اور کئی ہجوم میں کچلے گئے۔ جب اس فتنے کے خلاف آواز بلند ہوئی تو دار الخلافے کے بہادر مثلاً نصیر الدین ایتمی اور امیر امام ناصر شاعر اور دوسروں نے زرہ اور خود پہن کر، نیزہ و سپر وغیرہ سے مسلح ہو کر مسجد کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر تیغ زنی شروع کی۔ اور جو مسلمان جامع مسجد کی چھت پر تھے، انھوں نے اینٹ پتھر برسائے۔ حتیٰ کہ ملاحدہ و قرامطہ راہی دوزخ ہوئے۔ اور اس فتنے کا خاتمہ ہُوا۔" (ترجمہ از طبقاتِ ناصری ص ۱۸۹)

منہاج سراج نے بالتصریح نور ترک کو قرامطہ اور ملاحدہ کا سرگروہ کہا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض صوفیہ اس کے مخالف نہ تھے۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے طبقاتِ ناصری کے اس اندراج کی نسبت جو اظہارِ خیال کیا، اس سے نور ترک کے لیے ہمدردی ٹپکتی ہے۔ فوائد الفواد میں امیر حسن سنجزی آپ کی زبانی لکھتے ہیں (ترجمہ):۔

"مولانا نور ترک کی بابت ذکر شروع ہُوا تو میں نے عرض کی کہ بعض علما نے اس کے مذہب کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ فرمایا نہیں۔ آسمان سے جو پانی برستا ہے وہ اس سے بھی زیادہ پاکیزہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ میں نے طبقاتِ ناصری میں لکھا دیکھا ہے کہ اس نے علمائے شریعت کو ناجی اور مرجی کہا ہے۔ فرمایا اسے علمائے شہر سے بڑا تعصّب تھا۔ اس واسطے کہ وہ انھیں دُنیا کی آلودگی سے

آلودہ دیکھتا تھا اور اس واسطے علماء بھی اس سے مختلف چیزیں منسوب کرتے تھے۔

پھر میں نے عرض کی کہ مرجی اور ناجی کون ہوتے ہیں۔ فرمایا ناجی رافضی کو کہتے ہیں اور مرجی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ہر جگہ سے امید رکھیں۔ اور پھر فرمایا کہ مرجی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خالص۔ دوسرے غیر خالص۔ خالص وہ ہے جو صرف رحمت کا ذکر کرے اور مرجی غیر خالص وہ جو رحمت کی بابت بھی کہے اور عذاب کی بابت بھی اور یہی صحیح مذہب ہے۔

بعد ازاں مولنا ترک کی بابت فرمایا کہ آپ کی بات میں بڑا زور تھا۔ لیکن آپ نے ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلایا۔ جو کچھ کہتے علم اور مجاہدہ کی قوت سے کہتے۔ آپ کا ایک غلام تھا، جو آپ کو ہر روز ایک درم دیا کرتا تھا۔ اور یہی آپ کی وجہ معاش تھی۔

پھر فرمایا کہ جب آپ مکے گئے تو وہیں سکونت اختیار کی۔ اس ولایت کا ایک آدمی وہاں گیا اور اس نے دو سیر چاول آپ کو دیے۔ آپ نے لے کر دُعا دی۔ لیکن اس سے پہلے دہلی میں ایک مرتبہ سلطانہ رضیہ نے کچھ سونا آپ کی خدمت میں بھیجا تو آپ لکڑی اُٹھا کر اس زر کو پیٹنے لگے کہ یہ کیا ہے اسے لے جاؤ۔ جب مکے میں اس آدمی نے دو سیر چاول دیے اور آپ نے لے لیے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ ہے تو یہ وہی بزرگ، جس نے دہلی میں زر کو اس طرح رد کر دیا تھا اور اب دو سیر چاول قبول کرتا ہے۔ اس پر مولنا نور ترک نے فرمایا کہ صاحب مکے کو دہلی جیسا قیاس نہ کرو۔ نیز میں اُن دنوں جوان تھا۔ اب وہ قوت اور تیزی کہاں رہی۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ یہاں کا دانہ دُنکا بھی عزیز ہے۔

بعد ازاں فرمایا کہ ایک مرتبہ مولنا ترک نے ہانسی میں وعظ کہا۔ میں نے شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس سرہ العزیز کی زبانی سُنا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے بارہا آپ کی وعظ و نصیحت سُنی۔ جب آپ ہانسی پہنچے تو میں نے جا کر آپ کی وعظ و نصیحت سُننی چاہی۔ میں اس وقت پھٹے پُرانے رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کبھی مجھ سے پہلے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی فرمایا کہ مسلمانو اب سخن کا صراف آگیا ہے۔

بعد ازاں اس قدر تعریف کی کہ کبھی کسی بادشاہ کی بھی نہ کی ہوگی!" ترجمہ از فوائد الفواد ص ۱۹۸-۱۹۹)

قیاس کہتا ہے کہ مولانا نور ترک جن کا طبقات ناصری اور فوائد الفواد میں ذکر ہے، وہی نور ست گر ہوں گے جنھیں اسمٰعیلی خوجے اپنا پہلا داعی بتاتے ہیں۔ اور جنھوں نے ہندوستان میں سُنّی حکومت کی غیر مستحکم حالت کا فائدہ اٹھا کر یہاں بھی مصر کی طرح اسمٰعیلی جھنڈا لہرانا چاہا۔ نور ست گر کو خوجے اپنا پہلا مبلغ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نور ست گر کے آنے سے پہلے پاک و ہند میں اسمٰعیلی نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں تو اسمٰعیلی بالکل ابتدائی زمانے سے آگئے تھے۔ بلکہ ایک زمانے میں وہ ملتان اور منصورہ کے حکمران ہو گئے تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر قرمطی تھے، جو بعد میں اسمٰعیلیوں میں جذب ہو گئے۔ لیکن جن کے عقائد اسمٰعیلی عقائد سے بہت سی باتوں میں مختلف تھے۔

خوجوں کا سلسلہ مشہور اسمٰعیلی داعی حسن بن صباح سے ملتا ہے، جس نے ۱۱۲۴ء میں وفات پائی۔

شاہ شمس سبزواری | خوجوں کے دوسرے مبلغ شاہ شمس تھے جو ملتان میں ایک بڑے شاندار روضے میں آرام فرما ہیں۔ انھیں عام طور پر شاہ شمس تبریز کہا جاتا ہے۔ لیکن خوجہ روایات کے مطابق وہ ایران کے شہر سبزوار سے تشریف لائے۔ ان کی نسبت متعدد روایات عوام میں مشہور ہو گئی ہیں۔ اولیا اور مشائخ کے بعض تذکروں میں ان کو صوفیائے کرام میں شمار کیا گیا ہے۔ اور ان کی نسبت ایک روایت مشہور ہے کہ جب ملتان کے ایک قصاب نے انھیں گوشت کی بوٹی بھون کر دینے سے انکار کیا تو انھوں نے سورج کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ سورج سوا نیزے پر آ گیا۔ جس سے انھوں نے اپنی بوٹی بھون لی۔ لیکن شہر میں قیامت برپا ہو گئی۔

پنجاب کی ایک جماعت، جو بظاہر ہندوؤں میں شامل ہے اور خوجوں کے

موجودہ امام آغاخان کو اپنا دیوتا تسلیم کرتی ہے۔ اپنے آپ کو شاہ شمس کے نام پر شمسی کہتی ہے[1]۔

خوجوں کی تاریخ بلاغ المبین کے مطابق آپ کی وفات ۱۳۵۶ھ میں ہوئی۔ لیکن یہ تاریخ غالباً غلط ہے۔ ملتان گزیٹیر کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت ۱۱۶۵ھ ہے۔ اور آپ کو حضرت بہاء الدین بہاء الحق کا ہمعصر لکھا ہے۔

سہروردی روایات کے مطابق مشہور سہروردی بزرگ شیخ رکن الدین ملتانیؒ کو "رکن الدین عالم" کا لقب آپ نے عطا فرمایا تھا، جو مختصر ہو کر "رکنِ عالم" رہ گیا۔ (بزم صوفیہ ص ۲۶۲)

پیر صدر الدین

اسمٰعیلی خوجہ جماعت کے سب سے بڑے داعی جنھوں نے تمام نزاری عقائد کو ہندوستانی ماحول کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دیا۔ پیر صدر الدین تھے، جو خراسان سے پاکستان آئے اور اب ریاست بہاولپور میں مدفون ہیں۔

پیر صدر الدین کی نسبت موجودہ آغاخانیوں کا بیان ہے کہ آغاخان کے ایک

---

[1] چشمۂ کوثر کی پہلی اشاعت پر ایک معمر بزرگ نے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے ایک شکایت بھی کی "لیکن افسوس ہے کہ آپ نے سرکار ملتان حضرت شمس تبریز کا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ میرے ...... بزرگ حضور شمس تبریز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مسلمان کردہ ہیں۔"

یہ بیان خاندانی روایات پر مبنی ہے، لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ پنجاب میں شیخ قوم کے نومسلموں کو (جو اس وقت اسمٰعیلی نہیں) کھوجہ یا خوجہ کہا جاتا ہے۔ کیا یہ غیر ممکن ہے کہ وہ سُنی ہونے سے پہلے اسمٰعیلی خوجے تھے۔ اور راسخ الاعتقاد سُنی مسلمان بننے سے پہلے ایک نیم اسلامی روحانی منزل میں سے گزرے ہیں؟ (یا تاجر قوم کے سب لوگوں کو خوجہ کہا جاتا تھا؟) بمبئی گزیٹیر (جلد نہم، حصہ دوم۔ ص ۳۸) میں لکھا ہے۔ کہ پنجاب کے خوجے سولھویں صدی کے وسط میں سُنی ہونے لگے۔ اس لیے امام وقت نے ایک نیا نائب ایران سے بھیجا۔

مورثِ اعلیٰ شاہ اسلام شاہ نے انھیں داعی بناکر ایران سے بھیجا۔ اور جو لوگ ان کے یا ان کی اولاد کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے وہ شروع سے اسمٰعیلی تھے۔ اور اسمٰعیلی امام کے پاس آمدنی کا دسواں حصہ نذرانہ بھیجتے تھے۔[1]

پیر صدرالدین نے ایران سے آکر ہندوستان میں اسمٰعیلیوں کی تین جماعتیں منظم کیں، جن کے منتظم پنجاب میں مکھی سیٹھ شام داس لاہوری، کشمیر میں مکھی سیٹھ تلسی داس اور سندھ میں مکھی ترکیم تھے۔[2] سندھ اور مغربی پنجاب میں لوہانہ قوم کے بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اسمٰعیلیوں کا پہلا جماعت خانہ سندھ کے گاؤں کوہاڑہ میں پیر صدرالدین کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اسمٰعیلیوں کے بیان کے مطابق پیر صدرالدین ۷۰۰ھ میں سبزوار میں پیدا ہوئے۔ اور ایک سو اٹھارہ سال کی عمر میں (۱۳۱۸ء میں) وفات پائی۔

ریاست بہاول پور کے سرکاری گزیٹیر میں پیر صدرالدین کا ذکر حاجی سید صدرالدین کہہ کر کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ اکثر ہندوؤں کے درمیان رہتے اور انھوں نے بہت سے ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ ہندو انھیں مچھیر ناتھ کہتے ہیں۔ سندھ کے بہت سے خوجے ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اور انھی نے

---

[1] برٹن نے اپنی کتاب تاریخ سندھ (۱۸۵۱ء) کے ص ۴۱۰ پر سرارسکن پیری کے چند فقرے نقل کیے ہیں، جن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بعض خوجے آغا خان کو اس پیر کی، جس نے انھیں مسلمان کیا تھا۔ (یعنی پیر صدرالدین کی) اولاد سمجھتے تھے۔ برٹن نے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸۶۳ء میں بمبئی ہائیکورٹ میں ایک اہم مقدمہ دائر ہوا تھا، جس میں ایک جماعت کہتی تھی کہ چونکہ پیر صدرالدین سُنّی تھے، اس لیے موجودہ خوجے بھی سُنّی سمجھے جانے چاہئیں اور ان پر آغا خاں کا کوئی حق نہیں۔ عدالت کا فیصلہ اس جماعت کے خلاف تھا۔

[2] و [3] ملاحظہ ہو اسمٰعیلیوں کی تاریخ (انگریزی) از مسٹر اے۔ ایس پکلے (ص ۶۳-۶۴)

ان کا روضہ تعمیر کیا۔

بہاولپور گزیٹر کے مطابق سید صدرالدین کا سلسلہ امام حسین علیہ السلام سے تیئسویں[۲۳] پشت میں مل جاتا ہے[۱] ۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی وفات اچہ میں ہوئی۔ لیکن انھوں نے وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری نعش کو صندوق میں بند کرکے اونٹ پر رکھ دیجیے۔ جہاں یہ اونٹ بیٹھے وہیں مجھے دفن کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اونٹ ریاست بہاولپور کے ایک گاؤں ترندہ[۹۳] گور گنج کے قریب رک گیا۔ اور وہیں مزار تعمیر ہوا۔ قریب ہی پیر صدرالدین کے بیٹے سید غیاث الدین دفن ہیں۔ جب بہاولپور گزیٹر لکھا گیا (سنہ ۱۹۰۴ء) اس وقت سجادہ نشین سید الٰہی بخش شاہ تھے، جو اپنے آپ کو پیر صدرالدین کی نسل سے بتاتے تھے۔ بہاولپور میں پیر صدرالدین کو چوراسی روضہ والا صاحب بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نسبت مشہور ہے کہ ان کی اولاد میں سے چوراسی[۹۴] اولیا ہوئے۔

پیر صدرالدین اور ان کے صاحبزادے سید کبیرالدین حسن نے اسمٰعیلیوں میں نئی روح پھونک دی۔ اور یہ زمانہ ان کی کامیاب اشاعتِ مذہب کے لیے یادگار ہے۔ شیخ صدرالدین نے نزاری فرقہ کے طریق تبلیغ کے مطابق اپنا نام ہندوؤں کا سا رکھا۔ اور ہندو مذہب کے بعض عقائد کو صحیح تسلیم کیا۔ تاکہ

---

[۱] مرآتِ احمدی میں پیر صدرالدین کے پوتے (سید امام الدین) کا حسب ذیل شجرۂ نسب درج ہے:۔

سید امام الدین بن سید کبیرالدین حسن بن سید صدرالدین محمود بن سید شہاب الدین بن سید نصیرالدین۔ بن سید شمس الدین بن سید صلاح الدین صالح بن سید اسلام الدین بن سید عبدالمومن بن سید خالد بن سید محبیب الدین بن سید محمود بن سید محمد ہاشم بن سید احمد ہادی بن سید جمال مستنصر باللہ بن سید عبدالمجید بن سید غالب بن سید منصور بن سید اسمٰعیل ثانی بن سید نورالدین بن سید اسمٰعیل بن حضرت جعفر صادق۔"

اسمٰعیلیہ مذہب کی اشاعت میں آسانی ہو۔ انھوں نے ایک کتاب دس اوتار کے نام سے لکھی یا رائج کی۔ جس میں رسول اکرمؐ کو برہما۔ حضرت علی کو وشنو اور حضرت آدم علیہ السلام کو شنو سے تعبیر کیا ہے۔ یہ کتاب خوجہ قوم کی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اور مذہبی تقریبوں پر اور نزع کے وقت مریض کے بستر کے قریب پڑھی جاتی ہے۔

پیر صدر الدین کے پانچ بیٹے تھے۔ حسن کبیر الدین، ظہیر الدین، غیاث الدین، رکن الدین، تاج الدین (خواجہ شاہ طریل) ان میں موخر الذکر کا مزار سندھ میں حیدر آباد کے قریب ٹنڈھو باگھو سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور سندھی خوجے ان کے بڑے معتقد ہیں۔ لیکن پانچ بھائیوں میں سب سے زیادہ شہرت سید کبیر الدین حسن المتوفی ۱۴۹۰ء کو حاصل ہے، جنھیں امام وقت نے آپ کے والد کی طرح پیر کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور ہندوستان میں اپنا داعی اور وکیل مقرر کیا تھا۔ ان کی نسبت ریاست بہاولپور کے گزیٹیر میں لکھا ہے کہ انھوں نے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان کیا اور ان کی نسبت مشہور تھا کہ جس ہندو پر ان کی نظر پڑ جاتی وہ مسلمان ہونے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ انھیں حسن دریا بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ سندھ کے ہندوؤں کا ایک قافلہ گنگا کی جاترا کے لیے سندھ سے روانہ ہوا۔ جب یہ لوگ اچہ شریف پہنچے تو سید کبیر الدین حسن نے ان سے کہا کہ تم اتنی دُور کیوں جاتے ہو۔ میں تمھیں گنگا اور جمنا کے درشن یہیں کرا دیتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ وہ بولے کہ اچھا۔ سید کبیر الدین نے کہا کہ تم گنگا اور جمنا کی علامتیں نامزد کر لو اور پھر آزماؤ کہ یہ علامتیں یہاں نظر آجاتی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ یہ علامتیں نامزد ہوئیں اور پیر صاحب سے کہا گیا کہ اپنی کرامات دکھائیں۔ دوسرے روز صبح کے وقت جاترلیوں نے

ؔ سندھ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ پیر صدر الدین نے ایک عالم برہمن سے اپنے کام میں مدد لی۔ (ص ۱۲۶)

دیکھا کہ گنگا اور جمنا دونوں ان کے قریب بہ رہی تھیں اور ان میں سب ملے شدہ علامتیں موجود تھیں ۔ چنانچہ جاتریوں نے اسلام قبول کیا اور پیر کبیرالدین حسن کا نام حسن دریا مشہور ہوا ۔

پیر کبیرالدین کا مزار اچہ شریف سے ایک میل کے فاصلے پر ہے ۔ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خوجوں کی ایک کتاب گنان مرتب کی ۔ (اگرچہ بعضے اس کتاب کو ان کے والد سے منسوب کرتے ہیں ۔) پیر کبیرالدین حسن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث اپنے تذکرہ اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں :-

"سید کبیرالدین حسن رحمۃ اللہ علیہ سیاحت بسیار کرد و بعد ازاں در اچہ سکونت کرد۔ گویند کہ وے صد و ہشتاد سال عمر داشت ۔ واللہ اعلم ۔ گویند کہ از وے خوارقِ عادت بوجود مے آمد و اعظم و اشہر خوارق او اخراج کفار بود از کفر بسوے اسلام و ہیچ کافر را بعد از عرض کردن او اسلام را بروے طاقت نماندے و در قبولِ بے اختیار شدے ۔ جماعہ کفار پیش مے آمدند و مسلمان مے شدند و گویند کہ ایں نسبت در بعضے اولاد او نیز موجود بود ۔

گویند بعضے از اولاد او[1] بسبب ہوائے نفس و دنیا بہ بدعتہا مبتلا شدند ۔ و اختراعِ اعمالے عجیب پیدا کردند ۔ و بہ چیز ہائے غریب منسوب گشتند واللہ اعلم و ایں سبب طعن و بدنامیِ سلسلہ او باشد ۔ وفات او ہشت صد و نود و شش ۸۹۶ و قبر او در اچہ است ۔" (ص ۲۱۳)

تاریخ اوچ میں مولوی حفیظ الرحمان نے سید کبیرالدین حسن کی نسبت ذیل کا اندراج دیا ہے، جو غیر مصدقہ مقامی روایات پر مبنی معلوم ہوتا ہے :-

---

[1] گلزار شمس تبریز کے مطابق پیر کبیرالدین کی سات بیویاں تھیں ۔ جن کے بطن سے اٹھارہ لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی ۔ یہ اٹھارہ لڑکے مغربی پنجاب، سندھ، کاٹھیاواڑ، گجرات کے مختلف شہروں میں جاکر بس گئے اور اسمٰعیلی عقائد کی اشاعت کا مرکز بن گئے (حبل المتین ص ۵۰۲)

"آپ کے پردادا سید شاہ شمس الدین سبزواری سال ۵۹۸ھ میں ملتان آئے اور وہیں ۶۷۵ھ میں وفات پائی تھی۔

"حسن دریا' سہروردی سلسلے کے ذکر و مشاغل میں مصروف رہے۔ اسی کی تلقین اور ارشاد فرماتے رہے۔ مگر آپ کی اولاد کا مذہب اثنا عشری ہے۔ ادوچ کے خوجے اپنے آپ کو ایرانی النسل تجار بیان کرتے ہیں۔ وہ اکثر اسمٰعیلی ہیں۔ مشہور فرقہ اسمٰعیلیہ آپ کے بزرگ شاہ اسمٰعیل سے منسوب ہے۔ ادوچ کے اسمٰعیلی خوجے بالعموم اب اثنا عشری ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے کے بزرگ بطور تقیہ اپنے آپ کو سہروردی صوفی سلسلہ سے منسوب ہونے کے مدعی ہیں" (ص ۱۵۱)

پیر صدر الدین اور پیر کبیر الدین حسن کی تبلیغی کوششوں کا مرکز سندھ اور مغربی پنجاب تھا۔ لیکن جب فیروز تغلق کے زمانے سے سندھ کے حکمران خاندان پر اسلامی رنگ غالب آنا شروع ہوا۔ اور مخدوم سرخ پوش بخاری حضرت مخدوم جہانیاں' سید راجو قتال اور بعد میں قادری بزرگوں کی وجہ سے اچہ اور ارد گرد کے علاقے میں سنی اثرات غالب آ گئے تو اسمٰعیلی مبلغوں نے کچھ' گجرات اور مغربی ہندوستان کی طرف زیادہ توجہ شروع کی۔

بمبئی گزیٹیر (جلد نہم حصہ دوم) میں خان بہادر منشی فضل اللہ لطف اللہ لکھتے ہیں کہ جب سولھویں صدی عیسوی میں پنجاب کے خوجے سنی ہونے شروع ہوئے تو امام وقت نے ایک راسخ الاعتقاد سندھی خوجہ دادو (یا دادو) کو ایران بلایا۔ اسے اپنا نائب یا پیر نامزد کیا۔ اور پاک و ہند میں اسمٰعیلی تبلیغ کے لیے واپس بھیجا۔ لیکن سندھ کے سومرہ حکمرانوں نے دادو کی مخالفت کی۔ اور اسے ۱۵۴۹ء میں سندھ چھوڑ کر کاٹھیاواڑ میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں وہ پہلے جام نگر میں آیا' جہاں کے راجے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر کچھ کی راجدھانی بھوج میں چلا گیا۔ پیر دادو کی وفات ۱۵۹۴ء میں ہوئی۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا صادق ہوا۔ لیکن اس کے بعد پیر کا عہدہ ختم ہوا۔ اور امام وقت کے نائب کو وکیل کہا جانے لگا۔

۱۸۴۵ء میں خود امام وقت یعنی آغا خان ہندوستان میں آ گیا۔ اور اب پیر اور وکیل کا عہدہ ختم ہو گیا۔ شروع میں اس سلسلے کے لوگ سُنیوں کی مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے۔ اور ان کی بیاہ شادی، جنازہ وغیرہ کی رسومات بھی سُنی یا اثنا عشری مولویوں کے زیرِ اہتمام بجالائی جاتیں۔ لیکن ۱۸۶۴ء میں آغا خاں اوّل نے حکم نامہ جاری کیا کہ ان موقعوں پہ آغا خانیوں کی ہی قیادت کی جائے۔ اکثر آغا خانیوں نے اس پر عمل کیا۔ لیکن موجودہ آغا خاں نے پھر سے اپنے پیروؤں کو عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور نمازِ عید وغیرہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔

سیّد امام الدین اور مومنہ جماعت

نزاری سلسلے کے ایک اور مبلغ سیّد امام الدین تھے۔ جنھیں عوام امام شاہ کہتے ہیں۔ ان کے پیرو آغا خانیوں کے سلسلۂ امامت کے پابند نہیں۔ لیکن وہ اپنے بانی کو نزار کی اولاد میں سے بتاتے ہیں۔ اور انھوں نے عام اسمٰعیلی طریقۂ تبلیغ کی پیروی میں مقامی باشندوں کی کئی باتیں قبول کر لی ہیں۔ لیکن ان کا امام شاہی یا ست پنتھی طریقہ اسمٰعیلی خوجوں کی نسبت کبیر پنتھی اور نانک پنتھی طریقوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ اور اس فرقے میں نزاری سلسلۂ امامت کی بھی پابندی نہیں۔ تاریخ اولیائے گجرات (ترجمہ مراۃ احمدی) میں سیّد امام الدین کی نسبت لکھا ہے:- "آپ کے والد کا نام کبیر الدین تھا۔ عراق سے ہند تشریف لاکر ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ صاحبِ کرامات تھے۔ اکثر ہندو آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔"

سیّد امام الدین کو گجرات میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ ان کے پیروؤں کو مومنہ یا ست پنتھی کہتے ہیں۔ چونکہ ان میں ابھی بہت سی ہندوانہ رسمیں موجود ہیں اس لیے اس ملک کے مشائخ اس طرف کم متوجہ ہیں ان کے عرسوں میں کم جاتے ہیں۔ جماعت کا نظام سیّد امام الدین کے ایک جانشین کے ہاتھ میں ہے جسے "کاکا" کہتے ہیں۔ اور جو تجرّد کی زندگی بسر کرتا ہے۔ عرصے سے "کاکا" کوئی ہندو

ہوتا ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ "گا کا باطن میں مسلمان" ہے۔ اس طریقے کے جو لوگ بظاہر ہندو رہتے ہیں، انھیں "گپتی" (یعنی پوشیدہ) کہتے ہیں۔ اور جو ظاہر طور پر بھی مسلمان ہوتے ہیں۔ انھیں مومنہ کا لقب دیا جاتا ہے۔

سید امام الدین کی قبر احمد آباد کے قریب پیرانہ میں ہے۔

سید امام الدین فی الحقیقت پیر سید کبیر الدین حسن کے بیٹے تھے بمبئی گزیٹر میں لکھا ہے کہ سندھی خوجوں نے ان کی مخالفت کی۔ اور سندھ سے برگشتہ ہو کر انھوں نے گجرات کا رُخ کیا۔ جہاں سلطان محمود بیگڑہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کا طریق کار عام اسمٰعیلی طریقے سے مختلف تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے امام وقت کے لیے دسوندھ (یعنی پیروؤں کی آمدنی کا دسواں حصہ) لینے کی مذمت کی۔ اس لیے امام وقت آغا عبد السلام ابن آغا اسلام شاہ نے انھیں جماعت سے خارج کر دیا۔ آغا عبد السلام نے شاید اس خیال سے کہ پیروں کی تعیناتی سے انھیں نئے نئے طریقے شروع کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نیا پیر یا نائب نامزد نہ کیا۔ لیکن اپنے ہندوستانی مریدوں کی ہدایت کے لیے پندیاتِ جوانمردی ایک کتاب تصنیف کی، جسے خوجوں میں ایک پیر کا درجہ دیا جاتا ہے۔

امام الدین کی وفات ۱۵۱۲ء میں ہوئی۔

جدید تغیرات

اسمٰعیلی جماعت کے ان بزرگوں کا جنھوں نے خطۂ پاک و ہند میں نزاری عقائد پھیلائے۔ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن ان مقامی باشندوں کے علاوہ جنھوں نے یہ عقائد اختیار کیے۔ موجودہ خوجہ جماعت میں وہ ایرانی نسل کے اسمٰعیلی بھی شامل ہیں جو کسی وجہ سے ایران چھوڑ کر ہندوستان آئے۔ اور صوبہ سندھ یا مغربی ہندوستان میں اقامت پذیر ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں خود آغا خاں اول یعنی اُس وقت کے امام حاضر، بادشاہِ ایران سے کشمکش کے بعد ہندوستان میں آگئے۔ اور جماعت کا مرکز پہلے کلکتہ اور پھر بمبئی میں منتقل ہو گیا۔

اسلامی حکومت کے دوران میں تو نزاری عام مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے

ہوئے تھے۔ ان کی تجہیز و تکفین اور بیاہ شادی کی رسمیں سُنّی علما ادا کرتے (اگرچہ وہ اپنے دیوانی جھگڑے اپنی پنچایت سے طے کراتے) مغربی پنجاب میں کئی اسمٰعیلی سُنّی پیروں کے مُرید تھے بلکہ پیر صدرالدین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سُنّی مسلمان تھے۔ لیکن جب انیسویں صدی کے وسط میں آغا خاں ہندوستان میں آگئے تو جماعت کو زیادہ منظّم اور جُداگانہ طریقے پر ترتیب دیا گیا۔ ایک تو وہ لوگ جو خوجوں سے باہر ہیں۔ (مثلاً پنجاب کے شمسی اور گجرات کے ست پنتھی) انھیں بھی آغا خاں کی قیادت میں مُنسلک کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور ہو رہی ہے۔ اور دوسرے آغا خان اوّل نے حکم دیا کہ ان کے پیرو بیاہ شادی تجہیز و تکفین اور وضو طہارت میں اپنی جماعت کے لوگوں کی پیروی کریں۔ بعض لوگوں نے اس حکم کی مخالفت کی۔ بلکہ بمبئی ہائی کورٹ میں اس مسئلے پر ۱۸۶۴ء میں ایک اہم مقدمہ لڑا گیا۔ جس میں ان لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ پیر صدرالدین سُنّی تھے۔ اور شروع سے ان کے پیرو بیاہ شادی وغیرہ میں سُنّی علما کو بلاتے رہے ہیں۔ آغا خاں اوّل کی طرف سے کہا گیا کہ یہ سب باتیں تقیہ میں داخل تھیں۔ اور پیر صدرالدین کو اسمٰعیلی امامِ وقت شاہ اسلام شاہ نے اس لیے داعی بنا کر بھیجا تھا کہ وہ لوگوں میں اسمٰعیلی عقائد پھیلائیں۔ عدالت نے آغا خاں اوّل کا یہ دعویٰ قبول کر لیا۔ جس پر بعض خوجے ان سے علیٰحدہ اور علانیہ طور پر سُنّی ہو گئے۔

اسی طرح سندھی خوجوں میں اثنا عشری اور اسمٰعیلی رسوم پر اختلاف ہے۔ وہاں بعض خوجے تعزیے نکالتے ہیں، جس کی آغا خاں اوّل نے مخالفت کی۔ اس پر ان کا ایک حصّہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ موجودہ زمانے میں ہز ہائی نس آغا خاں کی بعض نوجوانوں نے اس لیے مخالفت کی کہ وہ اپنے پیرووں سے آمدنی کا دس فیصدی کیوں وصول کرتے ہیں۔ لیکن اگرچہ اس اختلاف کی بنا پر کچھ مخلص لوگ جماعت سے علیٰحدہ ہو گئے ہیں۔ جماعت پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔

ہندوستانی خوجوں کی صحیح تعداد پردۂ اخفا میں ہے اور ان میں کئی نیم مُسلم

جماعتیں شامل ہیں۔ لیکن ان کے دو بڑے مرکز ہیں۔ ایک شمالی پنجاب اور چترال اور دوسرا کچھ، کاٹھیاواڑ اور مغربی ہندوستان میں۔

خوجوں کی تعداد زیادہ نہیں، لیکن جماعت کی تنظیم بہت اچھی طرح ہوئی ہے۔ تجارت میں وہ پارسیوں اور گجراتیوں کے ہم پایہ ہیں۔ اور بوہروں کے مقابلے میں جنھوں نے اعلیٰ مغربی تعلیم سے بالعموم بے اعتنائی برتی ہے، انھوں نے بالعموم مغربی تعلیم اچھی طرح حاصل کی ہے۔ وضع قطع میں بھی وہ بوہروں اور عام مسلمانوں کی بہ نسبت مغرب کی زیادہ تقلید کرتے ہیں۔ عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان کے کئی خاندان ایرانی النسل ہیں۔ اور تعداد کے تناسب سے اس جماعت کا اثر بہت زیادہ ہے۔

بوہرے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے وقت ہندو پاکستان کے علاقوں میں بوہرہ جماعت ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ بوہروں کی روایت ہے کہ ان کے مذہب کی اشاعت پہلے پہل عبداللہ یمنی اور سیدی احمد نے کی جو مصر کے خلیفہ مستنصر کے ایما پر ۱۰۶۷ء میں کھنبائت آئے۔ اور جنھوں نے گجرات کے راجپوت راجا سدھ راج جے سنگھ اور اس کے وزیر کو مسلمان کیا۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ بوہروں کے پہلے مبلغ ملا علی (پیر پرداز یا پیر پرداں) تھے۔ جنھوں نے ۱۱۳۷ء میں وفات پائی۔ اور جن کا مزار کھنبائت میں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔

سرکاری رپورٹوں کے مطابق تمام بوہرے ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ لیکن بوہروں کو یمن سے خاص تعلق رہا ہے۔ کئی بوہرے وضع قطع اور خصائص و خصائل سے عربی النسل معلوم ہوتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ان میں سے ہندو نو مسلموں کے علاوہ بہت سے ان یمنی تاجروں کی اولاد ہوں جنھوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ مذہب کی۔ اور بعض کے آبا و اجداد سولھویں صدی میں یمن میں سلطان روم کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستان میں آگئے ہوں۔

سولھویں صدی کے آخر سے بوہروں کی دو جماعتیں ہو گئی ہیں۔ سلیمانی اور داؤدی۔ ان کا اختلاف بھی زیادہ تر شخصی ہے۔ داؤدی بوہرے، داؤد بن قطب شاہ اور سلیمانی، سلیمان ابن یوسف کی جانشینی کے قائل ہیں۔ داؤدی جماعت کے داعیٔ مطلق سورت کے ملاجی صاحب ہیں۔ اور سلیمانیوں کے مُرشد یمن میں ہیں۔ جہاں سے اکثر اسمٰعیلی مبلغ ہندوستان میں آتے رہے۔ لیکن ہندوستان میں سلیمانیوں کی تعداد داؤدیوں سے کم ہے۔

بوہرہ مبلغوں کی پُرامن تبلیغی کوششیں صدیوں تک جاری رہیں۔ اور تاجر اقوام کے کئی لوگوں[لہ] نے ان کے عقائد اختیار کر لیے۔ یہ لوگ کئی باتوں میں ہندوانہ طریقوں پر عامل ہیں۔ وراثت کے معاملے میں شرع کے پابند نہیں۔ سُود علانیہ لیتے اور دیتے ہیں۔ دیوالی کے موقعے پر ہندوؤں کی طرح اپنے حساب کی کتابیں بدلتے ہیں۔ اس کے باوجود کئی باتوں میں وہ عام مسلمانوں سے زیادہ پابندِ شرع ہیں۔ ان کا لباس عام لوگوں سے جُدا ہوتا ہے۔ اکثر راسخ العقیدہ بوہرے ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ کی مٹھائی نہیں کھاتے۔ نہ ہندو دھوبیوں سے کپڑے دُھلاتے ہیں۔ اور اگر دُھلاتے ہیں تو انھیں پھر پاک کر لیتے ہیں۔ عموماً نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں۔ مسکرات بلکہ تمباکو سے مجتنب رہتے ہیں۔ زکوٰۃ باقاعدہ دیتے ہیں۔

کئی بوہرے شاہانِ احمد آباد کے زمانے میں سُنّی ہو گئے تھے۔ وہ اکثر زراعت پیشہ ہیں۔ شیعہ بوہرے زیادہ تر تجارت کرتے ہیں۔ ان میں داؤدی

لہ لفظ بوہرہ کو گجرات کی تاریخ راس مالا میں لفظ بیوہار (بمعنی بیوپار) سے مشتق سمجھا گیا ہے۔ لیکن سید ابو ظفر ندوی نے ایک انگریزی مضمون (مندرجہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۵ء) میں کئی اور معانی دیے ہیں۔ مشہور عربی لغت قاموس میں یمن اور مدینے کے ایک قبیلے کو بھی بہرا کہا گیا ہے۔ اور بوہروں کے اکثر خاندان عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

بوہروں کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا ایک خاص نظام ہے۔ جماعت کے سرگروہ جنھیں داعی مطلق کہتے ہیں، سورت کے مُلاجی صاحب ہیں۔ انھیں جماعت کے متعلق کل اختیارات حاصل ہیں۔ یہ لوگ عام مسلمانوں کی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھتے۔ ان کے عبادت خانے علٰحدہ ہوتے ہیں۔ قبرستان بھی جُدا ہیں۔ عیدین اور دوسرے تہوار بھی عام مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ جمع صلوٰۃ کے قائل ہیں اور عام طور پر فقط تین وقت نماز پڑھتے ہیں یعنی صبح، ظہر اور شام کے وقت۔ اور جُمعہ کی نماز باجماعت نہیں پڑھتے۔ وہ عموماً گجراتی زبان بولتے ہیں۔ موجودہ "ملاجی صاحب" عربی کے فاضل ہیں۔ حج کر چکے ہیں۔ اور خیرات کثرت سے دیتے ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنی جماعت کا جُدا نظام قائم رکھنے کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ اگر (ضلع سورت وغیرہ میں) کسی بوہرے سے پوچھا جائے کہ تمھارا مذہب کیا ہے تو عموماً یہ نہیں کہے گا کہ مسلمان ہوں بلکہ کہے گا کہ بوہرہ ہوں[1]

خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب فاطمی دعوات اسلام میں بوہروں سے دو شکائتیں کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ "مستعلیوں نے عرصہ دراز سے اشاعتِ اسلام کا کام بالکل ترک کر دیا ہے۔ اور متقدمین و اعیانِ اسلام نے جس قدر ہندوؤں کو مسلمان بنا کر بوہرہ جماعت تیار کی تھی۔ ان میں اب کچھ اضافہ نہیں ہوتا" اور دوسرے "موجودہ داعی صاحب تعلیم گاہیں جبراً بند کرتے جاتے ہیں۔ اور بوہرہ قوم کو جاہل رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسلامی احکام کے بموجب بوہروں کو دینی و دُنیاوی امور میں آزادانہ ترقی سے روکتے ہیں۔" خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات بہت کڑے ہیں۔ اور شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ آج کل بوہرہ جماعت کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا تو خواجہ حسن نظامی کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ "بوہرہ جماعت نماز، روزے، حج زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلام کی پابندی میں تمام مسلمان

---

[1] (۱۹۳۹ء میں لکھا گیا)

فرقوں سے زیادہ مستعد نظر آتی ہے۔ ان کی صورت، ان کا لباس، ان کی بود و باش سب سچے اور پاک مسلمانوں کی طرح ہے۔"

دکن میں اشاعتِ اسلام

دکن کے ساحلی مقامات پر عرب تاجر اور مبلغ ظہورِ اسلام سے فوراً بعد ہی پہنچ گئے تھے۔ اور ہم بابِ اوّل میں گجرات مالابار اور معبر کی ان بستیوں کا ذکر کر چکے ہیں، جن میں عربوں نے اثر و اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ بحری تجارت بڑی حد تک ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور ان کی کوششوں کا میدان بیشتر ساحلی بندرگاہوں تک محدود تھا۔ لیکن قرینِ قیاس ہے کہ ان میں سے بعض اندرونِ ملک میں جاتے اور اپنے ساتھ مذہبِ حقہ کی روشنی لاتے ہوں گے۔ افسوس ہے کہ مورخین بلکہ سیاحوں کا قلم بھی ان کوششوں کے ذکر سے خاموش ہے۔ اور فقط آثارِ قدیمہ یا مقامی روایات کی بنا پر ان کوششوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی ایک کتاب میں کولم (جنوبی ہند) کے ایک قدیمی "میت خانہ" کا ذکر کیا ہے، جس میں بعض پرانی قبروں کے کتبے برقرار ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ ۱۶۶ھ کا ہے[1]، جو اگر صحیح ہے تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑے بہت مسلمان اس زمانے میں بھی دکن کے اندرونی شہروں میں موجود تھے۔ اس طرح کے آثار اور بھی کئی جگہ ہوں گے، جنھیں حوادث کی دست بُرد نے صفحۂ زمانہ سے محو کر دیا یا جو اب گوشۂ تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت تک چھپے رہیں گے، جب تک مقامی تعلیم یافتہ مسلمان اپنی قدیم

---

[1] اس قبرستان کی ایک قبر کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت ابو تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے، جو رسولِ اکرم کے صحابی تھے۔ لیکن روایت بہت مستبعد ہے۔

تدریج میں دلچسپی لے کر ان کے حالات سے پردہ نہ اُٹھائیں گے۔

طبلِ عالم سیّد نطھر ولیؒ اور ان کے خلفائے کبار

جنوبی ہند[1] جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان کے بالکل جنوبی علاقے میں آئے اور اندرونِ ملک میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بن گئے۔

ان میں سے ترچناپلی کے سیّد سلطان نطھر ولی[2] جو ۱۲۲۵ء میں یعنی حضرت خواجہ اجمیریؒ کی رحلت سے گیارہ سال پہلے وفات پا گئے خاص طور پر مشہور رہیں۔ آپ کے جدِّ امجد ممالکِ روم کے امراء حکام میں سے تھے، لیکن آپ کے دل میں محبتِ الٰہی کا جوش موجزن ہوا اور آپ نے فیصلہ کیا کہ اپنی تمام عمر یادِ الٰہی اور اشاعتِ اسلام میں صرف کروں گا۔ پہلے آپ نے ایران کے شہر ہرمز میں سیّد علی بادشاہ جو لق خلیفہ بابا ابراہیم کی بیعت کی اور ایک مدت تک مرشد کی خدمت کے بعد اپنے رفقا اور مریدین کے ہمراہ جن کی تعداد نو سو بتائی جاتی ہے۔ سعادتِ حج سے شرفیاب ہوئے اسی دوران میں آپ کو اشارہ ہوا کہ آپ دکن جا کر اسلام کو وہاں جاری کرو۔ چنانچہ آپ مریدین کے ہمراہ تلکھاٹ میں تشریف لائے۔ اور وہاں اشاعتِ اسلام شروع کی۔ اس وقت یہاں کا حاکم ورسا سرادیو نامی ایک ہندو تھا۔ مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے تو آپ کی اس کے ساتھ کوئی چپقلش نہ ہوئی، لیکن وہ ایک بڑھیا کے بیٹے کو کسی بات پر قتل کرنا چاہتا تھا۔ بڑھیا فریاد کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی۔ آپ نے اس کے بیٹے کو پناہ دی۔ اس پر راجا کی آپ کے ساتھ جنگ ہوئی۔ اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کے رفیق غالب آئے۔ اس کے

---

[1] یہ حالات زیادہ تر سرکاری گزیٹیر ز۔ تذکرۂ اولیائے دکن۔ آرنلڈ کی کتاب اور متفرق رسائل و مضامین سے ماخوذ ہیں۔ [2] ترچناپلی میں آپ کو نطھر ولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن بعض تذکروں میں آپ کا نام منظھر ولی یا خواجہ منظھر الدین لکھا ہے۔

بعد ترچناپلی تشریف لے گئے۔ اور وہیں ۶۲۲ھ یعنی ۱۲۲۵ء میں وفات پائی۔ سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ اضلاع مدورا اور ترچناپلی کے کئی مسلمان جنھیں (Rawattams) کہتے ہیں۔ آپ کی بدولت مسلمان ہوئے۔ آپ کا مزار ترچناپلی کی ایک مشہور زیارت گاہ ہے اور زائرین میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے لوگ ہوتے ہیں۔ بلکہ ہندو زائرین کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ایک زمانے میں مسلمانوں نے آپ کے نام پر ترچناپلی کا نام نطہر نگر رکھ دیا تھا۔ آپ کے مزار کے لیے ایک ہندو رانی مینا کشی اور ارکاٹ کے نواب محمد علی نے جاگیریں وقف کیں۔ آپ کے مزار کے احاطے میں نواب محمد علی اور اس کا مخالف چندا صاحب دفن ہیں۔ آپ کے مزار کا گنبد چندا صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔

آپ کے جانشین سید ابراہیم شہید تھے۔ وہ ۱۱۶۲ء کے قریب مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور پھر ہندوستان تشریف لائے۔ یہاں آپ کی پانڈیا حکمرانوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ پہلے آپ کو کامیابی ہوئی اور آپ بارہ سال برسرِ اقتدار رہے۔ لیکن بالآخر مقامی راجا غالب آیا۔ اور آپ میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔

سید نطہر ولی کے ایک اور مرید بابا فخرالدین (قادری) ثم سہروردی تھے۔ آپ کے والد علاقہ سلیستان میں حکمران تھے۔ لیکن آپ نے ترکِ دُنیا کر کے سیر و سیاحت اختیار کی۔ آپ کو عالمِ رویا میں اشارہ ہُوا کہ آپ کے مرشد بابا نطہر ولی طبل عالم ترچناپلی میں ہیں۔ وہاں جا کر ان سے بعیت کرو۔ چنانچہ آپ نے اس طرف کا رُخ کیا۔ راستے میں آپ کی بابا فرید گنج شکر سے مُلاقات ہوئی۔ اور ان کے نام پر آپ کے بھتیجے کا نام (آپ کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی) شاہ فرید رکھا گیا۔ حضرت سید نطہر ولی نے کشفِ باطنی سے آپ کی تشریف آوری کا پتا کر کے اپنی صاحبزادی کو سو قلندروں کے ساتھ پیشوائی کے لیے بھیجا۔ بالآخر آپ حضرت سید نطہر کے مُرید ہوئے اور ایک

---

[۱] (ملاحظہ ہو آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام ص ۲۶۷) شاید راوتھر ہوگا۔ یعنی گھوڑے سوار۔

عالم کو فیض یاب کرنے کے بعد ضلع اننت پور (مدراس) شہر پنوکونڈا میں ۱۲۹۴ھ میں وفات پائی۔ سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک مندر کے ہندو پجاری پر فتح پائی اور دودیکالا (نداف) قوم کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ آپ کی بدولت مسلمان ہوئے تھے۔ آپ کا مزار سلطان ٹیپو نے تعمیر کرایا۔ اور اس کے خرچ کے لیے بارہ ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر ہوئی۔ اب بھی وہ جاگیر بحال ہے۔ اگرچہ آمدنی کسی قدر کم ہو گئی ہے۔

جنوبی ہند (البعید) کے ایک اور بزرگ جو سید نطہر ولیؒ کے بہت بعد پیدا ہوئے، لیکن ان کے معتقدین میں سے شمار ہو سکتے ہیں۔ (ناگور) ضلع تنجور علاقہ مدراس کے حضرت سید عبد القادر ولی ناگوری تھے، جو شمالی ہند کے شہر مانک پور میں پیدا ہوئے اور حج کے بعد مالدیپ، لنکا کے راستے جنوبی ہند میں آئے۔ ترچنا پلی میں حضرت طبل عالم سید نطہر ولی کے مزار کی زیارت کی۔ اور علاقہ تنجور میں ارشاد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ ترام میں ایک مسجد تعمیر کی اور پھر ناگور میں، جو ایک بڑی تجارتی منڈی ہے، مقیم ہو گئے۔ آپ کے آنے سے اسلام کو بڑی رونق ہوئی۔ اور قریب کے گاؤں دھناسری میں بھی آپ نے حاکم اور رعایا کو مسلمان کیا۔ اب ناگور جنوبی ہند میں ایک اہم اسلامی بستی ہے، جو گزیٹیر کی ترتیب کے وقت نیگاپٹن کی حدود میں شامل تھی اور مسلمان نیگاپٹن کی کل آبادی کا ایک چوتھائی تھے۔ حضرت قادر ولی کا انتقال ۱۵۷۰ء میں ہوا۔ تنجور کا راجا آپ کے معتقدین میں سے تھا۔ چنانچہ اس نے مزار کے مینار تعمیر کرائے۔ آپ کے مزار پر ہندو مرد اور عورتیں کثرت سے آتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔

اسی علاقے کے ایک نامور بزرگ مکلم کوٹا کے حضرت خواجہ علاء الدین بن خواجہ شمس الدین الحسینی الچشتی البلخی تھے، جو ۱۵۵۵ء میں فوت ہوئے۔ تنجور کا راجا ان کا بھی معتقد تھا۔ اور اس نے مزار کا گنبد اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی۔

جنوبی ہند (بعید) سے سطحِ مُرتفع دکن کا رُخ کریں تو ریاست میسور میں ایک قابلِ ذکر ہستی حضرت حیات قلندر عرف بابا بدھن کا مزار ملتا ہے۔ انھوں نے میسور میں سب سے پہلے قہوے کی کاشت کی[1]۔ جس کے بیج وہ بیرونِ مُلک سے سفر کے دوران میں لائے تھے، جن پہاڑیوں میں آپ کا مزار ہے۔ انھیں آپ کے نام پر بابا بدھن کی پہاڑیاں کہتے ہیں۔

علاقہ دکن کے دوسرے قدیمی بزرگ

بندھیاچل سے جنوب کے علاقے کو ہم نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک جنوبی ہند (بعید) یعنی وہ علاقہ جو ریاست حیدرآباد کے جنوب میں واقع ہے۔ اور جہاں مسلمانوں کی حکومت دیر تک یا مستحکم حالت میں کبھی بھی نہیں رہی۔ اور جہاں کے بزرگوں کے متعلق شمالی ہندوستان میں بالکل لاعلمی ہے۔ اس علاقے کے مشہور بزرگوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دُوسرا حصّہ اس علاقے کے شمال اور بندھیاچل کے جنوب میں دکن کا علاقہ ہے، جہاں مختلف مسلمان خاندان حکمران رہے۔ اس علاقے میں کئی بزرگ شمال سے یا ساحلی بندرگاہوں کے راستے اندرونِ مُلک میں آئے۔ اور اشاعتِ اسلام میں مشغول ہوئے۔ ان میں بیجاپور کے بزرگ پیر معبری کھندایت خاص طور پر یاد کے مستحق ہیں۔ آپ عرب تھے۔ اور چونکہ معبر (یعنی علاقہ کارومنڈل) سے تشریف لائے تھے۔ اس لیے پیر معبری کہلاتے تھے۔ آپ ۱۳۰۴ء میں دکن پہنچے۔ اور بیجاپور میں اشاعتِ اسلام شروع کی۔ بیجاپور کے کاشتکاروں میں آج بھی کئی مسلمان ایسے ہیں جن کا بیان ہے کہ ہمارے آبا جین تھے اور پیر معبری کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ (آرنلڈ)

اس زمانے میں شمالی ہند میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ دکن میں پہلی مرتبہ فوج کشی علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں کی۔ لیکن مشائخ و بزرگ اس سے

---

[1] Islam in India by Herklots (2nd ed) P.140

پہلے ہی ہندو شہروں میں جا نکلتے تھے۔ اور کہیں جگہ ان کی مخالفت ہوتی تھی۔ ان بزرگوں میں سے ایک کا نام حاجی رومی بیجاپوری تھا جو رومی الاصل تھے۔ اور بیجاپور میں اس زمانے میں وارد ہوئے، جب یہاں ہندو حکومت تھی۔ بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کی تاریخ وفات آفتابِ اولیا سے نکلتی ہے جس کے مطابق آپ نے ۳۲ھ میں رحلت کی ہوگی لیکن چونکہ دوسرے تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق آپ اور شیخ صلاح الدین المتوفی ۵۹۰ھ کے درمیان مراسم دوستانہ تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ آپ کا زمانہ بہت بعد کا ہو۔

شیخ صوفی سرمست اسدالاولیا قدس سرہ بھی اسی زمانے میں عرب سے دکن آئے اور مقام سکر شاہ پور علاقہ حیدرآباد میں فروکش ہوئے۔ وہاں کے راجے نے حکم دیا کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کھانے پینے کی چیزیں کوئی نہ دے۔ اس پر آپ کو اس سے جنگ کرنی پڑی۔ بالآخر راجا مغلوب ہوا اور آپ کے صاحبزادہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد اہلِ شہر نے صلح کر لی اور آپ امن و امان سے ان کے درمیان رہنے لگے۔ آخر ۱۶ ماہ صفر ۶۸۰ھ کو آپ نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور سکر شاہ پور میں دفن ہوئے۔ آپ کے ایک مرید شیخ شہید تھے، جنھیں آپ نے چار ساتھیوں کے ساتھ تلی کوٹ علاقہ بیجاپور میں (جہاں چند صدیاں بعد وجے نگر کی فوج کو شکست فاش ہوئی تھی) اشاعتِ اسلام کے لیے بھیجا۔ لیکن ہندوؤں نے ان بزرگوں کی مخالفت کی۔ اور لڑائی کی نوبت پہنچی جس میں پانچوں بزرگ شہید ہوئے۔ یہ واقعہ ۶۷۱ھ کا ہے۔

دکن کے ایک اور قدیم بزرگ بابا شرف الدین عراقی قدس سرہ تھے، جو عراق عرب سے شمالی ہندوستان اور وہاں سے دکن تشریف لائے۔ یہاں آکر آپ نے ایک پہاڑی پر، جو موجودہ شہر حیدرآباد سے چار میل مغرب کی جانب ہے، قیام کیا اور عبادتِ الٰہی میں مشغول اور مریدین کی ہدایت و تلقین میں مصروف ہوئے۔ آپ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ بتائے جاتے ہیں۔ جب آپ دکن

میں تشریف لائے تو اہلِ دکن میں مسلمانوں سے خاص بغض و عناد تھا۔ مہاراشٹر اور دکن کے ہندو شمالی ہند اور ساحلی لوگوں کی نسبت زیادہ متعصب تھے۔ اور بقول شیخ قطب الدین (منقولہ در تذکرہ اولیائے دکن) مسلمانوں کی صورت دیکھنا مکروہ سمجھتے تھے بلکہ اگر کوئی مسلمان مسافر وارد ہوتا تو اس کے ہاتھ کھانے پینے کا سامان بھی فروخت نہ کرتے۔ لیکن بابا صاحب کے حسنِ سلوک اور روحانیت سے یہ لوگ بھی متاثر ہوئے اور آپ کا بڑا ادب کرنے لگے۔ آپ کی وفات ۶۸۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے ساتھ آپ کے بھائی بابا شہاب الدین بھی تشریف لائے۔ وہ بھی ایک صاحب سطوت بزرگ گزرے ہیں اور ان کا باقاعدہ عُرس ہوتا ہے۔ ان کی رحلت آپ کی وفات سے چار سال بعد ہوئی۔

شیخ منتخب الدینؒ دکن کے جن بزرگوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ شمالی ہندوستان کے کسی مشہور سلسلے سے منسلک نہ تھے۔ رائج الوقت سلسلوں کے پہلے بزرگ جنھوں نے شمال اور جنوب کے درمیان ربط قائم کیا۔ شیخ منتخب الدین زر زری زر بخش چشتی قدس سرہٗ تھے۔ وہ ہانسی کے رہنے والے اور شیخ جمال الدین ہانسوی کے خواہرزادہ تھے۔ شیخ کبیر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے مرید تھے۔ بابا صاحب نے ایک غیبی اشارہ کے ماتحت انھیں دیوگیر (دولت آباد) کی طرف اس وقت بھیجا جب یہاں ہنود کا غلبہ تھا۔ ابتدا میں ان کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن وہ ہمت اور استقلال سے اپنے کام میں مشغول رہے۔ اور بالآخر یہیں ۷۰۹ھ میں وفات پاگئے۔ بقول خزینۃ الاصفیا۔ معارج الولایت کا بیان ہے کہ آپ کی وفات ۶۹۵ھ میں ہوئی۔ اور اس کتاب میں مصنف نے ذیل کے ابیات آپ کی مدح میں لکھے ہیں ؎

منتخب شیخ زر زری زر بخش	گو شفیقِ کلاں بود بشمار
از مریدانِ خواجہ گنج شکر	کرد اوّل بہ دیوگیر قرار
خلعتِ زر ز غیب مے آمد	در صباح در رواح و لیل و نہار

شُد ازاں نام زر زری زربخش | مے نمودش براہِ خیر شعار
رخت زیں تنگنائے چوں بربست | بجز امید سُوئے دار قرار
خواجہ بُرہاں سُوئے دکن آمد | زندہ زوگشت سُنّت و آثار

"پالکی" کی آمد

مشہور ہے کہ جب شیخ منتخب الدین وفات پاگئے تو حضرت سلطان المشائخ نے ان کے بھائی اور اپنے خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ کو ان کی جگہ دولت آباد بھیجا۔ لیکن یہ مشہور روایت غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ تذکروں میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نے اپنی وفات کے وقت شیخ بُرہان الدینؒ کو "دستارِ خاص اور پیراہن اور مصلےٰ اور شالِ خلافت" دے کر دکن کی طرف رخصت کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کے وصال کے وقت جو ۷۲۵ھ میں ہُوا، شیخ برہان الدین دہلی میں تھے۔ ہاں اتنا صحیح ہے کہ شیخ منتخب الدین کی وفات کے کچھ عرصہ بعد شیخ برہان الدین بھی دیوگیر (دولت آباد) تشریف لائے۔ اور اب دونوں بھائیوں کے مزار خلد آباد کی مشہور زیارت گاہ میں ہیں، جہاں ان کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیرؒ، نظام الملک آصف جاہ، امیر حسن دہلوی، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے مزارات ہیں۔ شیخ بُرہان الدین کو دکن میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ برہان پور کا مشہور شہر ایک عقیدت مند بادشاہ نے ان ہی کے نام کی رعایت سے آباد کیا تھا۔ آپ کی وفات ۱۳۳۷ء میں ہوئی۔ سفینۃ الاولیا میں آپ کی تبلیغی کوششوں کے متعلق لکھا ہے :۔

"از مریدانِ سلطان المشائخ اند۔ و حضرت شیخ ایشاں را بہ طرف برہان پور و دولت آباد بجہت رواج اسلام و ارشاد ساکنانِ آنجہ دو فرستاند و شیخ حسن دہلی را با بعضے از مریدانِ خود با ایشاں ہمراہ کردند و از برکتِ قدومِ ایشاں اکثرے ازاں جماعہ بشرفِ اسلام مشرف گشتہ، و مرید و معتقد گشتند۔"

دکن کے مذہبی حلقوں میں شمالی ہندوستان سے "پالکی" آنے کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک زمانے میں یہاں دہلی سے سات سو یا بقولِ بعض

چودہ سو بزرگانِ دین تشریف لائے تھے۔ جن میں سے بعض پالکی نشین تھے۔ تذکرۂ اولیائے دکن میں شیخ برہان الدین کے حالات میں لکھا ہے کہ سیر الاولیا اور روضۃ الاولیا کے مؤلف نے مورخین متاخرین سے نقل کیا ہے کہ سلطان المشائخ نے شیخ برہان الدین صاحب ترجمہ کو مع سات سو مریدین جن میں بعض پالکی نشین تھے 'اہلِ دکن کی ہدایت کے لیے روانہ کیا۔ اور بعض لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے اوّل شاہ منتخب الدین برادر صاحب ترجمہ کو مع سات سو مرید خلائق دکن کی راہنمائی کے لیے بھیجا۔ قولِ ثانی صحیح ہے "۔ تذکرہ اولیاے دکن نے اپنی راے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ نظامی سلسلے کے بزرگوں کی ایک کثیر جماعت اس زمانے میں شمالی ہند سے دکن آئی 'لیکن وہ شاہ منتخب الدین کے ساتھ نہ تھے۔ بلکہ بعد میں آئے۔ اور شاید سلطان المشائخ کی وفات کے بعد بھی آئے ہوں۔ دکن کے مختلف شہروں میں کئی ایسے بزرگوں کے مزار موجود ہیں۔ جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ پالکی کے ساتھ آئے تھے۔ اور چونکہ ان کی وفات قریباً ایک زمانے میں ہوئی۔ اس لیے یہ خیال چنداں مستبعد معلوم نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک شاہ بدر الدین چشتیؒ ہیں، جو ۷۱۴ھ میں قلعہ پرینڈہ (علاقہ کونکن) کے قریب شہید ہوئے۔ دوسرے بزرگ شاہ خرم قتالؒ تھے جنھیں خاندیش کا علاقہ سپرد تھا۔ اور جنھوں نے ۷۴۳ھ کے قریب ارنڈول (علاقہ خاندیش میں وفات پائی۔ تیسرے بزرگ شاہ والیؒ (المشہور بہ شاہ واری) تھے۔ جو شاہ خرم کے رفقا میں سے تھے۔ اور قصبہ کوٹھل ضلع خاندیش (صوبہ بمبئی) میں دفن ہیں۔ آپ کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی۔ چوتھے بزرگ پونا کے شیخ صلاح الدین المعروف بہ شیخ صلان چشتی تھے۔ جنھوں نے ۷۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی بزرگ ہیں، جو اسی زمانے میں شمالی ہند سے دکن تشریف لائے۔ چونکہ ان کی اور شاہ منتخب الدین کی تاریخِ وفات میں چالیس پچاس برس کا فرق

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرۂ اولیاے دکن۔ جلد اوّل و دوم میں ان بزرگوں کے حالات۔

ہے اس لیے انھیں شاہ صاحب کا معاصر یا رفیق قرار دینا مشکل ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس جماعت کا دکن آنے اور مختلف شہروں میں بس جانے کا کسی حد تک سلطان محمد تغلق کی پالیسی سے تعلق ہو، جو حضرات صوفیہ کے اثر و اقتدار اور ان کی جماعت بندی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور انھیں دہلی سے منتشر کرنا چاہتا تھا۔ اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سے اس زمانے میں جنوب میں آئے ہوں، جب محمد بن تغلق نے دہلی چھوڑ کر دولت آباد کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔

بزرگانِ بیجاپور ہم بیجاپور کے حضرت حاجی رومی بیجاپوری اور پیر معبری کھندائت کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن یہ شہر شروع سے ہی مشائخ اسلام کا مرکز رہا ہے۔ ان دو بزرگوں کے علاوہ پیر جمنا بیجاپوری کا نام لیا جاتا ہے، جو دکنی الاصل تھے اور بیجاپور اس زمانے میں آئے جب یہاں ہنود کی حکومت تھی۔ آپ سماع کے قائل تھے۔ اور مجلس سماع منعقد فرماتے تھے۔ آپ کی وفات سنہ ٧٠٣ھ میں ہوئی۔ ان کے علاوہ سیّد علی شہید کا نام لائق ذکر ہے۔ جن کی تاریخ شہادت کا اندازہ تذکرہ اولیائے دکن کے مصنف نے سنہ ٧٠٥ھ کیا ہے۔ آپ کا یہاں کے اہلِ اصنام سے معرکہ ہوا۔ اور اس میں آپ شہید ہوئے۔

دنیائے علم و فضل میں بیجاپور کے جس بزرگ نے سب سے بڑھ کر نام پایا، شیخ عین الدین گنج العلوم بیجاپوری تھے۔ آپ سنہ ٧٠٦ھ میں دہلی کے قریب قصبہ نوجہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر گجرات میں پھرتے پھراتے دولت آباد آئے اور یہاں اخذِ علوم کا سلسلہ جاری رکھا۔ سنہ ٧٣٠ھ میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر عین آباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت میں کئی سال صرف کیے۔ سنہ ٧٧٣ھ میں آپ بیجاپور آئے اور طلبہ کو مستفید کرنا شروع کیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو تیس بتائی جاتی ہے۔ جن میں سے طور الابرار، ملحقات طبقاتِ ناصری اور رسالہ الانساب خاص طور پر مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں آپ کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ بادشاہِ دکن سلطان

علاء الدین حسن گنگوہی بہمنی کے دربار میں آپ کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ حالاں کہ امرا و ارکانِ دولت کو بھی یہ رعایت میسر نہ تھی۔ جب آپ دربار میں جاتے تو بہمنی مسند سے اُٹھ کر چند قدم استقبال کے لیے آتا۔ آپ کی وفات ۷۹۵ھ میں ہوئی۔ وفات سے چند سال بعد بہمنیہ سلطنت کے مشہور وزیر خواجہ محمودؒ گاوان نے مزار پر گنبد بنوا دیا۔ جو اب تک موجود ہے۔

گلبرگہ شریف بیجاپور میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اسلامی حکومت کے زمانے میں یہاں فن تعمیر کو جو فروغ ہوا، اس نے اس شہر کی دوسری خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اب لوگ یہاں عالیشان عمارتیں دیکھنے جاتے ہیں۔ مذہبی آثار باقیہ کی طرف بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ مذہبی تقدس میں جس شہر نے عوام میں خاص شہرت حاصل کی ہے، گلبرگہ شریف ہے۔ بزرگانِ دین کی اس شہر کی طرف شروع ہی سے توجہ تھی۔ اور یہاں ایک قدیمی مزار سید حسام الدین تیغ برہنہ کا ہے۔ جن کا سالِ وفات ۶۸۰ھ ہے۔ مشہور ہے کہ آپ کے ہاتھ میں تیغ برہنہ رہتی تھی۔ اس لیے آپ تیغِ برہنہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ شیخ سراج الدین جنیدیؒ جن کا سلطان علاء الدین حسن گنگوہی بڑا معتقد تھا۔ دیر تک گلبرگہ قیام فرما رہے۔ آپ نے ۷۸۱ھ میں رحلت فرمائی۔

حضرت سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ

اب گلبرگہ کی شہرت زیادہ تر حضرت سیّد محمدؒ الحسینی الملقب بہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کی بدولت ہے، جو ۱۴۲۲ء میں یہاں دفن ہوئے۔ آپ ۱۳۲۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اور چار پانچ سال بعد اپنے والد مخدوم سید محمد یوسف المعروف شاہ راجو قتالؒ کے ساتھ جن کا مزار دولت آباد کے قریب خلد آباد میں

ہے۔ سلطان محمد تغلق کے حکم کے مطابق دہلی سے دولت آباد تشریف لائے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے والد ماجد سے حاصل کی۔ دس سال کے تھے کہ والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اپنے ماموں ملک الامرا سید ابراہیم کے پاس رہے۔ لیکن پھر کسی بات پر آپ کی والدہ اور ماموں میں رنجش پیدا ہوگئی اور آپ پندرہ برس کے تھے۔ جب آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو دہلی لے گئیں۔ یہاں آپ نے مشہور اساتذہ سے کسب علم کیا۔ علومِ ظاہری کی تکمیل آپ نے قاضی عبدالمقتدر تھانیسری جیسے فاضل سے کی۔ اور نہایت چھوٹی عمر میں حضرت چراغ دہلیؒ کی خدمت میں تعلیمِ باطنی کے لیے حاضر ہوئے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے بڑی ریاضت و مشقت کی اور صاحبِ نظر مرشد نے آپ کو بڑی محبت سے تعلیم دی۔ سیر محمدی میں لکھا ہے کہ جب آپ مرشد کی خدمت میں اپنے واقعات بیان کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلیؒ فرماتے کہ مجھے ستر برس کے بعد ایک لڑکے نے پھر سے شائق بنا دیا ہے اور واقعات سابق کو یاد دلایا ہے۔

حضرت چراغ دہلی قدس سرہ نے ۷۵۷ھ میں وفات پائی۔ اس سے تین روز پہلے حضرت گیسو دراز کو خلافت عطا کی[1]۔ آپ اس کے بعد دیر تک دہلی رہے۔ اور ۸۰۱ھ میں اسّی برس کی عمر میں حادثہ امیر تیمور کی بنا پر دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے اور گوالیار، بھاندیر، ایرچہ، چندیری، بڑودہ، کھنبایت ہوتے ہوئے اور گجرات میں کچھ عرصہ قیام کے بعد دولت آباد تشریف لائے۔ اس کے بعد گلبرگہ کا رُخ کیا جو اس وقت شاہانِ بہمنی کا دارالخلافہ تھا۔ بادشاہِ وقت نے بڑی عقیدت سے آپ کا خیر مقدم کیا اور آپ گلبرگہ میں ہی بس گئے۔ چند سالوں کے بعد ۱۴۲۲ء[2] میں اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف انتقال فرمایا۔

---

[1] یہ سیر محمدی کا بیان ہے سیر العارفین سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت چراغ دہلی نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا۔ [2] سیر محمدی

جوامع الکلم، جس میں نو مہینوں (یعنی ۱۵ مارچ ۱۴۰۰ء سے ۱۰ دسمبر ۱۴۰۰ء کے ملفوظات آپ کے بڑے صاحبزادے (سید حسین المعروف بہ سید محمد اکبر حسینی) نے جمع کیے تھے شائع ہوگئی ہے۔ اس میں فاضل مرتب (مولانا محمد صدیقی صاحب) کی تصحیح و تحشیہ کے باوجود غلط کتابت یا مسودوں کی دشواریوں سے بعض ایسی الجھنیں رہ گئی ہیں جن سے کئی اہم مقامات پر مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی کام کی کئی باتیں ہیں۔ ایک طویل اندراج سے اس دلچسپی کا پتا چلتا ہے، جو حضرت گیسو دراز کو اشاعتِ اسلام سے تھی اور ان دشواریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جن سے ہندوؤں کے مضبوط معاشرتی نظام کی وجہ سے مبلغینِ اسلام کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک ملفوظ میں ہندوؤں اور برہمنوں کی نسبت فرماتے ہیں:۔

کئی ایک مرتبہ ان کے علما اور درویش (یعنی پنڈت اور یوگی) میرے پاس دعوے اور بحث کے لیے آئے۔ طے یہ پایا کہ جو بحث میں کامیاب ہو۔ دوسرا اس کی بات مان لے اور اس کی متابعت کرے۔ چنانچہ اس بات پر قول و اقرار ہوگیا۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ اپنی بات شروع کریں۔ انھوں نے کہا نہیں تم کہو۔ میں نے ان کی سنسکرت کی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں اور ان کی روایات کو جانتا تھا چنانچہ میں نے ان سے شروع سے لے کر آخر تک باتیں کہیں اور انھوں نے ان سب باتوں کو دل و جان سے قبول کیا اور کہا کہ واقعی جو تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہے۔ پھر میں نے اپنے مذہب کا بیان شروع کیا اور دونوں کا موازنہ کرکے اپنے مذہب کو ترجیح دی۔ اس پر وہ حیران رہ گئے۔ شور و غوغا کرنے لگے۔ جس طرح بتوں کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہیں، اسی طرح میرے سامنے اظہارِ عقیدت کیا۔ میں نے کہا یہ سب بیکار ہے۔ تمھارے اور میرے درمیان معاہدہ یہ ہے کہ جس کی بات سچی ہو دوسرا اس کی پیروی کرے اور اس کے راستے پر چلے۔ لیکن کوئی کہنے لگا میری بیوی، بچے اور خاندان کے لوگ ہیں (ان کو کیسے چھوڑوں؟) کسی نے کہا کیا کروں جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ہمارے بزرگ اس راستے پر چلے تھے جو ان کے لیے

ٹھیک تھا۔ ہمارے لیے بھی ٹھیک ہے"۔ (ترجمہ از جوامع الکلم ص ۱۱۸-۱۱۹)

پھر ساماَنہ کے ایک ہندو کا تذکرہ کیا ہے جس کے ساتھ اسی طرح قول و قرار ہوا تھا کہ جو مباحثہ میں دوسرے کا قائل ہو جائے۔ وہ اس کا مذہب قبول کرے حضرت گیسو دراز نے اپنے روحانی تصرفات کے زور سے اسے قائل کر لیا' لیکن جب اس سے کہا گیا کہ اب معاہدے کی رُو سے تمھیں مسلمان ہو جانا چاہیے۔ تو وہ کہنے لگا کہ مَیں نے نئی نئی شادی کی ہے۔ سامانہ جاتا ہوں اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ لیکن وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا!

ہم آگے چل کر اس امر کی وضاحت کریں گے کہ خلجیوں کے زوال کے بعد صوفیوں کے طریقوں پر کڑی نکتہ چینی ہونے لگی۔ جوامع الکلم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور اس میں متعدد اندراجات ایسے ہیں جن میں علما و فقہا اور صوفیہ کی باہمی مخالفت کا ذکر ہے۔ کئی ملفوظات میں ایک شخص غلام الخلیل کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کا وزیر ہو گیا تھا اور جس نے پایۂ وزارت پر پہنچ کر صوفیہ کے خلاف دستِ تعدّی دراز کیا۔ "غلام الخلیل چندگاہے در حلقۂ صوفیاں در آمد۔ آخر از بے اعتقادی بیرون شدہ۔ تقرّب بہ بادشاہ جست تا آنکہ وزیر گشت۔ دستِ ایذا بر صوفیاں کشادہ۔ مے گوید مردمانے اند۔ خوش خورند و خوش خسپند و کفریات و سخنان بے دیناں بگویند"۔

ایک جگہ ملفوظات کے ناقل کہتے ہیں" ہم از ایں جا سخن در اختلافے کہ علما و فقہا با صوفیان کنند اُفتادہ"۔ ایک اور جگہ ایک خیاط اور بعض معلمین کی بحث کے ضمن میں حضرت گیسو دراز نے فرمایا:۔

"چنانکہ رسم دانشمنداں است کہ صوفیاں را گویند کہ اوّل بارے مسلمان شوید بعد ازاں صلاحیت پیش کنید۔ شما جاہلانید۔ دین ندارید۔ ملحدانید۔ ...[۵۰]

---

[۵۰] جوامع الکلم ص ۲۵۱

حضرت گیسو دراز کا جس طرح تصوف اور عرفان کی منزل میں اونچا درجہ ہے، اسی طرحِ علم و فضل اور تصنیف و تالیف کی تاریخ میں ان کا نام روشن ہے آپ سے پہلے بزرگانِ چشت میں بڑے عالم اور بزرگ ہوئے تھے۔ مثلاً حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات پڑھیں تو ان کی وسعتِ معلومات، کشادہ مشربی اور علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت چراغ دہلی تو علم اور اہل علم کے خاص طور پر قدر دان تھے، لیکن افسوس کہ ان بزرگوں نے تصنیف و تالیف کی منزل میں قدم نہ رکھا۔ اور اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی کا یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ جن ہستیوں نے ہماری ابتدائی مذہبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا (مثلاً حضرت خواجہ اجمیری رح، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رح، بابا فرید رح، حضرت سلطان المشائخ رح، حضرت مخدوم جہانیاں رح، حضرت چراغ دہلی رح) انھوں نے اپنے خیالات تفصیل اور وضاحت سے صفحۂ کاغذ پر ضبط نہ کیے۔ حضرت گیسو دراز کے زمانے میں یہ حجاب کسی قدر دور ہو رہا تھا۔ چنانچہ نور قطب عالم اور میر سید علی ہمدانی رح کے بعض رسالے ملتے ہیں۔ اور ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر حضرت مخدوم علی مہائمی کی تصانیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن شمالی ہندوستان کے مقبول سلسلوں (چشتیہ اور سہروردیہ) کے مشہور بزرگوں میں سب سے پہلے جس ہستی نے تصنیف و تالیف کی طرف پوری توجہ کی۔ وہ حضرت سید گیسو دراز[1] تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد آپ کی عمر کے سنین کے مطابق ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ سیر محمدی میں اکتیس [۳۱] کتابوں کے نام گنائے گئے۔ جو زیادہ تر تصوف میں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں ہوا

---

[1] آپ کو بھی اپنے اس امتیاز کا احساس تھا۔ اسماء الاسرار کے دیباچے میں لکھتے ہیں "ہر کس کہ دراں حضرت سلوک کرد بچیزے مخصوص شد۔ ما بہ سخن مخصوصیم۔ خدا ما را دولت بیان اسرار خویش داد"

آپ نے ایک تفسیر کلام مجید کی لکھی، سلوک کے رنگ میں۔ اور کشاف کے طرز پر ایک اور تفسیر شروع کی تھی، لیکن پانچ سیپاروں سے آگے نہ جا سکی۔ کشاف پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔ ان کے علاوہ شرح فصوص الحکم، معارف شرح عوارف، شرح فقہ اکبر (عربی و فارسی) رسالہ سیرۃ النبی، شرح آداب المریدین، اسماء الاسرار قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں۔

آپ شاعر بھی تھے۔ دیوان مولوی سیّد عطا حسین صاحب کی تصحیح کے بعد شائع ہو گیا ہے۔ زیادہ تر غزلیں ہیں جن میں عام عاشقانہ رنگ میں خیالات و جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ حتےٰ کہ مرشد (یعنی حضرت چراغ دہلیؒ) کی تعریف میں بھی یہی پیرایۂ بیان استعمال ہوا ہے۔ ایک قطعہ میں کتابوں کے یہ عاشق کسی کتاب کی خواہش کو بحسن و خوبی اس طرح ٹالتے ہیں ؎

معشوقۂ من کتابِ من شُد بستہ دلِ من بدو کشادہ است

گوئی کہ مرا بہ عاریت دہ معشوقہ بہ عاریت کہ دادہ است!!

آپ کے فارسی مکتوبات بھی مولوی سیّد عطا حسین نے شائع کیے ہیں۔[۱]

---

[۱] حضرت سیّد بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ کا جس طرح انتظام ہو رہا ہے وہ بعض امور میں دوسری بڑی درگاہوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ (۱) درگاہ سے ملحق ایک مدرسہ ہے جس میں مجاورین کی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے (۲) درسگاہ کی عمارت میں ایک کتب خانہ قائم ہوا ہے۔ جس میں نواب معشوق یار جنگ بہادر سابق ڈسٹرکٹ کلکٹر گلبرگہ کی علم دوستی اور فیاضی سے مذہب اور تصوّف کے متعلق کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے (۳) حضرت بندہ نواز کی تصانیف کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جاتا ہے۔ اور صحت اور عمدہ زیبی کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسماء الاسرار، مستطاب خاتمہ۔ ترجمہ آداب المریدین، خطائر القدس، یازدہ رسائل، انیس العشاق (دیوان) مکتوبات، کیٹی اشاعت تصانیف عالیہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔

سماع سے آپ کو بڑا شغف تھا۔ فرماتے ہیں:۔
"کارِ من بیشتر در تلاوت و سماع بود" موسیقی کی باریکیوں کو آپ خوب سمجھتے تھے۔
سیر محمدی میں آپ کی مجلس سماع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اکثر فارسی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ فرماتے۔ ہندی کی چیزیں نرم، لوچدار اور دل میں رقت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور اس کا راگ بھی نرم ہوتا ہے۔ اور طبیعت میں عاجزی اور مسکنت پیدا کرتا ہے۔ لیکن موسیقی کے فن اور موسیقار کے جذبات کا اظہار فارسی ہی میں بہتر طریقے پر ہوتا ہے۔ اور اس میں کچھ اور ہی لذت اور ذوق ملتا ہے"
سیر محمدی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی مجالس سماع کے متعلق لوگوں نے فیروز شاہ تغلق کے پاس شکایت کی کہ ان مجالس میں مریدین اپنا سر زمین پر رکھ دیتے ہیں اور بڑا شور مچاتے ہیں۔ بادشاہ نے یہ سن کر کہلا بھیجا کہ اپنی مجلس سماع خلوت میں کیا کریں۔ چنانچہ اب آپ اپنے حجرہ میں ہی یہ مجلس منعقد کراتے۔ بیچ میں پردہ ڈال دیتے۔ مریدین پردے کے باہر صف باندھ کر بیٹھتے۔ اور جب آپ پر وجد طاری ہوتا تو حجرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ (سیر محمدی فرح دوم ص ۴۹)
حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی زیادہ تصانیف فارسی میں ہیں۔ لیکن دکن میں آمد کے بعد آپ نے عوام کی تلقین کے لیے بعض رسالے دکنی زبان میں بھی لکھے۔ جن میں سے معراج العاشقین چھپ چکی ہے۔ اور قدیم اردو یا دکنی کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔
حضرت بندہ نواز کا مرتبہ ان کی علمی تصانیف سے ظاہر ہے، لیکن دکنی عوام میں آپ کی شہرت علمی کارناموں سے نہیں بلکہ خوارق عادات اور روحانی تصرفات کی بنا پر ہے اور اس میں اتنا غلو کیا جاتا ہے کہ عقل اور شریعت افسوس کرتی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے "شخصے از مردِ دکنی پرسید۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزرگتر است۔ یا سید محمد گیسو دراز۔ او جواب داد کہ حضرت محمد رسول اللہ اگرچہ پیغمبرِ خدا است۔ اما، سبحان اللہ مخدوم ما سید محمد گیسو دراز چیزے

دیگر است[۱]"

سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ حضرت سید گیسو دراز نے پونا اور بلگام کے کئی لوگوں کو مسلمان کیا۔ (آرنلڈ) ان کے علاوہ اور بھی کئی داعیانِ اسلام گزرے ہیں، جن کے نام اولیا کے تذکروں میں نہیں آئے۔ لیکن انھوں نے اشاعتِ اسلام کے ذریعے ٹھوس کام کیا۔ ان میں سے بمبئی کے مغربی ساحل پر علاقہ کوکن میں شیخ بابا عجیب نے مدتوں اشاعت اسلام کی۔ آپ کا مزار ضلع تھانہ کے پرفضا مقام قصبہ دھالو میں ہے۔ ضلع دھارواڑ کے کئی جولاہے ایسے ہیں جن کے بزرگوں نے سید ہاشم گجراتی کے زیر اثر اسلام قبول کیا۔ ضلع ناسک میں شاہ محمد صادق سرمست حسینیؒ اور خواجہ خمیر حسینیؒ کامیاب داعیانِ اسلام تھے۔ بلگام میں دو داعیانِ اسلام سید محمد بن سید علیؒ اور سید عمر عیدروسؒ کا نام اب تک ادب سے لیا جاتا ہے۔ ضلع ستارا کے جنوبی حصے میں اسلام پور مسلمانوں کا ایک بارونق قصبہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کو ایک نو مسلم پیر نے مسلمان کیا۔ جن کا ہندوانہ نام شمبوا باگوشی تھا اور جن کی درگاہ آج بڑی مقدس سمجھی جاتی ہے۔ (آرنلڈ)

صوفیاے کرام کی تبلیغی کوششوں کے علاوہ اسلام نے جنوبی ہند میں جو تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی وجہ اسلامی تعلیمات ہیں۔ دکن میں چھوت چھات اب بھی زوروں پر ہے۔ اور کئی اچھوت قومیں ایسی ہیں،

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۲۰۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مؤلف حضرت گیسو دراز کا عقیدت مند نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب کے آخر میں جہاں دوسرے اولیاے کرام کے حالات لکھے ہیں، وہاں حضرت گیسو دراز کے تذکرے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دکن کی ملکی تاریخ کے ضمن میں حضرت کا ذکر ہوا ہے لیکن اس میں چبھنے والی باتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً گلبرگہ میں سید گیسو دراز کی آمد کا ذکر کر کے لکھتا ہے "سلطان فیروز شاہ حکیم طبیعت بود۔ چوں سید محمد گیسو دراز را در علم ظاہری خصوصاً معقولات خالی دید، چنداں توجہ نہ نمود (تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۱۶)

جنھیں آج سے چند سال پہلے عام سڑکوں پر بھی، جن سے برہمن گزرتے ہوں، چلنے کی ممانعت تھی۔ آرنلڈ لکھتا ہے :۔

"یہ لوگ مسلمان ہو کر ذلت و خواری کی زندگی سے نجات پاتے ہیں۔ اور تہذیب اور تمدن کے بعد اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بلند پایہ حاصل کرتے ہیں۔"

جنوبی ہندوستان کے متعلق مسٹر وارن نے مشنری رسالہ مسلم ورلڈ میں ایک مضمون لکھا تھا اس میں وہ اسلام کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اسلام نے خود جنوبی ہندوستان کے ماحول پر کئی اثر ڈالے ہیں۔ اور بالعموم وہ اثرات نیک تھے۔ اسلام نے صنعت و حرفت کو ترقی دی ہے۔ کیونکہ مسلمان محنتی اور وسائل بہ عمل ہوتے ہیں۔ اسلام نے ذات پات کی قیود سے آزادی دی ہے۔ مسلمانوں کی غیر ذاتوں میں شادیاں کرنے سے اور اسلام رائج ہونے سے ذات پات کے بندھن ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ نو مسلموں کا بیشتر حصہ پسماندہ اور اوہام زدہ بُت پرست طبقوں سے آیا ہے۔ اور قبولِ اسلام سے ان لوگوں نے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر ترقی کی ہے۔ اسلام نے شادی کی عمر کو بڑھایا ہے۔ اور کئی دوسرے نیک اثرات ڈالے ہیں۔" (مسلم ورلڈ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

کشمیر

کشمیر[1] میں اسلام بڑی دیر سے یعنی چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں داخل ہوا[2]۔ سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا ۱۳۱۵ء میں کشمیر کے راجا سنگھ دیو[3] کے ملازم ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت سے بڑا اقتدار حاصل کر لیا۔ ان کے بیٹوں کو بھی راجا نے بڑے اختیارات دیے اور خود ان کو

---

[1] یہ حالات زیادہ تر ڈاکٹر صوفی کی انگریزی تاریخ کشمیر موسومہ کشیر، فوق کی تاریخ کشمیر جلد دوم۔ حزینۃ الاصفیا (جس کے مرتب کے پیش نظر تاریخ الاعظمی تھی)۔ اور متفرق سیاسی تواریخ پر مبنی ہیں۔

[2] لیکن اکا دکا مسلمان اس سے پہلے بھی کشمیر میں آتے رہے اور راجا ہرش کے عہدِ حکومت میں (۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۱ء تک) بعض مسلمان کشمیری فوج میں ملازم تھے۔ [3] یا سمبھا دیو

راجا سنگھ دیو کے ایک جانشین نے اپنا وکیل مطلق مقرر کیا۔ آخر میں جب مُلک کا نظام درہم برہم ہونے لگا تو ۱۳۴۳ء میں شاہ مرزا صاحب شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ کیمبرج ہسٹری میں ان کی نسبت لکھا ہے:۔

"نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ اور نیک نیتی سے استعمال کیے۔ کشمیر کے ہندو راجے بڑے ظالم تھے۔ ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے۔ نئے بادشاہ کی حکومت لبرل اصولوں پر قائم تھی۔ اس لیے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹادیے۔ ٹیکس وصول کرنے کے ظالمانہ طریقے موقوف کر دیے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصے پر مقرر کیا۔"

شاہ میر نے کشمیر سے اسلام کے سیاسی تعلقات کی بُنیاد ڈالی۔ لیکن اس خطۂ جنت نظیر میں اسلام کے پہلے کامیاب مبلغ حضرت بلال شاہ یا بلبل شاہ تھے۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ حضرت بلبل شاہ کا اصلی نام شرف الدین تھا۔ اور اسلام کشمیر میں ان کی بدولت پھیلا۔ وہ شاہ نعمت اللہ فارسی کے مرید اور سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے۔ ۱۳۲۴ء میں رنجن شاہ حاکم کشمیر کے عہد میں وہ کشمیر آئے اور راجا اور اس کے بہت سے امرا کو مسلمان کیا۔ تفصیل اس کی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے سرینگر میں آکر شہر کے باہر لب آب قیام کیا۔ اس وقت تبتی نسل کے ایک راجا رنجن دیو نے مُلک پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ خود بُودھ مذہب کا پیرو تھا، لیکن اس کی طبیعت اپنے مذہب سے مطمئن نہ تھی۔ مُلک میں عام طور پر ہندو مذہب رائج تھا۔ لیکن اس نے شاہ میر کی وجہ سے جو ابھی ایک باا ثر درباری تھا۔ اسلام سے شناسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بُودھ مت چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ بہت سوچ سوچ کر ایک رات اس نے فیصلہ کیا کہ کل علی الصباح سب سے پہلے جو مجھے قابل عظمت اور مقدس ہستی نظر آئے گی، میں اُسی کا مذہب اختیار کر لوں گا۔ اگلے روز جب وہ اُٹھا اور مغرب کی طرف نظر دوڑائی تو

دیکھا کہ ایک بزرگ فرشتہ صورت، پتھر ملی زمین پر بڑے وقار اور خضوع اور خشوع سے نماز ادا کر رہا ہے۔ راجا اسے دیکھ کر بڑا متاثر ہُوا۔ پا پیادہ اس کی خدمت میں پہنچا اور اس کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا[1]۔ اس کے بعد اس کے اہلِ خانہ اور امرائے سکبار مسلمان ہوئے اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ حضرت بلبل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور دولتِ اسلام سے فیضیاب ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے[2]۔ راجا نے آپ کے ایما پر ایک بڑی خانقاہ کی بُنیاد رکھی۔ جو اب بھی لنگر بابا بلبل شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی۔ تواریخ اعظمی کے مصنّف خواجہ اعظم نے بابا بلبل شاہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ مَیں غذا اور سر و سامان کے بغیر خوشی سے زندگی بسر کروں۔ اور اسی بدن کے ساتھ رُوح کے جُدا ہوئے بغیر دار البقا کو جاؤں، اور اس جسم کو ابد الاباد تک محفوظ رکھوں۔ لیکن چونکہ یہ سب امور سنّتِ نبویؐ کے خلاف ہیں۔ مَیں ان کا مرتکب نہیں ہوتا۔ سنّت کی پیروی میرے نزدیک ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ حضرت کی وفات ۱۳۲۶ء میں ہوئی۔ اس کے ڈھائی سال بعد رنچن شاہ جس نے سلطان صدر الدین کا لقب اختیار کیا تھا، وفات پا گیا اور حضرت کے مزار کے قریب دفن ہُوا۔

سلطان صدر الدین کی وفات کے بعد مُلک میں پھر بدنظمی پیدا ہوئی اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ شاہ میر صاحب سلطان شمس الدین کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ انھیں تین چار سال سے زیادہ حکومت نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن انھوں نے

---

[1] حال کے بعض ہندو مورخین (مثلاً کرپا رام اور نرائن کول) نے رنچن دیو کے مسلمان ہونے کی یہ وجہ دی ہے کہ براہمنوں نے اسے ہندو بنانا منظور نہ کیا۔ (تاریخ کشمیر موسوم کشیر از ڈاکٹر صوفی)

[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر صوفی کی تاریخ کشمیر ص ۸۳

اسلامی حکومت کی مستحکم بنیاد رکھ دی ۔ اور کوئی ڈھائی سو سال تک ان کا خاندان اس ملک میں برسرِ اقتدار رہا ۔

اسی صدی کے اخیر میں امیر کبیر سید ہمدانی ایران سے کشمیر تشریف لائے ۔ آپ بڑے صاحبِ علم بزرگ گزرے ہیں ۔ اور اسلامی دنیا کی روحانی تاریخ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ آپ کی ذات میں جلالی اور جمالی شانیں دونوں موجود تھیں ۔ اور مذہب سے واقفیت اور روحانی عزو مرتبت کے علاوہ منتظمانہ قابلیت بھی آپ میں بدرجۂ اتم تھی ۔ آپ ۱۲ رجب ۷۱۴ھ (مطابق ۱۲ر اکتوبر ۱۳۱۴ء) کو بمقام ہمدان پیدا ہوئے ۔ مدتوں ممالک اسلامی کی سیاحت کی ۔ مشہور ہے کہ آپ نے ایک ہزار چار سو اولیاء اللہ سے ملاقات کی لیکن آپ کا اصل تعلق کبرویہ سلسلے سے تھا ، جو سہروردیوں کی ایک شاخ ہے ۱۳۶۹ء میں آپ ایران چھوڑ کر سات سو سیدوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے ۔ بادشاہِ وقت آپ کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا ۔ اور آپ نے اور آپ کے رفقا نے بڑی سرگرمی سے اشاعت اسلام شروع کی ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی کوششوں سے سینتیس ۳۷ ہزار کشمیری دائرہ اسلام میں آئے ۔ آپ نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں ۔ مثلاً جمع الاحادیث ، شرح اسمائے حسنیٰ ، شرح فصوص الحکم ، مراۃ التائبین ، ذخیرۃ الملوک آپ کی آخری تصنیف امورِ ملکی اور سیاسی مصلحتوں[1] کے متعلق ہے ۔ آپ کی اور آپ کے رفقا کی کوششوں سے اسلام کشمیر میں مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا ۔ آپ کی وفات ۷۸۶ھ میں ضلع ہزارہ اور بقول بعض کافرستان کے علاقے میں ہوئی ۔ لیکن نعش مبارک ترکستان کے

---

[1] آپ نے کشمیر میں بھی بعض سیاسی معاملات میں دخل دیا ۔ مثلاً جب آپ کشمیر میں تشریف لائے تو کشمیر کا بادشاہ اہند کے حاکم سے (جو اٹک سے سولہ میل شمال کو ایک پرانی اور اہم بستی ہے) برسرِ پیکار تھا ۔ آپ نے محاذِ جنگ پر جا کر دونوں میں صلح کرا دی ۔
(تاریخ کشمیر از ڈاکٹر صوفی)

شہر ختلان میں لے جا کر دفن کی گئی۔

تواریخ اعظمی میں لکھا ہے کہ آپ نے تین مرتبہ ربع مسکون کی سیر کی۔ اور اس سلسلے میں تین دفعہ کشمیر آئے۔ آخری دفعہ وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے ۷۷۶ھ میں تشریف لائے تھے۔ جب آپ پہلی مرتبہ ۷۷۱ھ میں تشریف لائے تھے تو سید محمد خاوری نے تاریخ لکھی ہے ؎

میر سید علی شیر ہمدان — سیرِ اقلیم سبعہ کرد نکو
شُد مشرف مقدمش کشمیر — اہلِ آن شہر را ہدایت جو
سالِ تاریخ مقدمِ او را — یابی از مقدمِ شریف او

اس وقت آپ کے ساتھ سات سو ساداتِ عظام تھے۔ کشمیر پہنچ کر آپ نے محلہ علاء الدین پورہ میں قیام کیا۔ پانچ وقت کی نماز دریا کے کنارے جہاں اب آپ کی خانقاہ ہے، ادا فرماتے اور خلقت کو ارشاد و ہدایت سے فیضیاب کرتے۔ بادشاہِ وقت سلطان قطب الدین آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا اور آپ کا بڑا ادب کرتا۔ اس نے ایک خلافِ شرع حرکت کر رکھی تھی۔ یعنی دو خواہرانِ حقیقی کو اپنے نکاح میں لے آیا تھا۔ حضرت کے ارشاد پر اس نے اپنی غلطی کا ازالہ کیا۔ شروع شروع میں ہندوانہ لباس پہنتا تھا۔ حضرت کے ارشاد پر اسے ترک کیا۔ اور اسلامی ممالک کا لباس اختیار کیا۔ مرزا حیدر نے تاریخ رشیدی میں لکھا ہے کہ حضرت نے کشمیر میں چالیس ؟ روز سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ اور تواریخ اعظمی کی نسبت یہ بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت کے کشمیر سے چلے جانے کے بعد آپ کے اکثر رفقا یہیں رہ گئے۔ اور آپ کی خانقاہ کشمیر میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ علامہ اقبال ؒ آپ کی نسبت لکھتے ہیں ؎

سیدِ سادات سالارِ عجم — دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم
تا غزالی درسِ اللہ ہُو گرفت — ذکر و فکر از دُودمانِ او گرفت
مُرشدِ آں خطۂ مینو نظیر — میر درویش و سلاطین را مشیر

آفرید آں مردِ ایرانِ صغیر   باہنرہائے غریب و دلپذیر

امیر کبیر سید ہمدانی کے جو خلفا کشمیر میں بس گئے، اور یہیں وفات پا کر دفن ہوئے، کئی تھے۔ ان میں سے ایک میر سید حسین سمنانیؒ تھے، جنھیں حضرت نے کشمیر آنے سے پہلے دریافت حالات کے لیے بھیجا تھا اور ان کی طرف سے اطلاع آنے پر خود تشریف لائے تھے۔ ایک رفیقِ سفر شیخ سلیمان کشمیری تھے۔ وہ امرائے ہنود میں سے تھے۔ مسلمان ہو کر قرآن مجید حفظ کیا لیکن ترک مذہب کی وجہ سے ان کے عزیز و اقارب ان کے خلاف ہو گئے اور انھیں سخت پریشان کیا۔ چنانچہ وہ برگشتہ ہو کر بمقام کولاب حضرت امیر کبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہم رکاب رہنے لگے۔ جب حضرت کشمیر تشریف لائے تو وہ بھی ساتھ تھے اور چونکہ اب کشمیر میں حالات بہتر ہو گئے تھے، یہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ ایک اور خلیفہ محمد کاظم صاحب المشہور بہ سید قاضی تھے، جن کی تحویل میں حضرت امیر کبیر کا کتب خانہ تھا۔ انھوں نے علاقہ لنا پور میں اشاعتِ اسلام کی اور وہاں کے باشندوں کو مسلمان کیا۔

حضرت امیر کبیرؒ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانیؒ کئی سو ہمراہیوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ اور بارہ سال تک (بلکہ بقول بعض بائیس سال تک) اشاعتِ اسلام میں سرگرم رہے۔ حاکمِ وقت سلطان سکندر بت شکن ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور وزیر شاہ سنہا بھٹ بھی جو آپ کی آمد کے بعد مسلمان ہوا اور ملک سیف الدین کے لقب سے ملقب ہوا۔ آپ کا بے حد پاس کرتا تھا۔ اس نے آپ سے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی۔ آپ نے بادشاہ کے ایما پر کئی کتابیں لکھیں۔ ایک علمِ تصوف میں ہے۔ ایک رسالہ شرحِ منطق ایک رات میں ختم کیا۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ کے زمانے میں احکامِ شرع کشمیر میں اس طرح نافذ ہوتے تھے کہ سماع بالمزامیر اس خطے میں بالکل نہ تھا اور نوبت بھی دروازہ شاہی کے سوا کہیں نہ بجتی تھی۔ ۱۳۹۶ء میں آپ نے خطۂ کشمیر کو خیر باد کہا۔ اور حج کے لیے روانہ ہوئے۔ رخصت کے وقت آپ نے

بادشاہ کو اشاعتِ اسلام کی تاکید فرمائی۔ حج سے واپسی کے بعد آپ ختلان چلے گئے جہاں آپ کے والد بزرگوار کا مزار تھا۔ اور وہیں وفات پائی۔

سلطان سکندر بت شکن کے زمانے میں بت خانوں کے انہدام اور ہندوؤں بالخصوص برہمنوں کی ایذا دہی میں جو اہتمام ہُوا، اس کا باعث اس کے وزیر سنہا بھٹ کی ذات تھی۔ وہ نیا نیا مسلمان ہُوا تھا۔ اور عام نو مذہبوں کی طرح اس کے دل میں نئے مذہب کے لیے خاص جوش و خروش تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ ترکِ مذہب کی بنا پر اسے راسخ الاعتقاد ہنود نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اس کے دل میں بھی ان کے خلاف غصے اور انتقام کا جذبہ پیدا ہُوا۔ اسے اپنے قدیم مذہب کی کئی رسمیں بھی سخت غیر منصفانہ معلوم ہوتی تھیں۔ بالخصوص بیواؤں کو مُردہ شوہروں کے ساتھ جبراً زندہ جلا دینے کی رسم۔ اس نے اسے مٹا دینے کا فیصلہ کیا اور ان لوگوں کو مُلک بدر کر دیا جو یہ رسم نہ چھوڑتے تھے۔

سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان علی شاہ تخت نشین تھا۔ اس کا وزیر بھی سنہا بھٹ تھا۔ اس لیے اس کے زمانے میں بھی یہ آئین جاری رہے۔ لیکن اس نے چار پانچ سال کی حکومت کے بعد تخت و تاج اپنے چھوٹے بھائی شادی خاں کو تفویض کیا جو بالآخر راجا جسرتھ خاں گکھر کی مدد سے ۸۲۶ھ میں سلطان زین العابدین کے نام سے خود مختار بادشاہ ہُوا۔ اس نے سلطان سکندر اور سنہا بھٹ کے سب قوانین بدل دیے۔ جو لوگ مُلک بدر ہوئے تھے، انھیں واپس بُلا لیا۔ جزیہ ترک کر دیا۔ اور گاؤ کشی کی بھی ممانعت کی۔ بلکہ بیواؤں کو زندہ جلانے کی اجازت بھی از سرِ نو دے دی۔ برہمن اور دیگر ہندو جو سکندر کے عہد میں دکھاوے کے لیے مسلمان ہوئے تھے۔ پھر اپنے پُرانے مذہب پر آ گئے۔ اور ان سے کسی طرح تعرض نہ کیا گیا۔ سلطان زین العابدین کو کشمیر کا اکبر کہتے ہیں۔ اور اس کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ وہ قابلیت اور اخلاق میں اکبر سے بڑھا ہُوا تھا۔ اس نے اکبر کی طرح ایک نیا مذہب جاری کرکے

مسلمانوں کو برگشتہ نہیں کیا۔ اور باوجودیکہ اس نے ہندوؤں سے انتہائی رواداری اور دلجوئی کا سلوک کیا، مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہ کی۔ اس کے زمانے میں علم وفن اور شعروسخن کو بڑا فروغ ہُوا۔ کشمیر کی مشہور تاریخ راج ترنگنی تصنیف ہوئی۔ بادشاہ تبتی، فارسی، کشمیری، ہندی اور دوسری زبانوں کا ماہر تھا۔ اور اس نے تصنیف وتالیف کو بڑی تقویت دی۔ سوم نام ایک کشمیری نے جو کشمیری زبان کا شاعر اور علوم ہندیہ میں ماہر تھا۔ اس کے حالات میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ اور بودی بھاٹ نے موسیقی کی ایک کتاب بادشاہ کے نام پر معنون کی سلطان زین العابدین باون برس تک برسرِ حکومت رہا۔ اور بالآخر ۱۴۷۲ء میں فوت ہُوا۔

سلطان زین العابدین کے عہدِ حکومت میں رواداری اور مذہبی آزادی کا دور دورہ تھا لیکن اشاعتِ اسلام کا کام اس زمانے میں بھی بند نہ ہُوا۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کشمیر کی تاریخ موسومہ کشیر میں لکھتے ہیں کہ راجپوتوں کے دو بڑے قبیلے جو بارہ مولہ اور کوہالہ کے درمیان دریائے جہلم کے کنارے پر آباد ہیں، سلطان زین العابدین کے عہدِ حکومت میں مسلمان ہوئے۔ (ص ۱۰۸۴) واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی ہمدانی اور ان کے صاحبزادے اور رفقائے کار کی سرگرمیوں نے کشمیر میں ایک رُوحانی ہلچل پیدا کردی تھی۔ اور اب مقامی اولیا اور مبلغین کا ایک ایسا گروہ برسرِکار آیا، جنھیں بابا یا مسلمان رشی (یا ریشی) کہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت سادہ زندگیاں بسر کرتے اور ہندو اور مسلمان دونوں انھیں نگہِ احترام سے دیکھتے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت شیخ نورالدین نے پائی جنھیں ہندو نندہ رشی کہتے ہیں۔ اور جن کی نسبت بابا داؤد خاکی نے لکھا :-

شیخ نورالدین ریشی، پیرِ جمع ریشیاں — زاہدے خوش بود باحق داشت بسیار اشتغال
بود باتجرید وتفرید اہلِ صوم دہر نیز — تارکِ لحم وبصل، شیر وعسل بسیار سال
صاحبِ کشف وکرامت بود ونطقِ خوب داشت — ہم اویسی بود گفت ایں داؤدی صاحب مقال

شیخ نورالدین کے والد یاسمن ریشی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ

خود ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور سلطان زین العابدین کے عہدِ حکومت میں ۱۴۲۶ء میں وفات پا گئے۔ آپ کشمیر کے سب سے بڑے ولی سمجھے جاتے ہیں۔ اور جب اُنیسویں صدی کے آغاز میں کچھ عرصہ کے لیے کشمیر میں افغانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کشمیر کے گورنر عطا محمد خان نے ان کی وفات کے کوئی چار سو سال بعد ان کے نام کے سکے بنوائے۔

سلطان زین العابدین کی وفات کے بعد کشمیر میں بڑی کھلبلی مچی۔ ۱۴۸۷ء میں عراق سے میر نور بخش کا مرید شمس الدین کشمیر میں آیا۔ اور اس مُلک میں نور بخشی عقائد[1] کی اشاعت شروع کی۔ ابتدا میں خلقت نے اس پر بڑا اعتماد کیا۔ اس کے مریدوں کے لیے دیہات وقف ہوئے اور خانقاہیں رہنے کو ملیں۔ یہ لوگ میر نور بخش کو مہدی آخر الزمان سمجھتے ہیں۔ اور باقی اکثر عقیدوں میں شیعوں سے ملتے جلتے ہیں۔ تھوڑے عرصے میں چک قوم کے لوگوں نے جو بعد میں کشمیر کے حکمران ہوئے یہ مذہب اختیار کر لیا۔ اور کشمیر میں اس شیعہ سُنّی مسئلے کا آغاز ہوا۔ جس نے بعض اوقات بڑی تلخ صُورت اختیار کر لی۔ آخر میں اس مُلک میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد ہو گئی۔ لیکن شیعوں نے فقط سُنّی مسلمانوں میں ہی اپنے خیالات کی تلقین نہیں کی بلکہ ہندوؤں میں بھی بڑے جوش سے اپنے عقائد پھیلائے۔ میر شمس الدین کی نسبت مشہور ہے کہ اُنھوں نے ایک ایک دن میں بیس بیس ہزار ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ اور بہت سے ہندو شیعہ مبلغین اور حکام کی بدولت پہلے ہی مسلمان ہوئے۔

۱۵۸۶ء تک کشمیر حکومتِ دہلی کے اثر سے آزاد رہا۔ لیکن جب شیعہ حکمران نے سُنیوں پر کثرت سے مظالم شروع کیے تو بابا داؤد خاکی، شیخ یعقوب صیرفی وغیرہ کا ایک وفد اکبر کے پاس فریاد لے کر گیا۔ اور اکبر نے اسی سال یہ مُلک فتح کر کے اسے مقبوضاتِ مغلیہ میں داخل کیا۔

---

[1] اسمٰعیلی خوجوں کی تاریخ نُور المبین میں نور بخشیوں کو اسمٰعیلی بتایا گیا ہے۔

توسیعِ اسلام

جس طریقے سے اسلام پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں پہنچا اس کا مختصر خاکہ ہم نے گزشتہ اوراق میں پیش کر دیا۔ بعض مغربی اہل قلم نے، جن کی آنکھوں پر تعصب نے پردے ڈال رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ اس سرزمین میں مسلمان بادشاہوں نے بزورِ شمشیر اسلام پھیلایا۔ ڈاکٹر ٹائی ٹس نے بھی انڈین اسلام میں دبی زبان میں اس کی تائید کی لیکن اس کی تردید کے لیے فقط اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دہلی، آگرہ، لکھنؤ، احمد نگر اور احمد آباد وغیرہ کے نواح میں جو صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت کے مرکز رہے، آج بھی مسلمانوں کی تعداد دس پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمان بادشاہ تلوار کے زور سے اسلام پھیلاتے تو سب سے زیادہ مسلمان انھیں علاقوں میں ہوتے!

خطۂ پاک و ہند میں مسلمانوں کی آبادی بیشتر دو علاقوں میں ہے شمال مغرب (یعنی مغربی پاکستان) اور شمال مشرق یعنی (مشرقی پاکستان) ہیں۔ شمال مغربی گروہ کے متعلق مسٹر وائل سابق اکونٹنٹ جنرل مدراس نے "روٹری کلب مدراس" کے سامنے ایک تقریر میں کہا کہ:۔

"سرحد اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے۔ یہ صوبے ان اسلامی ممالک سے قریب تر ہیں جو ہندوستان کی مغربی سرحد پر واقع ہیں۔ اور سب سے پہلے مسلمان یہیں آئے اور بسے"۔

شمال مشرقی گروہ کے متعلق وہ کہتے ہیں:۔

"بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ کیا ہے۔ یقیناً یہ اسلامی حکومت کا نتیجہ نہیں۔ کیونکہ اگر اس کی وجہ یہ ہوتی تو صوبجات متحدہ اور دہلی میں جو صدیوں اسلامی حکومت کا مرکز رہے، مسلمانوں کی زیادہ ہوتی۔ بنگال میں

مسلمانوں کی جو اکثریت ہے اسے اسلامی فتوحات یا اسلامی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالص قدرتی اسباب کا نتیجہ ہے اور انگریزی حکومت کے مختصر زمانے ہی میں رونما ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں مسلمان (متحدہ) بنگال کی کل آبادی کا پچپن فیصدی تھے۔ اور ہندو تینتالیس فیصدی۔ ۱۸۸۱ء میں جب پہلی مرتبہ مردم شماری ہوئی تو مسلمان ۴۹۰۷ فیصدی تھے۔ اور ہندو (۴۸۰۹) فیصدی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں ہندو کل آبادی کے پچاس فیصدی سے زیادہ ہوں گے۔ اور اسلامی حکومت کے دوران میں یقیناً ان کی اکثریت ہوگی۔ محکمہ مردم شماری بنگال کا سپرنٹنڈنٹ لکھتا ہے "بنگال کے ہندو اپنی انتہائی تعداد کے قریب قریب پہنچ رہے ہیں۔ اور بہت جلد ان کی آبادی میں کمی شروع ہو جائے گی۔ اس کے برعکس مسلمان آبادی بڑھتی جائے گی"۔

اگر بغور دیکھا جائے تو مسلمانوں کی توسیع کی اہم وجہ اشاعتِ اسلام اور دوسرے اسباب سے زیادہ وہ قدرتی حالات ہیں جو بنگال اور آسام وغیرہ میں بہت نمایاں ہیں۔ امپیریل گزیٹیر میں اس مسئلے پر نہایت وضاحت سے لکھا ہے:۔

"بالعموم اسلام لوگوں کے تبدیل مذہب سے اتنا نہیں بڑھا جتنا اپنی قدرتی قوتِ نمو سے۔ مشرقی بنگال میں جہاں مسلمانوں کی تعداد گزشتہ بیس سال میں اسّی لاکھ سے ایک کروڑ ساڑھے بارہ لاکھ ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ اور قوموں کی بہ نسبت بہتر طور پر خراب آب و ہوا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مسلمان گوشت خور ہے۔ اور اپنے ہندو ہمسایوں کے مقابلے میں زیادہ مقوی غذا کھاتا ہے۔ وہ بیواؤں کی شادی کا حامی اور کم عمر بچوں کی شادی کا مخالف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا کنبہ بڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں تک جبراً مسلمان کرنے کا تعلق ہے۔ ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی اپنی حالت اتنی غیر مستحکم تھی کہ وہ مذہب کی عام اشاعت نہ کر سکتے تھے۔ شروع شروع میں مغل بادشاہ بھی مذہبی

معاملات سے بے تعلق تھے ۔ اور اپنی لڑائیوں اور انتظامی معاملات میں اتنے مشغول تھے کہ اشاعتِ مذہب پر اچھی طرح توجہ مبذول نہ کر سکتے تھے۔ ان کی حکومت بہت حد تک راجپوت راجاؤں کے تعلقات پر قائم تھی۔ اور ان راجکماریوں نے جن سے انھوں نے شادیاں کیں شاہی خاندان میں ہندو اثرات داخل کر دیے اور ہندو مذہب کے متعلق رواداری بڑھا دی"۔

اس قدرتی نشو و نما کے علاوہ اسلام کی توسیع کا ایک بہت بڑا سبب اسلامی مساوات تھی جو بالخصوص نیچ ذاتوں کے لیے آزادی اور ترقی کا پیغام تھی۔ اس سلسلے میں ہم بنگال سے متعلق آرنلڈ کی رائے درج کر چکے ہیں۔ اور اگر نیچ ذاتوں کے ان افراد کی فہرست مرتب کی جائے جو اسلام لانے کے بعد فوجوں کے سردار یا صوبوں کے حاکم ہوئے اور جن کی اصلی ذات طویل فارسی خطابوں اور ناموں میں چھپ گئی ہے، تو اسلام کی اشاعت کی ایک اور اہم وجہ معلوم ہو جائے گی!

نوٹ

اگلے صفحے پر ہم پاک و ہند کا ایک نقشہ درج کرتے ہیں۔ جس میں ازمنہ وسطیٰ کے مشہور مقامات اور اُن آزاد حکومتوں کی حدود سمجھنے میں مدد ملے گی جو نویں صدی ہجری کے آخر میں برسرِ اقتدار تھیں۔

ہندستان ازمنہ وسطیٰ میں

آزاد حکومتیں اور مشہور مقامات

۱۵۲۶ء

۱۔ کشمیر
۲۔ افغان حکومت
۳۔ ملتان سندھ
۴۔ گجرات
۵۔ مالوہ
۶۔ گونڈوانہ
۷۔ بنگال
۸۔ اڑیسہ
۹۔ گولکنڈہ
۱۰۔ برار
۱۱۔ خاندیش
۱۲۔ احمد نگر
۱۳۔ بیجاپور
۱۴۔ بیجے نگر
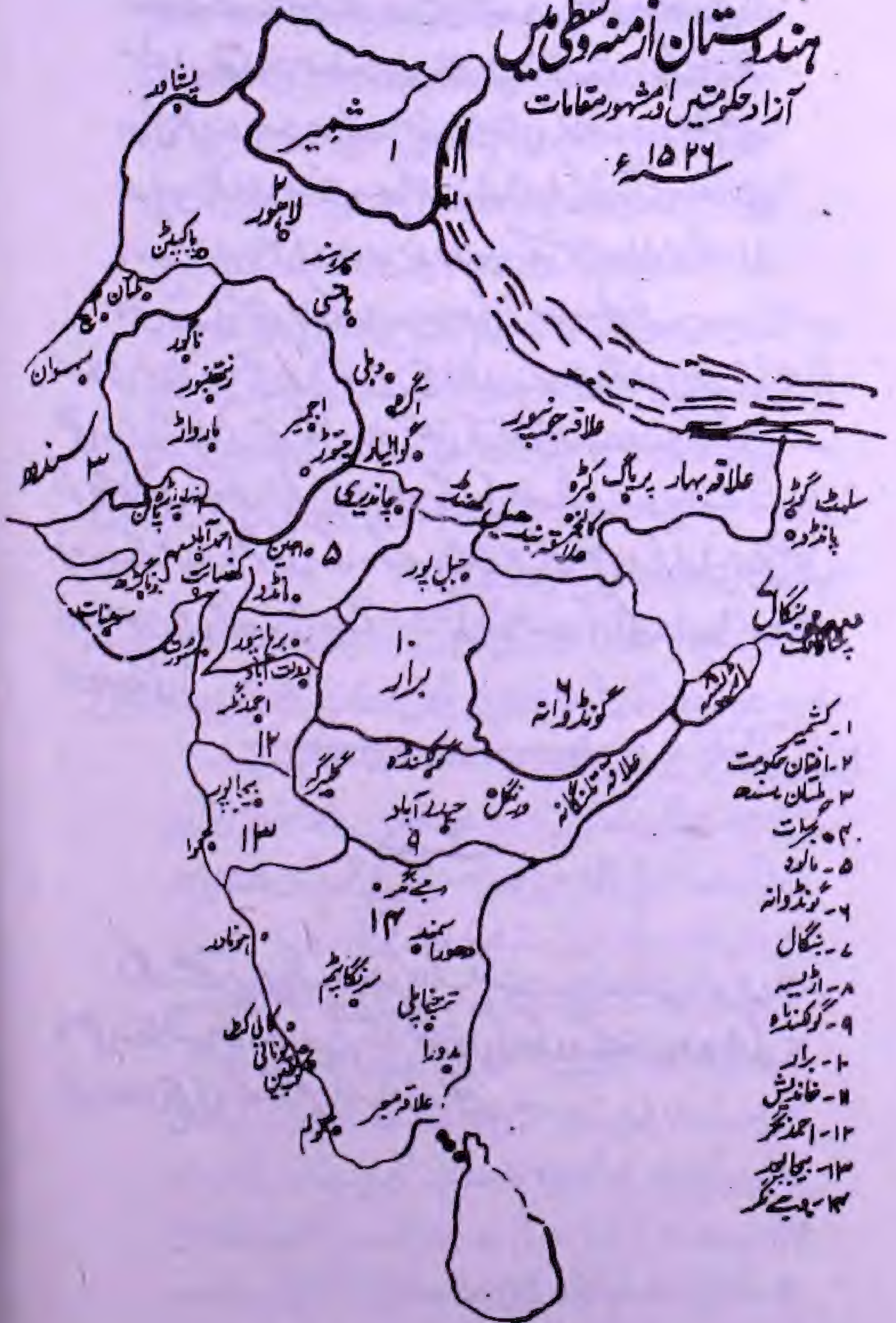
دورِ نفوذ و ترویج

(خاندانِ تغلق۔ سادات اور لودھی خاندان کا عہدِ حکومت)

۱۳۲۱ء سے ۱۵۲۶ء تک

دَورِ نفوذ و ترویج

تاریخی ادوار کی ترتیب کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہے۔ واقعات مورخین کی سہولت نہیں دیکھتے اور اس طرح نہیں پیش آتے کہ ایک مقام پر پہنچ کر ان کی رَو کا رُخ یکایک بدل جائے یا ایسا معلوم ہو کہ گویا ایک دروازہ بند ہوا اور دوسرے کے کواڑ کھل گئے۔ بلکہ عام طور پر تبدیلی حالات نہایت آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات تو رَو کا رُخ ایک ہی قرن میں آگے پیچھے دائیں بائیں ہوتا رہتا ہے۔ اندریں حالات واقعات کو کسی منضبط صورت میں اور جُداگانہ ادوار کے ماتحت پیش کرنے میں کسی الجھنوں کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔

مثلاً موجودہ دَور کو ہم نے عام مورخین کی روش کے مطابق خاندان خلجی کے اختتام اور خاندان تغلق کے آغاز سے شروع کیا ہے، لیکن جو رجحانات اس دَور کو گزشتہ دور سے ممتاز کرتے ہیں (یعنی سلطنت دہلی کی کمزوری۔ صوبوں کی خود مختاری ملک کے دُور دراز حصّوں میں اسلامی تہذیب و مذہب کے مرکزوں کا قیام۔ دہلی میں صوفیہ اور تصوف کی سرد بازاری اور فقہ اور علمِ شریعت کا فروغ) سب کے سب اس دَور کے شروع ہوتے ہی برسرِ کار نہیں آ گئے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندان تغلق کے پہلے بادشاہ سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات تک جو وسعت اور مرکزی استحکام حکومتِ دہلی کو سلطان علاء الدین خلجی نے عطا کیا تھا، وہ پوری طرح برقرار تھا۔ اور بادشاہِ دہلی کا مغرب میں سندھ، مشرق میں بنگالہ اور جنوب میں معبر تک سکّہ رواں تھا۔ دہلی کے سب سے بااثر صوفی حضرت سلطان المشائخ بھی ابھی زندہ تھے۔ ظاہر ہے کہ معنوی حیثیت سے اس زمانے کو محمد بن تغلق یا اس کے جانشینوں کے عہدِ حکومت سے کوئی تعلق نہیں، لیکن چونکہ ایک خاندان کے پانچ سال کو ایک

دور میں شامل کرنا اور باقی سو سال کو دوسرے دور میں، بے ترتیبی اور ناظرین کی پریشان خیالی کا باعث ہوتا۔ اس لیے ہمیں غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت کا ذکر بھی اس خاندان کے باقی افراد کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔

سلطان غیاث الدین تغلق کا جانشین محمد بن تغلق ہوا جس کے عہد میں جابجا بغاوتیں ہوئیں۔ اور ملک کے کئی صوبے دہلی کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد فیروز تغلق بادشاہ ہوا جو کئی نیک کاموں کے لیے ملک کی تاریخ میں ممتاز ہے۔ لیکن حکومتِ دہلی کی روز افزوں کمزوری کو وہ بھی نہ روک سکا۔ اور اس کے بعد تو گویا ایک سیلاب آگیا جس میں تیمور کے حملوں اور خاندانِ سادات کی کمزوری کی وجہ سے دہلی کا رہا سہا اقتدار جاتا رہا۔ اس کے بعد لودھیوں اور پھر مغل بادشاہ بابر نے دہلی کا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ان کے زمانے میں موافق اور مخالف ہر طرح کے اثرات کارفرما تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات سے اکبر کی فتوحات تک حکومتِ دہلی کو وہ وسعت اور استحکام نصیب نہیں ہوا جو اسے سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں حاصل تھا۔

ان دو صدیوں میں ملک کے کئی صوبے خود مختار ہو گئے۔ بعض میں مسلمان بادشاہوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں بعض میں ہندو راجاؤں نے۔ ایک لحاظ سے تو یہ ملک کے لیے مضر ثابت ہوا کیونکہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی اور منگول حملہ آور جن کا شاہانِ دہلی نے کامیاب مقابلہ کیا تھا، تیمور کے زیرِ قیادت دہلی تک آ گئے۔ لیکن دہلی کی کمزوری سے ملک کے دوسرے حصوں کو فائدہ بھی پہنچا۔ غیر محفوظ ذرائع آمد و رفت کی بنا پر شاہانِ دہلی کے لیے ملک کے دور دراز حصوں میں امن قائم رکھنا مشکل تھا۔ لیکن جب گجرات، دکن، بنگال اور دوسرے صوبے خود مختار ہو گئے تو ان کے حکمرانوں کے لیے محدود علاقوں کا انتظام نسبتاً آسان تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں ان صوبوں نے بہت ترقی کی۔

تہذیب و تمدن کو بھی ان حالات سے فائدہ پہنچا۔ پہلے اسلامی تہذیب و مذہب کا مرکز صرف دہلی تھا۔ اب احمد آباد، جونپور، گلبرگہ، احمد نگر اور دوسرے شہر بھی اسی طرح کے مرکز بن گئے۔ اور اسلامی تہذیب اور مذہب کی اشاعت زیادہ باقاعدہ اور موثر طریقے سے ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو بیج مختلف جگہوں پر بوئے گئے تھے۔ انھوں نے جڑ پکڑ لی۔ اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کا وہ درخت نشو و نما پانے لگا، جس کے ثمرات آج ہمیں نظر آرہے ہیں۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات اور محمدؐ بن تغلق کی تخت نشینی سے جو تغیر و تبدل ملک کی سیاسی حالت میں ہوا، اس سے زیادہ انقلاب ملک کی روحانی حالت میں حضرت سلطان المشائخ کی وفات سے ہوا۔ اب ملک یا کم از کم دارالخلافہ میں صوفیہ کا عہدِ زریں ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین حضرت چراغ دہلیؒ زہد و تقوے، انصاف و نیکی اور خلوص روحانی خدمات میں اپنے مرشد سے پیچھے نہ تھے، لیکن انھیں یا دہلی کے کسی اور بزرگ کو وہ شاہانہ سطوت اور وقار نصیب نہیں ہوا، جو حضرت سلطان المشائخ کے حصے میں ودیعت ہوا تھا۔ معاصرانہ تاریخوں سے بخوبی نظر آتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ دربارِ شاہی کے مقابلے میں دوسری بارگاہ تھی، جہاں عوام و امرا کسی خوفِ حکومت سے نہیں بلکہ ارادت و عقیدت کے جذبات سے متاثر ہو کر سر جھکاتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ کا اتنا اثر تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی جیسے جابر بادشاہ ان سے غم کھاتے تھے اور ان کی خواہشات کا پاس کرتے تھے۔ بعض بادشاہ اور شہزادے تو ان کے عقیدت مند مرید تھے۔ یہ سلسلہ ان کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا بلکہ آخری ایام میں خود انھیں سماع کے لیے ایک مذہبی مجلس میں جواب دہ ہونا پڑا۔ ان کے بعد جو دور آیا، اس میں صدر نشین حضرات صوفیہ نہ تھے۔ اور نہ ہی کسی بزرگ کو یہ احترام حاصل ہوا کہ وہ ایک لحاظ سے حکومتِ ظاہری پر بھی فروغ پالے۔ بلکہ تصوف کو شرع اور حکومتِ وقت کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ علومِ اسلامی کی زیادہ اشاعت سے

سماع اور اس طرح کے اختلافی مسائل کے متعلق صحیح شرعی نقطۂ نظر عوام کے سامنے آ گیا۔ اور اب فقہا ہی نہیں بلکہ اہلِ علم عوام بھی صوفیہ پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ اس کے علاوہ حضرات صوفیہ میں کئی ایسے بزرگ پیدا ہوئے، جنھوں نے طریقت کو شریعت کا پابند کرنے کی ضرورت بتائی۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے اپنے جانشین حضرت چراغ دہلیؒ نے نئے مذاق کی ترویج میں بڑا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ سلطان محمدؒ تغلق نے حضرات صوفیہ کے خلاف جو ظلم و ستم کا ہاتھ اٹھایا، اور ان کا زور توڑنے اور شیرازہ منتشر کرنے کے لیے جو مسلسل کوششیں کیں، ان سے بھی تصوّف کو نقصان پہنچا۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے زمانے تک اسے دہلی میں جو فروغ حاصل تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا۔

جس طرح مرکزی حکومت کی کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ دہلی اُجڑ گئی۔ اور احمد آباد، جونپور اور گلبرگہ آباد ہو گئے۔ اسی طرح اس دور میں سلطان محمدؒ بن تغلق کی پالیسی، تیمور کے حملے اور دوسرے سیاسی اثرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب و روحانیت کی شمعیں دہلی میں گل ہو کر ملک کے دوسرے حصّوں میں روشن ہوئیں۔ چنانچہ حضرت چراغ دہلیؒ کے وصال سے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی آمد تک دہلی غیر معمولی شخصیتوں سے خالی رہی۔ اور ان دو صدیوں میں وہاں ایک بھی بزرگ ایسا نہ ہوا جسے بنگالہ کے حضرت نور الحق قطب العالم قدس سرہ۔ کشمیر کے امیر کبیر سیّد علی ہمدانی سلہٹ (آسام) کے حضرت شاہ جلال مجرد۔ گلبرگہ کے حضرت گیسو دراز۔ اوچ کے حضرت مخدوم جہانیاںؒ یا جونپور کے سیّد محمدؒ مہدی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ لیکن جیسا کہ ہم تہذیب و تمدن کے ذکر میں کہہ چکے ہیں، اطرافِ ملک میں ان ہستیوں کے کارفرما ہونے سے ایسے گراں بہا کام سرانجام پا گئے، جو دہلی کی مجلسوں میں بیٹھ کر نہ ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کے بعض صوبوں مثلاً کشمیر اور آسام میں تو اسلام پہلی مرتبہ اسی زمانے میں داخل ہوا۔ اور دوسرے صوبوں مثلاً بنگال اور مغربی پنجاب اور سندھ میں اسے استحکام نصیب ہوا۔

سلطان غیاث الدین تغلق

نئے دور میں پہلا بادشاہ سلطان غیاث الدین تغلق تھا، جو اسلامی ہندوستان کی سب سے مایہ ناز ہستیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے اور جو نہایت نازک صورتِ حالات میں برسرِ اقتدار ہوا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ خاندانِ خلجی کا آخری بادشاہ اپنے نو مسلم غلام خسرو کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ خسرو نے ناصر الدین خسرو خاں کا لقب اختیار کر لیا اور تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ اس کا لقب اور نام مسلمانوں کا تھا لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھا۔ اور اپنے جو پرور ہم قوم اس نے گجرات سے منگوائے تھے وہ تو نام کے بھی مسلمان نہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے جینا حرام کر دیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بُت رکھوائے جاتے۔ اور کلام مجید کے نسخوں کو اوپر تلے رکھ کر خسرو کے ہندو ساتھی انھیں مونڈھوں کی طرح استعمال کرتے۔ یہ وقت اسلام کے لیے بڑا نازک تھا۔ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے:-

"اسلام کو اس وقت ایک سرپرست کی بڑی ضرورت تھی۔ خسرو کی ساری جماعت میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جس کا اسلام برائے نام نہ ہو۔ اور بعض نے تو اسلام اختیار ہی نہ کیا تھا۔ دربار میں علانیہ بُت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی۔ مسلمان مورخین ان واقعات کا بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی۔ یا انھیں مسمار کیا جاتا اور اسلام کی مقدس کتابیں کرسیوں اور اسٹولوں کی طرح بیٹھنے کے لیے استعمال کی جاتیں۔"

بدایونی بھی ان واقعات پر آنسو بہا کر کہتا ہے: "ہندو بر اغلب دربارہ کامگار و کامیاب شدند و سیلِ خرابی بر اہلِ اسلام شبخون آوردہ"۔ ضیاء الدین برنی جو اس زمانے میں زندہ تھا لکھتا ہے کہ خسرو کا مقصد شمالی ہندوستان میں نئے سرے سے ہندو اقتدار قائم کرنا تھا۔ "دراں ایام خذلاں و خسراں کہ شعائرِ کفر از غلبۂ ہندواں

بلندی می گرفت و شوکت و قوت پرواراں بر مزید مے گشت۔ ہندواں تمامی بلاد ممالکِ اسلام بغلک مے زدند و شادیہا مے کردند و نظر مے داشتند کہ باز دہلی ہندوانہ شود و مسلمانی دفع و مضمحل گردد" (ص ۴۱۲)

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ ایک ایسا نازک وقت تھا، جو انھیں سلطنت دہلی کے آغاز سے اب تک کبھی پیش نہ آیا تھا، لیکن ایک خدا کا بندہ اٹھا اور پیشتر اس کے کہ فتنہ جڑ پکڑ لے، اُس نے اس کا قلع قمع کر دیا۔ غازی ملک فخرالدین جونا جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ ہوا۔ ایک متدین مسلمان اور خلجی آقاؤں کا وفادار خادم تھا۔ خسرو خاں کی اسلام کش پالسی اور ان مظالم سے جو اس غاصب نے خلجی خاندان کے پسماندگان پر توڑے۔ اسے بڑا رنج ہوا اور اس نے ظالم کا قلع قمع کرنے پر کمر ہمت باندھی۔ "غازی ملک را از شنیدن ایں خبر متوحش عرقِ غیرتِ اسلام و حمیتِ ناموسِ ولی نعمتِ خویش در حرکت آمد و کمر ہمت بر انتقام گرفتن بر میانِ جان بست"۔ اس نے اطراف و اکناف کے مسلمان رؤسا کو پیغام بھیجے اور ان سے مدد چاہی۔ بعض نے تو ذاتی مصلحتوں کو فریضۂ قومی پر مقدم سمجھ کر ساتھ نہ دیا۔ لیکن دوسروں نے فوجیں بھیجیں، جنھیں ساتھ لے کر غازی ملک دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ تھانیسر کے قریب پہلا بڑا معرکہ ہوا۔ دہلی کی فوج نے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد پھر "نارائن" "نارائن" کے نعرے لگائے۔ لیکن باوجود کثرت کے خسرو کی فوج کو شکست ہوئی۔ اور غازی ملک نے دہلی کا رُخ کیا۔ تمام مسلمان مورخین اس واقعہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بدایونی لکھتا ہے: "در اوّل حملہ نسیم ظفر بر لشکر اسلام وزید و علم کفار نگونسار شد" فرشتہ غازی ملک کے کوچ کا ذکر کر کے لکھتا ہے ؎

مسیحا بار خضر رش ہمرکاب دہمعناں مہرسے
غنانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

دہلی کے باہر دوسری لڑائی ہوئی۔ سپاہیوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لیے خسرو نے شاہی خزانے کے مُنہ کھول دیے۔ انھیں تین تین چار چار سال کی تنخواہ

پیشگی دی۔ وہ جان توڑ کر لڑے۔ لیکن غازی ملک کی شاندار قیادت کام آئی۔ خسرو کو ابتدائی کامیابی کے باوجود شکست فاش ہوئی۔ اور دہلی اور اس کا گرد و نواح اس کے ساتھیوں سے پاک ہو گیا۔ برنی لکھتا ہے "فتنہ ہا فرونشست و جان نو در اسلام درآمد و مسلمانی از سر تازہ گشت و شعار کفر در زمین فرو رفت و خاطر ہا جمع شد و دلہا آسودہ گشت۔"

غاصب خسرو کو آقا کشی کی سزا دینے کے بعد غازی ملک نے خلجی خاندان کے وارثوں کی تلاش کی اور جب اسے پتا چلا کہ خسرو نے اس خاندان کا بچہ بچہ قتل کروا دیا ہے تو علما کے اصرار پہ خود تخت نشین ہوا۔ امیر خسرو نے قصیدہ لکھا ؎

حامیٔ اسلام، تغلق شاہ کہ انجم سلہا | بہر خ میزد تا فلک زنگو نہ دیں پرور کشید

غازی ملک جس سے تغلق خاندان شروع ہوتا ہے، غریب والدین کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت اور فہم و فراست کے بل بوتے پر ترقی کرتا گیا۔ پاکپتن میں، جہاں بابا فریدؒ کا مزار ہے، ایک روایت مشہور ہے کہ جب غازی ملک چھوٹا سا بچہ تھا تو بابا صاحب کے ہمسایے میں رہا کرتا تھا۔ بابا صاحب نے اسے دعا دی۔ اور اس کی برکت سے وہ بڑھتا بڑھتا تختِ شاہی تک پہنچا۔ اس زمانے میں حضرت بابا صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن غازی ملک نے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے اپنے ایک افسر بشارت خان کے زیر ہدایت بابا صاحب کے مزار کے پاس بشارت نالہ کھدوایا۔ جس سے اہالیانِ شہر اور زائرینِ مزار کو بڑی سہولت ہو گئی۔ اس روایت کی صحت مشتبہ ہے۔ لیکن حضرت بابا صاحب سے سلطان کی عقیدت ضرور قرین قیاس ہے۔ تحصیل پاکپتن میں ایک قصبہ قبولہ ہے، اس کی بابت سرکاری گزیٹر میں ہے کہ یہ قصبہ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے ایک افسر ملک قبولہ کی معرفت اس زمانے میں آباد کیا، جب وہ حضرت بابا فرید کے مزار کی زیارت کے لیے پاکپتن جا رہا تھا۔

اس کے علاوہ اسے سہروردی بزرگوں سے بھی عقیدت تھی۔

شروع میں سلطان تغلق ایک سوداگر کے گھوڑے چرانے پر نوکر تھا پھر سلطان علاء الدین کے بھائی الغ خان کے پاس پیادوں میں بھرتی ہوگیا۔ وہاں سے ترقی کرتا ہوا امیر آخور (یعنی سوار فوج کا افسرِ اعلیٰ) ہوا۔ اور پھر تو اتنی ترقی کی کہ مملکت کی سب سے بڑی مہم یعنی منگولوں کی روک تھام اس کے سپرد ہوئی۔ اسے مغربی پنجاب میں وہی فرائض ادا کرنے پڑے جن کی بجا آوری کے لیے بلبن نے اپنے بیٹے خانِ شہید کو ملتان میں متعین کیا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ "سلطان تغلق نے ملتان میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اس کے مقصورہ پر میں نے خود یہ لکھا ہُوا دیکھا ہے "میں تاتاریوں سے اُنتیس ۲۹ دفعہ لڑا ہوں اور ان کو شکست دی ہے۔ اس واسطے میرا لقب غازی ملک ہُوا۔"

تخت نشین ہونے پر سب سے پہلے جو کام سلطان کو کرنا پڑا وہ بیت المال کی درستی تھا۔ خسرو نے بلا مبالغہ شاہی خزانے پر جھاڑو پھیر دی تھی۔ سپاہیوں کو مہینوں بلکہ سالوں کی تنخواہ پیشگی ملی اور عوام الناس کو قابو میں رکھنے کے لیے مشائخ کبار اور بااثر لوگوں میں لاکھوں روپے تقسیم ہوئے۔ سلطان کو اس رقم کی بازیابی کا تلخ فرض ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے انتظام سلطنت پر دھیان دیا۔ اس کے نظم و نسق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جنھوں نے کسی ایسے مسلمان بادشاہ کی نسبت، جو اپنے مذہب سے بے پروا نہ ہو، اپنی تاریخ میں کلمۂ خیر نہیں لکھا۔ اس کی نسبت رقمطراز ہیں (ترجمہ)

"غیاث کا انتظام سلطنت انصاف اور میانہ روی پر مبنی تھا۔ مال گزاری کے نئے اصول وضع کیے گئے۔ اور سلطان نے اس امر کی بڑی احتیاط کی کہ اس سے خرابیاں نہ پیدا ہوں۔ خسرو نے جو جاگیریں تقسیم کی تھیں، وہ واپس لے لی گئیں۔ اور ملک کی مالی حالت درست کی گئی کاشتکاروں سے نیک سلوک کیا گیا۔ اور جو سرکاری افسر بدعنوانی کرتا اسے سخت سزا

دی جاتی۔ عدالت اور پولیس کے محکمے تسلی بخش تھے اور ملک کے دُور دراز حصّوں میں پرلے درجے کا امن و امان تھا۔"

مسلمان مورخین کی سلطان غیاث الدین کی نسبت جو رائے تھی وہ برنی کے صفحات میں نظر آتی ہے:۔

"ومنکہ ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی ام۔ از بسے خداوندانِ تجربہ کہ چشم عاقبت بینِ ایشاں بسرمہ انصاف مکحول بود شنیدہ بودم کہ ایشاں از روئے سلامت طلبیِ عام و نیک خواہی دین و دُنیا مسلماناں گفتندے کہ در دہلی ہیچ بادشاہے ہمچو سلطان تغلق شاہ پائے بر سریرِ سلطنت نہادہ است شاید کہ بعد از دہم ہمچو او بادشاہے بر تخت گاہِ دہلی جلوہ نکند۔" (۴۴۰)

ایک قابل منتظم اور انصاف پسند بادشاہ ہونے کے علاوہ سلطان غیاث الدین تغلق ایک متدین مسلمان تھا۔ وہ خود بھی ارکانِ شریعت کا پابند تھا اور خلجیوں کے زمانے میں جو مذہبی بدعنوانیاں شروع ہو گئی تھیں ان کی اُس نے اور اس کے جانشینوں نے اصلاح کی۔ لیکن افسوس ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین دہلوی سے اس کے تعلقات شروع ہی سے کشیدہ ہو گئے۔ اس بدمزگی کی بنا تو اُس وقت پڑی جب تختِ شاہی پر بیٹھنے کے بعد سلطان نے بیت المال کو دوبارہ اُستوار کرنا شروع کیا۔ جب غازی ملک کی فوج دارالسلطنت کے قریب پہنچی تھی تو خسرو نے نہ صرف سپاہ کو تین سال کی تنخواہ پیشگی دی تھی بلکہ دہلی کے بااثر فقرا اور مشائخ سے حصولِ دُعا کے لیے خطیر رقمیں ان کی خدمت میں بطور نذر کے بھیجیں۔ ان میں سے تین بزرگوں (یعنی سید علاء الدین، شیخ وحید الدین خلیفہ شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج اور شیخ عثمان سیاح خلیفہ شیخ رکن الدین) نے تو اس بدکار اور اسلام کش بادشاہ کی نذریں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بعض نے لے کر رکھ لیں اور جب غیاث الدین تخت نشین ہُوا تو اسے رقمیں واپس کر دیں۔ حضرت سلطان المشائخ کو خسرو نے پانچ لاکھ تنکے بھیجے تھے۔ جب تغلق نے

ان سے اس رقم کی واپسی کی خواہش کی تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے جو کچھ ملا تھا وہ میں نے[1] اُسی وقت خیرات کر دیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں۔ یہ معاملہ تو اس پر ختم ہو گیا لیکن عجب نہیں کہ بادشاہ کو اس واقعہ کا ملال رہا ہو۔

اس کے بعد بعض لوگوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ شیخ نظام الدین سماع کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیتے۔ اور سرود' جو مذہب حنفیہ میں حرام ہے' سنتے ہیں۔ بادشاہ کو واجب ہے کہ علما کا ایک محضر منعقد کرے۔ چنانچہ بادشاہ نے سربرآوردہ علما کو بُلایا۔ اور سماع کے مسئلہ پر بحث ہوئی۔ اس محضر نے سماع کے خلاف فتویٰ نہ دیا۔ اور جب (بقول فرشتہ) حضرت سلطان المشائخ نے سماع کے جواز میں ایک حدیث (جو فی الواقع حدیث بھی نہ تھی) پڑھی تو بادشاہ قائل ہو گیا۔ بلکہ نظامی تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس نے قاضی شہر کو جو حضرت شیخ کے مخالفین میں پیش پیش تھا' معزول کر دیا۔

ایام حکومت کے اخیر میں سلطان کو بنگالہ کا سفر پیش آیا وہ اس سفر سے واپس آرہا تھا کہ دہلی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک چوبی محل میں' جو اس کے بیٹے اُلغ خاں نے اس موقع پر تیار کروایا تھا قیام کیا۔ دوسرے روز روانگی سے پہلے کھانا کھا رہا تھا کہ یہ محل جو بہت عجلت میں تیار ہوا تھا' گر پڑا اور بادشاہ اس کے نیچے دب کر مر گیا۔

اس واقعہ پر طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کی گئی ہیں۔ بعض مورخ الغ خاں کو جو بعد میں سلطان محمد بن تغلق کے نام سے بادشاہ ہوا۔ اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کی موت ایک اتفاقی حادثہ سے ہوئی۔ آج یقین سے

---

[1] اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ نظامی تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ لکھنوتی سے آرہا تھا تو اس نے حضرت سلطان المشائخ کو کہلا بھیجا کہ میرے دہلی پہنچنے تک آپ دہلی سے چلے جائیں اور شیخ نے جواب دیا کہ دیکھ لیں گے۔ "ہنوز دہلی دور است"۔ نظامی حضرات تو اس

(باقی اگلے صفحے پر)

اس مسئلہ پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کی موت اتفاقی تھی۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ محل بادشاہ کی اپنی خواہش پر تیار کیا گیا تھا

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۳۹۸)

مبینہ پیام و جواب کی بنا پر بادشاہ کی موت کو حضرت سلطان المشائخ کی کرامت قرار دیتے ہیں۔ اور یورپین مصنف کہتے ہیں کہ باپ کو ہلاک کرنے کے لیے الغ خاں نے جو سازش کی تھی، اس میں سلطان المشائخ شریک تھے۔

ہمیں یہ روایت سرے سے ہی مشتبہ اور غیر اغلب معلوم ہوتی ہے۔ وجوہات بالاختصار یہ ہیں۔ (۱) بعد کے مورخوں نے اس واقعہ کو "مشہور است" (بدایونی) کے عنوان سے نقل کیا ہے اور اسے ایک مشہور افواہ سے زیادہ وقعت دینا ٹھیک نہیں۔ معتبر ہمعصر مورخین اس واقعہ کی نسبت بالکل خاموش ہیں۔

(۲) بادشاہ کے حضرت شیخ کی خدمت میں عتاب آمیز پیغام بھیجنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ جب بادشاہ نے خسرو کا عطیہ واپس نہ کرنے پر اور سماع کے معاملے میں بھی حضرت سلطان المشائخ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا (حالانکہ خسرو کے عطیہ واپس لینے کے لیے جو سختی اس نے بسا اوقات کی تھی، اس کی تاریخ گواہ ہے) تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایسے موقع پر جب وہ خود دارالخلافے سے باہر ہو بلا کسی معقول وجہ کے سلطنت کے سب سے بااثر شیخ سے بگاڑ کر اپنے لیے مشکلیں اور خطرے پیدا کرے۔

(۳) ابن بطوطہ نے جو سلطان کی وفات کے نو سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے شیخ رکن الدین ملتانی کی زبانی اس واقعہ کی سب سے زیادہ تفصیلات دی ہیں، سلطان اور حضرت شیخ کی لفظی چپقلش کے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا۔ وہ کہتا ہے کہ ایک منجم نے کہا تھا کہ بادشاہ اس سفر سے واپس نہیں آئے گا۔ لیکن سلطان المشائخ کے الغ خاں کے متعلق ایک مدد ارشادات دینے کے باوجود اس نے کہیں بادشاہ کی دھمکی یا حضرت کے جواب کا ذکر نہیں کیا۔

(۴) برنی جو اس زمانے میں زندہ موجود تھا اور حضرت شیخ کا پرجوش معتقد تھا ایک لفظ نہیں لکھتا۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کے متعلق انگریزی میں ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے اس میں

(باقی اگلے صفحے پر)

اور مقصد یہ تھا کہ بادشاہ یہاں آرام کرنے کے بعد شاہانہ جلوس کے ساتھ دارالخلافہ میں داخل ہو۔ چونکہ یہ عمارت تین روز کی مدت میں بڑی عجلت کے ساتھ مکمل ہوئی تھی۔ اور محل تھا بھی لکڑی کا اور کاٹھ کے ستونوں پر قائم تھا۔ اس لیے اس میں کوئی ایسی خامی رہ گئی، جس سے جب ذرا سا دباؤ پڑا ساری عمارت دھم سے گر گئی۔

سلطان غیاث الدین کی وفات کسی بھی وجہ سے ہو، اسلامی ہندوستان کے لیے وہ ایک مصیبتِ عظمیٰ تھی۔ اور سلطان کی وفات کے ساتھ اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ علاءالدین خلجی نے جو علاقے فتح کیے تھے، وہ ابھی تک دہلی کے تابع تھے۔ اور سلطان غیاث الدین نے اپنے حسنِ انتظام سے بنگال اور دکن، ہر طرف پورا قابو رکھا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق فرمانروا ہوا۔ جس کے عہدِ حکومت میں بغاوتیں شروع ہوئیں۔ کئی صوبے دہلی سے آزاد ہو گئے۔ اور سلطنتِ دہلی وسیع ہونے کی بجائے کمزور ہونی شروع ہوئی بقول صہبائیؔ ؎

رفتم وازرفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے برنیؔ لکھتا ہے:

"واز مردنِ سلطان تغلق از روئے معنی جہان را خرابی روئے نمود ؎

(بقیہ نوٹ از صفحہ ۳۹۹)

اُنھوں نے اس حکایت کے متعلق شک و شبہ ظاہر کیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ دی ہے کہ اس درجہ عداوت کے اظہار کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت سلطان المشائخ اس زمانے میں قریباً بچانوے سال کے تھے۔ اور سات ماہ سے ایک تکلیف دہ مرض میں مبتلا تھے۔ ایسی حالت میں ان کا کسی کشمکش یا مباحثہ میں حصہ لینا یا بلا ضرورت کسی دوسرے کو شکایت و عداوت کا موقع دینا بہت مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد
واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد
ہم پیکر سلامت وہم نفس عافیت
از دیدۂ نظارہ کناں در حجاب شد
افلاک را لباس مصیبت بساط گشت
اجرام را دقایۂ ظلمت نقاب شد"

سلطان محمد بن تغلق

سلطان غیاث الدین کی وفات پر محمد بن تغلق حکمران ہُوا۔ یہ بادشاہ مورخین کے لیے ایک معمہ ہے۔ وہ قرآن مجید کا حافظ تھا۔ نماز روزہ کا بڑا پابند تھا۔ عربی فارسی میں بہت اعلےٰ خطوط لکھتا تھا۔ اس کے سیاسی مسلک کی نسبت ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:۔

"وہ اپنے مذہب کی پوری پیروی کرتا اور اس کی خانگی زندگی بے عیب تھی۔ وہ متعصب ہرگز نہ تھا۔ تنگ نظر فقہا کی رائے کو بہت اہمیت نہ دیتا تھا۔ اور ہندوؤں کے ساتھ اس نے رواداری کا سلوک کیا۔ اس نے ان کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اور رسم ستی کو موقوف کرنا چاہا۔ ایک ہندو کو اس نے سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ اور دوسروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔"[1]

اس کی قابلیت اور جدتِ طبع سب کے نزدیک مسلّم ہے لیکن اس کے باوجود اس سے ہندوستان کو نقصان زیادہ ہوا اور فایدہ کم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو بات اس کے دل میں بیٹھ جاتی اسے پورا کرنے کے لیے وہ انتہائی شدت سے کام لیتا حتیٰ کہ کبھی ظلم اور کبھی احمقانہ افعال پر اُتر آتا۔ اس نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو دارالخلافہ بنانا چاہا۔ کیونکہ دولت آباد زیادہ مرکزی[2] جگہ تھی۔

---

[1] مختصر تاریخ اہلِ ہند (انگریزی) از ڈاکٹر تارا چند ص ۱۷۲-۱۷۳

[2] ڈاکٹر مہدی حسین نے اپنی کتاب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے رسالہ برہان دہلی کے ایک پُر از معلومات مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمد بن تغلق دیوگیر کو اسلام کا مرکز بنانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکیں۔

(برہان مارچ ۱۹۴۶ء)

اور وہاں سے سارے ملک کا انتظام یقیناً آسان تھا۔ مگر اس ارادے کی تکمیل کے لیے اہلِ دہلی پر اس نے بڑے مظالم ڈھائے۔ اور بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو مجبور کیا کہ وہ کالے کوسوں کا فاصلہ طے کر کے دولت آباد جائیں۔ بعض کے ساتھ بڑی سختیاں کیں۔ اسی قسم کے اور کئی احکام اس نے جاری کیے۔ چنانچہ بدایونی لکھتے ہیں:

"از افراطِ ظلم و تعدی سلطان کہ در اعتقادِ او عدل بود، ملک برباد شد۔"

سلطان محمد تغلق کے نیم پخت منصوبوں سے نہ صرف عامۂ خلائق کو تکلیف ہوئی بلکہ ملک میں عام بدنظمی پھیل گئی۔ اور کئی صوبے دہلی کے اقتدار سے رہا ہو گئے۔ معبر، دھور سمندر اور تلنگانہ کا کچھ حصہ تو اسلامی حکومت سے اس طرح آزاد ہوا کہ پھر اسے فتح کرنا مسلمانوں کو نصیب نہ ہوا۔ وجے نگر کی وسیع سلطنت کی بنیاد بھی محمد تغلق کے آخری ایام میں رکھی گئی۔ اور اس سلطنت نے جنوب کی طرف دہلوی حکومت کے مقابلے میں کئی سو سال تک ایک فصیل کا کام دیا۔ بہمنی سلطنت اور بنگال کی خود مختار حکومت کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوا۔ اور حکومتِ دہلی کا دائرہ اثر سلطان علاءالدین خلجی کے زمانے کی نسبت بہت مختصر ہو گیا۔

سلطان محمد تغلق نے ملک کی سیاسی حالت پر گہرا اثر ڈالا لیکن جو تبدیلیاں اس کی وجہ سے مذہبی نظام، بالخصوص مشائخ و صوفیہ کے اثر و رسوخ میں ہوئیں، وہ بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ اس کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں صوفیائے کرام کا بڑا اثر تھا۔ ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ اور جو بادشاہ دل سے ان کے معتقد نہ تھے، انھیں بھی ملکی مصلحت کے ماتحت ان کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ بعض خوش عقیدہ بادشاہ اور ان کے امرا تو کرامتِ اولیا کے پوری طرح قائل تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے فقرا و مشائخ کو ناخوش کیا تو زوال و ادبار کا شکار ہو جائیں گے۔ سلطان علاءالدین خلجی سے زیادہ صاحب سطوت بادشاہ کون سا ہو گا۔ لیکن مورخین (مثلاً برنی) لکھتے ہیں کہ جب ورنگل

سے اس کی فوجیں دیر تک نہ لوٹیں اور نہ ہی ان کی کوئی خبر آئی تو بادشاہ نے متردد ہو کر سلطان المشائخ کی خدمت میں قاصد بھیجا۔ علاء الدین ایک لامذہب اور خودسر بادشاہ تھا۔ مذہبی بزرگوں کا اس کے دل میں اس طرح احترام نہ تھا جس طرح سلطان التمش اور بعض دوسرے بادشاہوں اور ارکینِ سلطنت کے دل میں۔ لیکن پھر بھی اس نے مذہبی راہنماؤں کا بڑا پاس کیا۔ حضرت سلطان المشائخ سے اس نے کئی دفعہ ملنے کی خواہش کی۔ لیکن حضرت نے کہلا بھیجا کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہُوا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔ اس جبار اور قہار بادشاہ نے نہ صرف اس جواب سے بُرا نہ مانا بلکہ حضرت کی خواہشات کا احترام کیا۔ اور ان سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا۔ ملتان کے شیخ رُکن الدینؒ کی خدمت میں اس نے کئی لاکھ تنکے نذر کیے۔ اس کا اپنا بیٹا اور ولی عہد خسرو خاں حضرت سلطان المشائخ کا مُرید تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے کا ہم گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں وہ ہندوستان میں صوفیہ کا عہدِ زرّیں تھا۔ عوام بلکہ خواص سمجھتے تھے کہ سیاہ و سفید کی کنجی خدارسیدہ اہلِ دل کے پاس ہے انھیں سے اظہارِ عقیدت کر کے اپنا دین و دُنیا ٹھیک کرنا چاہیے۔ یہ زمانہ خوش اعتقادی اور انجذاب کا تھا۔ علم صحیح معنوں میں عام نہ ہُوا تھا۔ اور اس کی تھوڑی بہت جو کرنیں پڑتی تھیں، وہ بھی زیادہ تر صوفیہ کی مجلسوں کو روشن کرتیں۔ سلطان المشائخ نہ صرف روحانیت اور تقدّس کے سمندر تھے بلکہ علم و فضل میں بھی شہرۂ آفاق تھے اور وقت کے بہترین شاعر امیر خسرو بہترین مورّخ ضیاء الدین برنی اور بہترین عالم (مثلاً مولٰنا فخر الدین زرادی) ان کے عقیدت مند تھے۔

صوفیہ، بالخصوص حضرت سلطان المشائخ کا اثر اس قدر زیادہ تھا اور خاص و عام کے دلوں پر ان کی اس طرح حکومت تھی کہ بہت سے بادشاہوں کو اس کا ملال ہوتا ہوگا۔ اور بعضوں نے یہ اثر توڑنے کی کوشش کی۔ ہم علاء الدین کے بیٹے

قطب الدین مُبارک شاہ کا ذکر کر چکے ہیں کہ اس نے ملتان سے شیخ رکن الدین کو بلایا تاکہ حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ کے بالمقابل ایک اور بزرگ کی بارگاہ قائم ہو۔ اور ان کا اپنا زور کم ہو۔ سلطان قطب الدین کی یہ کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ لیکن جب سلطان المشائخ کا انتقال ہو گیا اور سلطان محمد بن تغلق تخت نشین ہوا تو اُس نے اپنی تمام کوششیں مشائخ کا اثر کم کرنے میں صرف کیں۔ اور نہایت استقلال اور باقاعدگی سے ان کا شیرازہ اس طرح منتشر کیا کہ اگرچہ بعد میں گاہے گاہے بڑے صاحبِ سطوت بزرگ ہوئے ہیں اور بعض بادشاہانِ وقت نے ان سے بڑی عقیدت مندی دکھائی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو سلطان المشائخ کی طرح بادشاہِ وقت کا مدِ مقابل گنا جا سکے۔ اور صوفیہ کا عہدِ زرّیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

صوفیہ کا اثر کم کرنے کے لیے اور انھیں علانیہ حکومتِ ظاہری کے تابع لانے کے لیے سلطان محمد تغلق نے ایک بڑا اقدام یہ اُٹھایا کہ انھیں اپنی بخ کی خدمتیں سپرد کیں۔ اور جو کوئی ان سے گریز کرتا اُس سے ہر طرح کی سختی کی جاتی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان محمد تغلق بادشاہ ہوا تو اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مشائخ اور عالموں کو اپنی بخ کی خدمتیں سپرد کرتا تھا۔ اور یہ دلیل لاتا تھا کہ خلفائے راشدین سوائے اہلِ علم اور اہلِ صلاح کے کسی کو کوئی خدمت سپرد نہ کرتے تھے سب سے بڑا وار اس نے سلطان المشائخ کے جانشین حضرت چراغ دہلیؒ پر کیا۔ انھیں اپنی جامہ داری اور کپڑے پہنانے پر مقرر کیا۔ اُنھوں نے انکار کیا تو انھیں جیل خانے میں ڈال دیا۔ حضرت چراغ دہلی کو اس وقت یاد آیا کہ مرتے وقت انھیں مرشد نے ہدایت کی تھی کہ تمھیں دہلی میں رہ کر خلق کا ظلم و ستم برداشت کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے سلطان کے ناگوار حکم کو مان لیا۔ فرشتہ لکھتا ہے :-

"نقل است کہ بادشاہ محمد تغلق شاہ کہ بواسطہ بسیاری قتل و سیاست اورا خونی مے گفتند۔ با درویشان سوء مزاج بہم رسانیدہ حکم کرد کہ درویشان بطوق

خدمتگاران خدمتے نمایند۔ پس یکے مرا تنبول (پان) خوراند۔ دیگرے دستار بندد
الغرض بسے مشائخ را خدمتے مقرر کرد۔ شیخ نصیر الدین اودھی المشہور بہ
چراغ دہلی را تکلیف جامہ پوشانیدن نمود۔ شیخ قبول نہ کردہ کار بخشونت کشید
چنانچہ شیخ را قصاداده محبوس ساخت و شیخ راسخن پیر خود شیخ نظام الدین اولیا
بیاد آمدہ ناچار قبول آں خدمت کردہ از بند نجات یافت[1]

مشائخ کبار کو اپنی نجی خدمت سپرد کرنے سے سلطان کا ایک مقصد تو ان کا مرتبہ کم کرنا تھا۔ اور دُوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہیں تو انھیں اپنا نظام قائم کرنے اور اثر بڑھانے کا موقع نہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت چراغ دہلی ایک عرصے تک اس کے ساتھ رہے اور جب وہ ٹھٹھہ میں مر گیا تو اس وقت بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔

مشائخ کو خدمتیں سپرد کرنے کے علاوہ سلطان نے اس امر کی بڑی کوشش کی کہ انھیں دار السلطنت سے منتشر کر دیا جائے۔ بعضوں کو تو اس نے معتوب کر کے دہلی سے نکال دیا (مثلاً شیخ ضیاء الدین سمنانی کو) اور دوسروں کو دلیل و برہان سے دوسری جگہ جانے کی تلقین کی۔ حضرت سلطان المشائخ کے ایک مشہور خلیفہ مولنا شمس الدین یحییٰ تھے، جو علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ شہر دہلی کے بیشتر علما ان کے شاگرد تھے۔ اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے انھیں بُلا بھیجا۔ اور کہا کہ تمھارے جیسا عقلمند دہلی میں کیا کرتا ہے۔ تمھیں تو چاہیے کہ کشمیر جاؤ اور وہاں کے بُت کدوں میں بیٹھ کر خلقِ خُدا کو اسلام کی دعوت دو۔ مولنا نے واپس آکر سفر کی تیاری شروع کی، لیکن اس دوران میں ان کے سینے پر پھوڑا نکل آیا۔ بادشاہ کو خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ مولنا کو میرے سامنے لاؤ۔ تاکہ میں دیکھوں کہ بہانہ تو نہیں کرتا۔ لیکن اس دوران میں مولنا کا

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم صر ۳۹۹

انتقال ہوگیا۔ اور وہ کشمیر نہ جا سکے[1]۔

اسی زمانے میں ایک بڑے صاحبِ صدق بزرگ گزرے۔ شیخ شہاب الدین حق گو۔ وہ شیخ الاسلام احمد جام کی اولاد میں سے تھے۔ اور بعض انھیں شیخ زادہ جام بھی کہتے تھے۔ وہ حضرت سلطان المشائخ کے مخالف تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑے صاحبِ صدق و صفا بزرگ تھے۔ اور حق گو کا جو خطاب انھیں زبانِ خلق سے ملا ہوا تھا' اس کے وہ ہر طرح مستحق تھے۔ بادشاہ نے ان سے بھی خدمت لینی چاہی' لیکن انھوں نے انکار کیا۔ اس پر حکم ہوا کہ ان کی ڈاڑھی نوچی جائے۔ بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ لیکن شیخ زادہ نے پھر بھی ان کی خدمت قبول نہ کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ ان کا معتقد ہو گیا۔ پھر مخالف ہوا۔ اور انھیں اپنے ایک امیر کے ہاتھ بلا بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہ کروں گا۔ امیر نے یہ الفاظ بادشاہ کے پاس جا کر دہرا دیے۔ بادشاہ بڑا خفا ہوا۔ اور حکم دیا کہ شیخ کو زبردستی پکڑ لائیں۔ چنانچہ وہ لائے گئے۔ بادشاہ نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کے پاس فریاد کی کہ شیخ ایک بادشاہِ عادل کو ظالم کہتا ہے' اس پر حدِ شرعی جاری ہونی چاہیے۔ شیخ بھی بلائے گئے۔ انھوں نے بادشاہ کو ظالم کہنے کا اقرار کیا اور اس کے ظلم کی کئی مثالیں دیں۔ بادشاہ اس پر اور بگڑا اور انھیں بڑی اذیت اور اہانت سے مروا ڈالا[3]۔

بادشاہ کی اس پالیسی اور ظلم و تشدد کا یہ اثر ہوا کہ دہلی میں صوفیہ و مشائخ کا

---

[1] ملاحظہ ہو سیر الاولیا ص ۲۰۰

[2] سیر الاولیا میں سلطان المشائخ کے دوسرے مریدوں کے ساتھ بادشاہ کی کشمکش کی مثالیں دی گئی ہیں۔ (مثلاً ص ۲۳۱ پر شیخ قطب الدین منور' ص ۲۳۸ پر مولنا فخر الدین زرادی کے ساتھ بادشاہ کی جھڑپ کا ذکر ہے) [3] ملاحظہ ہو ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۱۳۴ (نفیس دہلی)

زور بہت کم ہو گیا۔ بعض کو اس نے مُلک کے دُور دراز حصّوں میں بھیج دیا اور بعض واقعات کا یہ رنگ دیکھ کر خود بخود چلے گئے۔ اس کے بعد سلطان فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں حالات کسی قدر بہتر ہوئے۔ لیکن فیروز مشائخ سے زیادہ علماء و فقہا کا قائل تھا۔ اور اس کے زمانے میں تصوّف سے زیادہ شریعت کا رواج ہُوا۔ چونکہ اس کے بعد حکومت دہلی بالکل کمزور ہو گئی۔ اور تیمور کے حملے سے رہا سہا دم بھی نکل گیا۔ مشائخ دہلی کا بکھرا ہُوا شیرازہ پھر نہ بندھ سکا۔

سلطان محمدؒ تغلق نے صوفیہ کی اس حد تک جو مخالفت کی ہے، اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے۔ ایک وجہ تو سیاسی ہو گی یعنی شاہی اقتدار بڑھانے کے لیے صوفیہ کا اقتدار گھٹانا۔ لیکن نظامی مورخین کے نزدیک بڑی وجہ بادشاہ کے اپنے معتقدات تھے۔ برنی جو ایک باقاعدہ صوفی اور روحانی معاملات میں اصلاحی طبقے کے خلاف قدامت پسند گروہ کا ترجمان تھا، لکھتا ہے :-

اس بادشاہ کو عنفوانِ شباب میں، جب فہم و ادراک کا آغاز ہوتا ہے۔ بدمذہب سعدِ منطقی[1] اور بد اعتقاد عبید شاعر کے ساتھ صحبت و مجالست کا اتفاق ہُوا اور مولٰنا علم الدین جو فلسفہ کے سب سے بڑے عالم تھے، بہت عرصہ تک بادشاہ کی خلوت میں آتے جاتے رہے اور وہ نابجواں مرد، جو مرضِ معقولات میں مُستغرق اور مُبتلا تھے۔ اپنی گفتگو اور مباحثہ اور نشست و برخاست کے دوران میں علمِ معقولات کو جو مذہب اہلِ سنت والجماعت سے بے اعتقادی کا ذریعہ اور نبوّت کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نقطوں کی تنبیہات و تحذیرات کے ضعف و نااُستواری کا سبب ہے۔ سلطان محمدؒ کے دل میں اس طرح پختہ کر دیا کہ منقولات کتبِ سماوی اور احادیثِ انبیا کے لیے، جو ایمان کا سرمایۂ اسلام کے ستون،

[1] یہ سعد منطقی وہی ملک سعد الدین ہے، جو ایک زمانے میں حضرت سلطان المشائخؒ کا رفیقِ مجلس تھا۔ اور جس نے سلطان علاء الدین خلجی کو مولٰنا شمس الدین ترک کے اس اصلاحی فارسی رسالے کی اطلاع دی تھی جسے بعض امرا نے روک رکھا تھا۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۹)

مسلمانی کا خزانہ اور منبع نجات و درجات ہیں اس کے دل میں کما حقہ جگہ نہ رہی اور جو کوئی چیز معقولات کے خلاف ہوتی وہ اُسے نہ تو سُنتا اور نہ ہی قبول کرتا اگر معقولاتِ فلسفہ سلطان محمد تغلق کے دل کو احاطہ نہ کر لیتے اور منقولاتِ آسمانی سے اس کو پورا ذوق و شوق ہوتا تو وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور اوصاف کے باوجود ہرگز ایسا نہ کرتا کہ خدائی اور نبوی احکام کے باوجود اور انبیا اور علما کے ارشاد کے خلاف مسلمانوں کے قتل کا حکم دیتا۔ لیکن چونکہ معقولاتِ فلاسفہ نے جو قساوت و سنگدلی کا ذخیرہ ہیں اس کے دل پر پورا قبضہ کر لیا تھا اور منقولات کتب سماوی اور احادیث نبوی کے لیے جو رقت اور مسکینت پیدا کرتی ہیں اور آخرت کا خوف دلاتی ہیں۔ اس کے دل میں کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی سزا دہی اور کلمہ گویوں کا قتل اس کی طبیعتِ ثانیہ ہو گئی اور یہ جو اس نے اس تعداد میں علما و مشائخ، سادات و صوفیا، قلندروں منشیوں اور سپاہیوں کو سزا دی، اس کا باعث علمِ معقولات کے بُرے اثرات اور علمِ منقولات کی کمی تھی (ترجمہ از تاریخ فیروز شاہی ص ۶)

فرشتہ بھی محمد تغلق کی نسبت لکھتا ہے:۔

"نیز وہ اپنا اکثر وقت فلسفیوں کی معقولات میں صرف کرتا... اور روایات و نقلیات میں سے اسی چیز کی تصدیق کرتا جو عقلیات کے مطابق ہوتی"

فرشتہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"نیز اکثر اوقات خویش را صرفِ معقولات فلاسفہ ساختے .... و از نقلیات آنچہ تطبیق آن بہ عقلیات متصور بودے تصدیق کردے"

سید گیسو دراز کے ملفوظات میں بھی سلطان محمد تغلق کی مذہبی باقاعدگی پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کی ایک بیان کردہ روایت کے مطابق محمد تغلق بھی علاء الدین خلجی کی طرح ایک نئے مذہب کی بنا ڈالنا چاہتا تھا۔ حضرت سید گیسو دراز سلطان علاء الدین خلجی کے پیغمبری دعووں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں[1]:۔

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۷۵

"اور سلطان محمد تغلق کو بھی اسی طرح کے فضول خیالات اُکساتے رہتے تھے۔ ہمارے مُرشد کے خواہرزاد بھائی مولنا کمال الدین فرماتے تھے۔ میں ایک مرتبہ قتلق خان کے بھائی شمس الدین کے پاس بیٹھا ہُوا بزودی کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اتنے میں قتلق خان کی (بادشاہ کے حضور میں) طلبی ہوئی شمس الدین کہنے لگا کہ آپ لوگ یہیں بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ گھڑی بھر کے بعد وہ واپس آیا تو کہنے لگا کہ اس وقت خان نے عجیب قصہ سُنایا۔ اور خان کی زبانی کہنے لگا کہ اس وقت غیر معمولی طور پر میری بادشاہ کے ہاں طلبی ہوئی۔ میں گیا۔ دیکھا کہ وہ اپنا مُنہ شمع کی روشنی سے موڑ کر اندھیرے میں بیٹھا ہُوا ہے۔ مَیں پہنچا اور حسبِ معمول تعظیم بجالایا اور خود بھی اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ لیکن دل میں سوچ رہا تھا کہ بادشاہ میرے بھائی یا کسی دوسرے قرابت دار کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ فوری طور پر مجھے اس کے متعلق کہنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تامل کر رہا ہے۔

یکایک بادشاہ نے کہنا شروع کیا کہ "فرض کرو کہ آج کوئی آدمی اُٹھ کر یہ کہے کہ معاذ اللہ محمدؐ پیغمبر نہ تھے تو ہم اور تم کس دلیل سے اسے قائل کریں گے؟" میں نے دل میں سوچا کہ اگر میں نے اس کے ساتھ بحث شروع کی تو یہ بھی بحث کرے گا۔ بات بڑھ جائے گی۔ بہتر ہے کہ میں کوئی ایسی بات کہوں کہ وہ جان لے کہ پھر اس کو یہ سلطنت میسّر نہ آئے گی۔ چنانچہ میں نے فوراً کہا کہ ایسے حرام زادے، دیوانے، احمق، بدبخت، کے لیے دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت بادشاہ کے اقبال سے مُلک اور شہر میں اسلام نے اس طرح اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ بادشاہ کے غلام اسے جوتیاں مار مار کر فنا کر دیں گے۔ جب اُس نے یہ سُنا تو سر جھکا لیا اور جواب میں کچھ نہ کہا۔ مولنا شمس الدین نے کہا کہ میں نے خان سے پُوچھا کہ اگر یہ بدبخت کوئی اس طرح کی بات ظاہر کرے تو تم کیا کرو گے۔ وہ بولا کہ خدا کی قسم! سب سے پہلے جو آدمی اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گا تو وہ مَیں ہوں گا۔ بادشاہ جس طرح قتلق خان کی تعظیم کرتا تھا اسی طرح ملک منصور اور اس کے باپ کی بھی

تعظیم کرتا تھا۔ ایک بار اس سے یعنی ملک منصور سے کہنے لگا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضرت عثمان غنی رضؓ اور حضرت علی رضؓ نے کیا کیا ہے جو ہم نہیں کر سکتے[1]۔ ملک منصور کہنے لگا کہ وہ پاک لوگ تھے اور ہم پلید ہیں . . . .
اور اسی وجہ سے محمدؐ بن تغلق مشائخ اور علما، سادات اور اہلِ دین کو قتل کرواتا تھا۔ کہ یہ لوگ جن کے دل میں دین کا احترام ہے انھیں ختم کر دوں اور نو مذہب غلاموں کو جو فی الحقیقت ہندو ہی ہیں، اپنے گرد جمع کروں تاکہ جو کچھ میں کہوں، وہ اس سے انکار نہ کریں۔ لیکن یہ بھی اسے نصیب نہ ہوا۔ پیشتر اس کے کہ وہ ان ارادوں میں کامیاب ہوتا وہ دوزخ میں چلا گیا!" (ترجمہ از جوامع الکلم ص ۱۷۵)

صوفیہ اکابر و تذکرہ نویسوں نے سلطان محمدؐ تغلق پر بڑے الزام لگائے ہیں[2]۔ اور اس کی نسبت ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے اس کی راسخ الاعتقادی کی

---

[1] ایک اسی طرح کی روایت شیخ عبد الحق محدث نے نقل کی ہے۔ اخبار الاخیار میں مخدوم مولانا عماد الدین غوری کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ "واین مولانا عماد از اولادِ آن مولانا عماد است کہ در زمان محمدؐ تغلق بود۔ مے گویند کہ محمدؐ تغلق در ایام غرورِ سلطنت خود گفتہ بود کہ فیضِ خدا منقطع نیست۔ چرا باید کہ فیضِ نبوت منقطع باشد و اگر کسے حالا دعوائے پیغمبری بکند و معجزہ نماید، تصدیق کنید یا نہ؟ مولانا عماد بر خود گفت کہ کہ مخور۔ چہ میگوئی۔ محمدؐ تغلق حکم کرد کہ اورا ذبح کنند و زبانش برآرند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ص ۲۰۰ - ۲۰۱)

[2] لیکن تاریخی شواہد سے محمدؐ بن تغلق کے غیر راسخ رجحانات کی ضرور تائید ہوتی ہے۔ برٹش میوزیم میں طبقاتِ ناصری کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے۔ اس میں چند اوراق ایسے ہیں جو محمدؐ بن تغلق کی خود نوشت سوانح عمری کے گزشتہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں حکمائے فلسفہ سے نشست و برخاست اور ملحدانہ رجحانات کا اعتراف ہے۔ (ملاحظہ ہو اس موضوع پر ڈاکٹر سید مہدی حسین کا مضمون) اس کے علاوہ جین مت والوں کی قدیم نظموں میں بھی محمدؐ تغلق کا بعض مشہور جین سادھوؤں اور راہبوں کو بلا انصاف والی سے بڑی عزت کے سلوک کا ذکر ملتا ہے۔ فتوح السلاطین کا مصنف عصامی بھی اس کی پوری پوری تائید کرتا ہے۔

نسبت شبہے پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ محمد تغلق نے زیادہ تر صوفیہ کو آزار پہنچایا اور علما اس کے دستِ تشدد سے بالعموم محفوظ رہے۔ نماز پڑھنے کی وہ بڑی سختی سے تاکید کیا کرتا تھا۔ اور خود پانچ وقت نماز ادا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ سلطان کے دربار میں شیخ عبدالعزیز الاردویلی کی آمد سلطان کی طرف سے ان کی تعظیم و تکریم کا ذکر کرتا ہے۔ یہ شیخ عبدالعزیز دمشق میں مشہور قاطع بدعت اور مخالفِ تصوف بزرگ علامہ ابنِ تیمیہؒ کے شاگرد رہ چکے تھے اور عجب نہیں کہ مشائخ کے خلاف جو کوششیں سلطان کر رہا تھا انھیں شیخ عبدالعزیز کی آمد سے اور تقویت پہنچ گئی ہو۔ بلکہ شاید ان کوششوں میں علامہ ابنِ تیمیہ کی اس اصلاحی تحریک کو کچھ دخل ہو جو انھوں نے اسی زمانے میں شام اور مصر میں جاری کر رکھی تھیں۔ اور جس کی خبر ہندوستان میں مختلف ذرائع سے (مثلاً مولٰنا علم الدین کی وساطت سے جو مکہ و مدینہ و مصر و شام میں ایک زمانہ رہ کر ہندوستان لوٹے تھے۔ یا شیخ عبدالعز کی آمد سے) پہنچ گئی تھی۔

حضرت مخدوم نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ

جب حضرت سلطان المشائخ کا وقتِ رحلت قریب آیا تو آپ نے اپنے منتخب خلفا کو طلب کیا۔ مولٰنا برہان الدین غریب کو دستارِ خاص، شالِ خلافت، پیراہن اور مصلےٰ عطا ہوا۔ اور ارشاد ہوا کہ آپ ملکِ دکن میں تشریف لے جائیں اور فرائضِ ارشاد و ہدایت بجالائیں۔ یہی چیزیں شیخ یعقوب پٹنی رحمۃ اللہ علیہ کو عطا ہوئیں اور گجرات کی طرف روانگی کا حکم ہوا۔ مولٰنا شمس الدین یحییٰ کو دستار اور پیراہن اور اسی طرح بہت سے پارچہ جات دوسرے خلفا کو مرحمت ہوئے۔ یہاں تک کہ حضرت سلطان المشائخ کا بقچہ خالی ہو گیا اور کوئی کپڑا باقی نہ رہا۔ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی بھی حاضر تھے۔ انھیں کچھ نہ ملا۔ اور نہ ہی کچھ ارشاد ہوا۔ حاضرینِ مجلس متحیر و حیران تھے کہ شیخ نصیرالدین کس سبب سے محروم رہ گئے۔ لیکن چند روز کے بعد

حضرت نے شیخ کو طلب کیا اور خرقہ اور مصلےٰ اور تسبیح اور کاسۂ چوبیں (جو حضرت بابا فریدؒ سے آپ کو ملا تھا) انھیں عطا کیا۔ اور فرمایا "شمارا در شہرِ دہلی باید بُود و جفائے وقفائے مردم باید کشید[1]"

حضرت چراغ دہلیؒ کا صبرِ جمیل

حضرت سلطان المشائخ غیاث الدین تغلق کے زمانے میں سماع کے متعلق محضر کا واقعہ دیکھا تھا۔ اب ان کی چشمِ دُور بین نے اندازہ کر لیا کہ دہلی میں تصوّف کا عہدِ زرّیں ختم ہُوا اور اب آیندہ جو زمانہ آنے والا ہے۔ وہ ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے سجادہ نشینی کے لیے اس بزرگ کو منتخب کیا جو اس کانٹوں کے تاج کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ جس کے زہد و اتقا کے دوست اور دُشمن گواہ تھے اور جو تحمّل اور استقلال کا پہاڑ تھا۔ ہم سلطان محمدؒ بن تغلق کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں کہ اس نے حضرت چراغ دہلیؒ پر بڑی پابندیاں لگادیں اور ان سے ظالمانہ اور اہانت آمیز سلوک کیا۔ لیکن حضرت نے مُرشد کے زیرِ حکم یہ سب ظلم و ستم برداشت کیا اور بالآخر ان کا صبرِ جمیل ظالموں کی جبّاری و قہاری پر غالب آیا۔ جب محمدؒ بن تغلق دم توڑ رہا تھا اور اس کی جانشینی کا مسئلہ درپیش تھا۔ تو اس سوال کا فیصلہ کرنے والوں میں آپ پیش پیش تھے۔ اور فیروز تغلق سے تاج و تخت قبول کرنے کی درخواست کے لیے جو منتخب اکابر کا وفد پیش ہُوا، اس کے ترجمانوں میں آپ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے تاریخ فیروز شاہی کا مصنف عفیف لکھتا ہے :۔

"حضرت شیخ نصیر الدین نے سلطان فیروز شاہ کو پیغام دیا کہ تم وعدہ کرو کہ اپنے خلق سے مخلوق کے ساتھ عدل و انصاف کرو گے۔ ورنہ ان بکیس بندگانِ خدا کے لیے اللہ تعالےٰ سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے۔

---

[1] سیر الاولیا و سیر العارفین

سلطان فیروز نے جواب دیا کہ میں خلقتِ خدا کے ساتھ حلم و بردباری کروں گا
اور اتفاق و محبّت سے ان پر حکمرانی کروں گا ۔

حضرت شیخ نے جواب دیا کہ اگر تم خلقِ خدا کے ساتھ خلق و مروّت
کرو گے تو ہم نے بھی تمھارے لیے خدا سے حکومت طلب کی ۔"[1]

کون کہہ سکتا ہے کہ فیروز تغلق کے زمانے میں اسلام کو جو فروغ ہُوا اور خلقِ خدا کی آسائش کا انتظام ہُوا، ان سے عدل و انصاف اور حلم و مروّت کا سلوک ہُوا، اس میں آپ کو جنھوں نے فیروز تغلق کی تخت نشینی میں مدد دی تھی[2]۔ اور اس سے بہت کڑے طریقے سے عدل و انصاف کے وعدے لیے تھے کوئی حصّہ نہ تھا!!

مختصر حالات حضرت چراغ دہلی علاقہ اودھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے دادا خراسان سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے ۔ جہاں آپ کے والد شیخ محمد یحیٰ پیدا ہوئے۔ وہ پشمینہ کے بڑے تاجر تھے ۔ لاہور سے نقلِ سکونت کر کے اودھ میں چلے گئے ۔ آپ نو برس کے تھے کہ آپ کے والد انتقال کر گئے ۔ لیکن خاندانی حالت اچھی تھی۔ اور آپ کی والدہ نے آپ کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی ۔ علومِ ظاہری کی پوری تکمیل کے بعد آپ پچیس برس کی عمر میں کمالاتِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے ۔ اور بے حد ریاضت و مجاہدہ کیا ۔ سات برس تک ایک دو ساتھیوں کے ہمراہ (تاکہ نمازِ جماعت کا ثواب ضائع نہ ہو) آپ جنگلوں میں عبادت کرتے ۔ اور سنبھالو کے پتّوں سے اپنا روزہ افطار کرتے ۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ ۔ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ) ص ۲۵

[2] بدایونی لکھتا ہے کہ افواہ عامہ کے بموجب حضرت چراغ دہلی نے سلطان محمد تغلق کی زندگی میں ہی فیروز شاہ کو بادشاہ بنانے کی کوشش کی تھی اور اس لیے بادشاہ ۔ نے شیخ اور فیروز کی گرفتاری کا حکم دیا تھا ۔ معاصرانہ تواریخ اس افواہ کی تصدیق نہیں کرتیں ۔ لیکن حضرت شیخ اور فیروز تغلق کے قریبی تعلقات کا سب نے ذکر کیا ہے ۔

علومِ ظاہری کی تکمیل اور باطنی ترقی کی اکثر منزلیں طے کرنے کے بعد آپ تینتالیس ۴۳ سال کی پختہ عمر میں دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت سلطان المشائخؒ کے حلقۂ ارادت میں آئے۔ اس کے بعد دلی آرزوؤں اور ولولوں کا مرکز دہلی ہو گیا۔ شروع شروع میں اپنی بہن (شیخ کمال الدین علامہؒ کی خالہ اور آپ کے دوسرے خلیفہ شیخ زین الدین علی کی والدہ) کی ملاقات کے لیے آپ طویل وقفوں کے لیے وطن تشریف لے جاتے۔ لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو پھر آپ اپنے بھانجوں کو اپنے ساتھ دہلی لے آئے اور وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا[1]۔

حضرت سلطان المشائخؒ کی خانقاہ میں آپ کا وقت عبادت اور درویشوں کی خدمت میں گزرتا اور اپنے تقوے، پرہیزگاری اور خاموش ریاضت کی بدولت آپ نے مُرشد کے دل میں وہ جگہ پائی جو ان کے دوسرے مشہور مریدوں کو بھی میسر نہ تھی۔ مُرشد کی وفات کے بعد آپ اس کے جانشین ہوئے اور سلطان محمدؐ بن تغلق کے طوفانی عہد میں سلسلے کے کام کی حفاظت کی۔

پھر فیروز تغلق کا وقت آیا تو اگرچہ وہ آپ کا بڑا معتقد تھا[2] لیکن آپ زیادہ تر اللہ اللہ میں مصروف رہے اور اس کی تخت نشینی کے چند سال بعد وفات پا گئے۔

آپ کے خطاب چراغِ دہلی کی نسبت شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ مکّہ معظمہ میں حضرت شیخ عبداللہ یافعی مکّی اور حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے درمیان اولیائے دہلی

---

[1] ان حالات کے لیے ملاحظہ ہو خیر المجالس کا ترجمہ سراج المجالس مطبوعہ مسلم پریس دہلی، اور مونس الارواح مرتبہ شہزادی جہاں آرا کا ترجمہ (مطبوعہ لاہور)

[2] فیروز تغلق کا وزیر خان جہاں تلنگی بھی آپ کا عقیدت مند تھا۔ جب وہ حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہُوا تو مرشد سے عبادت وریاضت کی تفصیل پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ تم وزیر مملکت ہو تمھاری عبادت یہی ہے کہ حاجتمندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو۔ جب اس نے اوراد و وظائف کے لیے اصرار کیا تو فرمایا کہ جہاں تک ہو سکے باوضو رہو۔ اور اپنا کام اس طرح کرو کہ اسے ہی عبادت سمجھو۔

کی نسبت گفتگو ہوئی تو شیخ عبداللہ یافعی نے کہا کہ اگرچہ دہلی کے پرانے مشائخ کبار اُٹھ گئے ہیں، لیکن ان کا اثر شیخ نصیر الدین میں باقی ہے اور ان کی وجہ سے ابھی دہلی کا چراغ روشن ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے حج سے واپس آکر لوگوں سے شیخ عبداللہ یافعی کے اس بیان کا ذکر کیا، جس کی شہرت کے بعد آپ چراغ دہلی کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ (سیر العارفین ص ۱۵۶)

خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۳۵۳ پر لکھا ہے کہ مخدوم جہانیاں کے اس بیان پر حضرت امام عبداللہ یافعی دہلی آئے اور حضرت چراغ دہلی سے فیض یاب ہوئے۔ (سیر العارفین)

اشاعتِ اسلام حضرت چراغ دہلی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نہ صرف وہ اپنے صبر و استقلال سے زمانے کی تلخیوں پر غالب آئے بلکہ ان پابندیوں کے باوجود، جو سلطان محمد بن تغلق نے ان پر عائد کی تھیں، انھوں نے نظامی سلسلے کا کام درہم برہم نہ ہونے دیا۔ انھیں حضرت سلطان المشائخ کی وجیہہ شخصیت اور جلالی شان میسر نہ تھی، لیکن جہاں تک ارشاد و ہدایت اور اشاعتِ سلسلہ کا تعلق ہے، ٹھوس کام میں وہ اپنے مرشد سے پیچھے نہ رہے۔ حضرت سلطان المشائخ نے اطرافِ ملک میں خلفا بھیج کر ارشاد و ہدایت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، آپ نے اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ دکن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا جو مرتبہ ہے، اس سے خواص و عوام واقف ہیں۔ وہ حضرت چراغ دہلی کے خلیفۂ اعظم تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حسب الحکم دکن تشریف لے گئے۔ اسی طرح آپ نے اپنے بھانجے شیخ الاسلام شیخ سراج الدین کو خرقہ خلافت دے کر گجرات بھیجا۔ جہاں وہ مدتوں ہدایتِ خلق میں مشغول رہے۔ وہ خود تو آخیر عمر میں دہلی واپس آگئے، لیکن ان کے جانشینوں نے گجرات میں کام جاری رکھا اور ان کے خلیفہ اور فرزندِ بزرگ کا مزار گجرات کے سابق دار الخلافہ نہر والہ (پٹن) میں ہے۔

ترویجِ علم ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت چراغ دہلیؒ کے عقیدت مندوں میں

وقت کے سب سے بڑے فاضل اور عالم ہیں۔ عہدِ فیروز شاہی کے مشہور عالم تین بزرگ تھے۔ مولانا احمد تھانیسریؒ، مولانا خواجگیؒ اور قاضی عبدالمقتدر دہلویؒ۔ اور تینوں حضرت چراغ دہلیؒ کے خلفاے کبار میں سے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اشاعتِ علم اور ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے، خاندانِ تغلق اور خاندانِ سادات کے عہدِ حکومت میں حضرت چراغ دہلی اور ان کے معتقدین سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ اور اگر اس زمانے کو رُوحانی اور علمی نقطۂ نظر سے حضرت چراغ دہلی اور ان کے خلفا کا زمانہ کہیں تو بجا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قاضی عبدالمقتدر کے ضمن میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"وہ ہمیشہ درس دیتے تھے اور اشاعتِ علم میں مشغول رہتے اور شیخ نصیرالدین محمود اور ان کے اکثر خلفا کا یہی طریقہ تھا۔ شیخ کے پاس جو مُرید آتے انھیں علمی اشتغال اور حفظِ شریعت کی تلقین کرتے۔ اور فرماتے کہ ایک مسئلہ شرعی میں دیانتداری سے غور و خوض کرنا ریا اور غرور کی عبادتوں سے بہتر ہے۔ کہتے ہیں کہ قاضی عبدالمقتدر زمانہ طالب علمی میں شیخ کے پاس جاتے اور ان سے بحث کرتے۔ شیخ ان بحثوں کو پسند کرتے تھے۔ اور انھیں زیادہ علم حاصل کرنے کا شوق دلاتے تھے۔ بالآخر قاضی صاحب شیخ کے مُرید ہوئے اور علومِ ظاہری کے ساتھ نعمتِ باطنی سے فیضیاب ہوئے۔ (اخبارالاخیار ص ۱۵۰)

خیرالمجالس میں جابجا آپ کو اپنے زمانے کا امام ابوحنیفہ کہا گیا ہے۔ اور اگرچہ اس خطاب میں مریدانہ عقیدت کو دخل ہے، لیکن حضرات صوفیہ میں آپ جیسے علم اور حفظِ شریعت کے شیدائی بہت کم ہوں گے۔ آپ کا علمی فیض جس طرح عام ہُوا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عہدِ مغلیہ سے پہلے جس فاضل نے سب سے زیادہ حسنِ قبول حاصل کیا، قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے۔ انھیں ملک العلما کا خطاب ملا تھا۔ اور جونپور کی علمی مجلسوں کی ان سے اس وقت رونق تھی جب اس شہر کو علمی حیثیت سے دہلی اور ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں پر

امتیاز حاصل تھا۔ قاضی شہاب الدین نے دو بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ قاضی عبدالمقتدر اور مولنا خواجگی سے۔ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، یہ دونوں بزرگ حضرت چراغ دہلی کے خوشہ چیں تھے۔ علوم ظاہری میں مولنا خواجگی کے اُستاد مولنا معین الدین عمرانی تھے، جو شروع میں مشائخ کے منکر تھے۔ ایک دفعہ انھیں اس طرح زکام اور دردِ سر شروع ہُوا کہ کسی طرح نہ تھمتا تھا۔ سارے علاج کیے لیکن بے کار۔ حتیٰ کہ اطبا نے انھیں جواب دے دیا۔ اس حالت میں مولنا خواجگی نے اپنے اُستاد سے کہا کہ آپ میرے مُرشدِ رُوحانی شیخ نصیر الدین محمود کی طرف توجہ تو کریں۔ مولنا اس کے قائل نہ تھے لیکن ضرورت بُری بلا ہے۔ سب طرف سے عاجز آ کر انھوں نے اپنے شاگرد کا نسخہ آزمانا قبول کر لیا۔ اور شیخ کی خانقاہ تک گئے۔ جب وہ خانقاہ کے اندر جا رہے تھے تو شیخ باہر نکلے۔ اور اپنے گھر کے اندر جا کر کہہ آئے کہ آج کھانے پر دہی چاول بھیجنا۔ چنانچہ جب سب حاضرین کے لیے دستر خوان چُنا گیا تو کھانے میں دہی چاول ہی تھے۔ چونکہ دہی چاول زکام میں مضر ہوتے ہیں، اس لیے مولنا معین الدین ان کے کھانے میں خاص طور پر متامل تھے، لیکن شیخ کے اصرار کے آگے انھیں سر جھکانا پڑا۔ جب کھانا ختم ہُوا تو مولنا کو چھینکیں آنی شروع ہوئیں۔ چنانچہ چلیمچی منگائی گئی۔ مولنا کو اس زور سے چھینکیں آئیں کہ سارا بلغم خارج ہو کر طبیعت صاف ہو گئی۔ اس کے بعد مولنا معین الدین بھی شیخ کے مُعتقد ہو گئے اور دونوں کے درمیان اخوت و ارادت کے گہرے روابط قائم ہوئے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۴۴۔ در ضمن ذکر مولنا خواجگی)

حضرت چراغ دہلی کے ایک اور صاحبِ تصنیف خلیفہ حضرت سید محمد بن جعفر المکی والحسینی تھے، جن کا شمار برگزیدہ اولیا میں ہوتا ہے۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث نے ان کا تذکرہ بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ وہ بحر المعانی رسالہ پنج نکات بحر الانساب کے مصنف تھے۔ محمد تغلق کے زمانے سے سلطان بہلول لودھی کے زمانے تک زندہ رہے۔ آخر عمر میں سرہند میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور بعد وفات یہیں دفن ہوئے۔

حفظِ شریعت اشاعتِ علم اور اہلِ علم کی تربیت کے علاوہ حضرت چراغ دہلی مشائخ چشت میں جس بات کے لیے ممتاز ہیں، وہ حفظِ شریعت ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کی وفات تک ہندوستان میں جو رُوحانی دَور تھا، اس میں بعض اہلِ طریقت پر ذوق و جذبہ غالب تھا۔ اور وہ بالعموم وجدانی مشاہدات کو شریعت کے تابع کرنے کی خاص کوشش نہ کرتے تھے۔ بالخصوص سماع کے مسئلے میں اگرچہ حضرت خواجہ بزرگ شرع کے پابند تھے، لیکن ان کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت سلطان المشائخؒ کی اس معاملے میں جو روش تھی، اسے اہلِ شرع پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اسلامی حکومت کے باوجود اہلِ شرع انھیں اپنے خیالات کا پابند نہ بنا سکے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ بعض سلاطینِ اسلام مثلاً سلطان علاء الدین خلجی یا خسرو ملک یا کیقباد احکامِ شرع سے بے نیاز تھے۔ اور ان کے دل میں ان احکام کے اجرا کی کوئی خواہش نہ تھی۔ دوسرے کئی بادشاہ ایسے تھے جنھیں مصلحتِ مُلکی سے مشائخ کا پاس کرنا پڑتا تھا۔ ان کی اپنی حکومت ہی اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم تھی کہ وہ ان مشائخ کے خلاف جنھیں عوام اور امرا میں بڑا اقتدار حاصل تھا، کوئی قدم اُٹھاتے تو ان کا تخت و تاج خطرے میں پڑ جاتا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابتدائی اسلامی حکومت میں علومِ اسلامی صحیح طور پر عام نہ ہوئے تھے۔ کوئی بلند پایہ عالم نہ تھا اور جو حضرات علومِ اسلامی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، وہ بھی حضرت خواجہ بختیار کاکی اور سلطان المشائخ جیسی بزرگ ہستیوں کے حلقہ بگوش تھے۔ ایسی حالت میں زاہدانِ خشک کی کون سُنتا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اسلام کو اس مُلک میں زیادہ استحکام ہُوا۔ اسلامی علوم بھی نسبتاً عام ہوئے اور جب بادشاہ بھی اسی رنگ کے برسرِ اقتدار آئے جو ترویجِ شرع کے حامی تھے تو مشائخ کے طریقوں پر کڑی نظریں پڑنے لگیں۔ اور نہ صرف شیخ الاسلام نجم الدین صغرا جیسے فقہا، بلکہ عوام اور بعض اہل اللہ بھی سماع بالمزامیر اور دوسری مشتبہ باتوں پر اعتراض کرنے لگے۔

ان نئے رجحانات کی اہم مثال وہ محضرِ شرعی تھا، جو سلطان غیاث الدین تغلقؒ نے سماع کے متعلق شرعی فیصلہ سُننے کے لیے مُنعقد کیا۔ یہ رجحانات ہماری رُوحانی زندگی میں روز افزوں ترقی کرتے گئے۔ اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، آیندہ انھی صوفیانہ طریقوں نے مذہبی حلقوں میں وقار حاصل کیا، جو شرع کی پابندیوں سے آزاد نہ تھے۔

حضرت چراغ دہلی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ مشائخ کبار میں ان شرعی رجحانات کے اوّلین مظہر تھے۔ اور مشائخ چشت میں سے کسی بزرگ نے سماع اور دوسرے اختلافی مسئلوں کے متعلق وہ ٹھیٹھ شرعی نقطۂ نظر اختیار نہ کیا تھا جو حضرت چراغ دہلی کا تھا۔ اخبار الاخیار اور دوسرے تذکروں میں لکھا ہے کہ ایک روز آپ کے کسی پیر بھائی کے ہاں مجلس تھی۔ جب باجے کے ساتھ سماع شروع ہُوا تو آپ اسی وقت اُٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ دوستوں نے روکنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے فرمایا کہ یہ امر خلافِ سنّت ہے۔ سماع کے دلدادوں نے کہا کہ کیا سماع سے مُنکر ہو گئے ہو۔ اور اپنے پیروں کا مشرب چھوڑ دیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی حجّت نہیں۔ کلامِ مجید اور حدیث سے کوئی دلیل لاؤ۔ بعض لوگوں نے یہ الفاظ حضرت سلطان المشائخ تک پہنچائے، لیکن وہ اپنے مُرید کی نیک نفسی سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شیخ نصیر الدین کا اتقا بہت بڑھا ہُوا ہے۔

حضرت چراغ دہلی کے ملفوظات کے کئی مجموعے ہیں۔ ایک مجموعہ خیر المجالس کے نام سے آپ کے ایک خدمتگار اور مریدِ حاضر باش حمید شاعر نے جمع کیا تھا۔ اس میں آپ کا ایک قول نقل ہُوا ہے :-

"عزیزے بخدمت شیخ نصیر الدین محمود درآمد و آغاز کرد کہ کجا روا باشد کہ مزامیر در جمع باشد و دف و نائے و رباب۔ و صوفیاں رقص کنند؟" خواجہ فرمودند کہ مزامیر باجماع مباح نیست۔ اگر یکے از طریقہ بیفتد بارے در شریعت باشد۔

اگر شریعت ہم بفید۔ کجا رود۔ اوّل در سماع اختلاف است۔ نزدیک علما
باچندیں شرائط مباح، اہل آں را۔ امام زامیر باجماع حرام است۔"

حضرت چراغ دہلی جب اپنے زمانے کے صوفیہ کو دیکھتے، جنھوں نے تصوّف کو آزادی اور مطلق العنانی کا پردہ بنا رکھا تھا تو ان کا دل کڑھتا۔ وہ فرمایا کرتے کہ میں کس لائق ہوں کہ مسندِ مشیخت پر بیٹھوں۔ اور آج کل تو لوگوں نے مشیخت کو بچوّں کا کھیل بنا رکھا ہے۔ پھر سنائیؒ کا شعر پڑھتے ؎

مسلماناں، مسلماناں، مسلمانی مسلمانی ازیں آئینِ بیدیناں پشیمانی پشیمانی!

کبھی زبانِ مبارک پر یہ شعر وارد ہوتا ؎

ایں دلوِ تہی کہ در چاہ انداختہ ام
نومید نیم کہ پُر بر آید روزے!

ان کا ایک قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:۔

"غمِ ایمان باید خورد و در پئے کرامت نباید بود۔"

وفات مشائخ ہند میں حضرت چراغ دہلیؒ جس پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے حالات اور کارناموں سے ہو گیا ہوگا، لیکن افسوس انھیں فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی کے بعد بہت دن جلینا نصیب نہ ہوا۔ سیر العارفین میں شیخ جمالیؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز آپ بعد ادائے نمازِ ظہر حجرۂ خاص میں تشریف رکھتے تھے اور ورد وظائف میں مشغول تھے۔ آپ کے دروازے پر کوئی دربان معیّن نہ تھا۔ فقط آپ کا خواہر زادہ شیخ زین الدین علی، خادمِ خاص کی طرح آپ کے پاس رہتا، لیکن وِرد و وظائف کے وقت وہ کبھی حاضر ہوتا اور کبھی اِدھر اُدھر چلا جاتا۔ آپ وظیفہ خوانی میں مشغول تھے کہ ترابی یا تراب نام کا ایک قلندر آیا اور اُس نے چھُری سے آپ کے کوئی گیارہ زخم لگائے۔ آپ عبادت میں مشغول تھے، اس لیے اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ لیکن جب حجرے کی نالی سے خون آلود پانی بہنا شروع ہوا تو بعض مُریدوں کو جو باہر تھے،

تشویش پیدا ہوئی۔ اندر آئے تو دیکھا کہ وہ نابکار چھری چلا رہا ہے اور حضرت اُف نہیں کرتے۔ اُنھوں نے چاہا کہ قلندر کو اس کے کیے کی سزا دیں۔ لیکن حضرت مزاحم ہوئے بلکہ اپنے منتخب مریدوں سے اس امر کا عہد لیا کہ قلندر سے کسی طرح کا مواخذہ نہ کریں گے۔ اور قلندر کو بیس تنگے عطا کیے اور بہت عُذر و معذرت کے بعد رخصت کیا۔

اس واقعہ نے حضرت چراغ دہلی کو نیم جان کر دیا، لیکن ان کے زخم مُہلک ثابت نہ ہوئے۔ اور ان کی وفات اس واقعہ سے تین سال بعد ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں رمضان کی اٹھارویں تاریخ بروز جمعہ ہوئی۔

وفات کے وقت آپ کے خادم زین الدین علی نے عرض کیا کہ آپ کے اتنے بلند پایہ مرید ہیں، ان میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد کریں تاکہ سلسلے کا کام جاری رہ سکے۔ لیکن آپ نے زمانے کی بدلی ہوئی ہَوا دیکھی تھی۔ اور سمجھتے تھے کہ دہلی میں چشتیہ مشائخ کبار کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ خادم نے مریدوں کی فہرست پیش کی تو آپ نے اسے دیکھ کر کہا کہ مولانا زین الدین! ان لوگوں کو اپنے ایمان کا غم کھانا چاہیے۔ اس کی کہاں گنجائش ہے کہ یہ لوگ دوسروں کا بوجھ اُٹھائیں[1]!

مرتے وقت آپ نے وصیت کی کہ میری تدفین کے وقت حضرت سلطان المشائخ کا خرقہ میرے سینے پر رکھ دیں۔ میرے پیر کا عطا کردہ عصا میرے پہلو میں ہو۔ ان کی تسبیح میری شہادت کی اُنگلی کے گرد لپیٹ دیں۔ ان کا کاسۂ چوبیں میرے سر کے نیچے رکھا جائے اور ان کی کھڑاویں (نعلین چوبیں) بھی میرے ساتھ دفن کی جائیں۔

یہ چیزیں وہ تبرکات تھے جو حضرت سلطان المشائخ کو بابا فرید سے ملے

---

[1] سیر العارفین ص ۹۷

تھے ۔ اور بزرگانِ چشت میں پُشت در پُشت منتقل ہوتے آئے تھے ۔ یہ تبرکات تو حضرت چراغ دہلی کے ساتھ دفن ہو گئے ۔ لیکن حضرت سیّد گیسودراز نے اس کھاٹ کی رسّیاں ہی اُتاریں، جس پر انھوں نے حضرت کو غسل دیا تھا ۔ اور انھیں اپنے گلے کا ہار بنا کر کہا کر میرے لیے اپنے پیر کا یہی خرقہ کافی ہے ۔ (سیر العارفین ص ۹۶ - ۹۷)

آپ کی وفات پر آپ کے مریدوں میں ایک بلند پایہ شاعر مطہر نے مرثیہ لکھا ہے ؎

ز دورِ محنتِ ایں نُہ سپہر زنگاری	کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری
کُجا بجامِ طرب مجلسے بنا کردند	کہ از سپہر نبارید سنگ قہّاری
وفا ز عالمِ فانی مجو کہ مشہور اند	فلک بخیرہ کشی، اختراں بہ غدّاری

. . . .

ز دستِ چرخ ندانم کُجا کنم فریاد	کہ برگزشت بما جورِ او ز بسیاری
جہاں بماتمِ خواجہ نصیرِ دیں محمود	ہزار گونہ فغاں کرد نوحہ و زاری
بقیّہ سلف و یادگارِ اہلِ کرم	کہ کرد ختمِ خلافت بملکتِ دینداری!

حضرت چراغ دہلی کی درگاہ دہلی سے چھ کوس کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے ۔ آپ کی درگاہ کا گنبد آپ کی زندگی میں ہی سلطان فیروز تغلق نے ۷۴۹ھ میں تعمیر کروایا تھا ۔ اور آپ ۱۳۵۶ء اپنی وفات کے بعد اسی گنبد میں دفن ہوئے ۔

خاندانِ تغلق کے زمانے میں علم و ادب

خاندانِ تغلق کا پہلا بادشاہ سلطان غیاث الدین تغلق تھا۔ اسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہُوا۔ اور اس کے زمانے کے مشہور اہلِ قلم وہی تھے، جن کا ذکر ہم عہدِ علائی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اس کی بے وقت وفات کے بعد محمدؒ بن تغلق جانشین ہُوا۔

عہدِ محمدؒ بن تغلق

شیخ عبدالحق محدث محمدؒ تغلق کے زمانے میں علما و فضلا کی کمی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اس زمانے کی کئی ہستیاں قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً ضیاء الدین برنی، ابنِ بطوطہ سیّاح۔ ظہیر الدین جو فنِ تعبیر کا ماہر تھا، شہاب الدین ابوالعباس احمد، جو فنِ خطابت میں بے نظیر تھا۔ مشہور ترین شاعر اور ملک الشعرا بدرِ چاچ تھا۔ وہ چاچ یعنی تاشقند کا رہنے والا تھا۔ سلطان نے اس کی بڑی قدر کی اور "فخر الزمان" کا خطاب دیا۔ وہ خود کہتا ہے ؎

دریں در بدرِ چاچی را سخن شیریں غلامے داں
اگرچہ خسروِ عالم کند "فخر الزماں" لقبش

بدر کے سارے قصائد سلطان محمدؒ تغلق کی مدح میں ہیں۔ اور چونکہ ان میں بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے اور اس عہد میں تاریخی مواد کی کمی ہے۔ اس لیے مورخین ان قصائد کو تاریخ کی حیثیت سے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور الیٹ نے اپنی تاریخ میں بعض کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ قصائد اب بھی بعض جگہ درس میں شامل ہیں، لیکن طرزِ تحریر کی غرابت، معمّوں کی فراوانی، مشکل الفاظ اور پیچیدہ اور دقیق تشبیہوں کی وجہ سے ان سے محظوظ ہونا ہر ایک کا کام نہیں!

قصائد کے علاوہ بدرِ چاچ نے ایک مثنوی "شاہ نامہ" لکھی۔ بدایونی کہتا

ہے" وہمیں کہ تاریخ منظوم است غنیمت است"۔

سلطان محمد تغلق خود شاعر تھا۔ ذیل کے ابیات اس نے حالتِ نزع میں کہے ؎

بسیار دریں جہاں طپیدیم بسیار نعیم و ناز دیدیم

اسپانِ بلند بر نشستیم ترکانِ گراں بہا خریدیم

کردیم بسے نشاط و آخر چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں مشہور سیاح ابنِ بطوطہ ہندوستان آیا۔ بادشاہ نے اس کی بڑی قدر کی اور دہلی کا قاضی مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے بادشاہِ چین کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جس سے ابنِ بطوطہ کو نہ صرف شمالی اور وسطی ہندوستان بلکہ مالابار، مالدیو، سیلون، معبر، بنگالہ، اراکان، سماٹرا اور چین کے مشہور ساحلی مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے دلچسپ حالات اس نے اپنے سفرنامے میں لکھے ہیں۔ اس سفرنامے کا اردو ترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین نے بڑے سیر حاصل اور فاضلانہ حواشی اور تشریحات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جن سے ترجمہ کی قدر و قیمت اصل کتاب سے دو چند ہو گئی ہے۔

اس زمانے کے ایک مشہور عالم مولنا معین الدین عمرانی تھے جنھوں نے کنز، منار، حسامی، تلخیص اور مفتاح پر حواشی لکھے[1]۔ سلطان محمد بن تغلق نے انھیں شیراز اس غرض سے بھیجا کہ مواقف کے مؤلف قاضی عضد کو ہندوستان لے کر آئیں۔ جب شیراز کے حاکم نے یہ سنا تو وہ قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ مجھ سے میری حکومت لے لو، لیکن یہاں سے نہ جاؤ۔ اس پر قاضی نے ہندوستان آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور مولنا کو ناکام واپس آنا پڑا۔

(اخبار الاخیار)

---

[1] تذکرہ مصنفینِ دہلی۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری ص ۱۱

ضیا نخشبی

مولنا معین الدین عمرانی سے بھی زیادہ پائدار شہرت بدایوں کے ضیا نخشبی کو نصیب ہوئی ہے۔ اپنی زندگی تو اُنھوں نے عزلت نشینی میں بسر کی لیکن اُنھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں سے بعض اب بھی رائج ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے کلّیات رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام چھپی ہے۔ ایک اور مشہور تصنیف سلک السلوک ہے جس کا اُردو ترجمہ اللہ والوں کی قومی دُکان (لاہور) نے شائع کیا ہے اور اصل فارسی بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ سلک السلوک کی نسبت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

"سلک السلوکِ او بغایت کتاب شیریں و رنگین است۔ بزبانِ لطیف و مؤثر مشتمل بر حکایاتِ مشائخ و کلماتِ ایشاں و اکثر تصنیفاتِ وے مملوست بہ قطعہ ہا کہ ہمہ بہ یک طریق و یک نہج واقع اند۔ چنانکہ قطعہ

نخشبیؔ! خیز و با زمانہ بہ ساز	ورنہ خود را نشانہ ساختن است
عاقلانِ زمانہ مے گویند	عاقلی با زمانہ ساختن است"

سلک السلوک سے بھی زیادہ شہرت طوطی نامہ نے حاصل کی جس میں ایک طوطے کی زبانی باون کہانیاں سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ضیا کے طوطی نامہ کے ترکی، جرمن، انگریزی اور دکنی میں ترجمے ہوئے۔ اُردو نثر کی کتاب طوطا کہانی جسے سیّد حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گل گرائسٹ کی فرمائش پر مرتب کیا۔ اسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔

مولنا ضیاء الدین نخشبی شاعر بھی تھے۔ اور فنِ شعر میں بدایوں کے مشہور اُستاد شہاب الدین مہمرہ کے شاگرد تھے۔ آپ کی وفات ۱۳۵۰ء میں ہوئی۔

ھ تذکرہ مصنفین دہلی ص ۱۰

ضیاء الدین برنی

سلطان محمدؒ تغلق کا ایک اور ہمعصر اس زمانے کا بہترین مورخ ضیاء الدین برنی تھا، جس کی تاریخ فیروز شاہی اس زمانے کے حالات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ وہ برن میں جسے اب بلند شہر کہتے ہیں ۶۸۴ھ کے قریب پیدا ہوا۔ اس کے والد اور متعلقین دربار سے وابستہ تھے۔ اسے بھی بڑی اچھی تعلیم دی گئی۔ اور ذہانت اور ذکاوت تو خداداد تھی۔ جب اس نے حضرت سلطان المشائخ سے بیعت کی تو ان کی کشش سے خود بھی غیاث پور میں سکونت اختیار کی۔ جب وہ وفات پا گئے اور سلطان محمدؒ بن تغلق تخت نشین ہوا تو اپنی حاضر جوابی اور فن ندیمی کی بدولت بادشاہ کے مزاج میں اچھا دخل پا لیا۔ اور اس کی کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ نے کئی نازک موقعوں پر اس سے مشورہ، یا کم از کم اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیر الاولیا میں لکھا ہے: "آپ اپنی لطافت طبع کی وجہ سے فن ندیمی میں اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ آخر کار اس فن کی بدولت سلطان محمدؒ تغلق کے ندیم خاص مقرر ہوئے اور اس دنیائے غدّار و مکّار دیبے وفا کی دولت سے کافی حصّہ لیا۔ جب آپ کی عمر کے ستر سال گزر گئے تو آپ نے شاہی ملازمت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور بے نظیر کتابوں کی تصنیف و تالیف شروع کی"۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو برنی نے اپنی کتاب کا نام بادشاہِ وقت کی رعایت سے تاریخ فیروز شاہی رکھا، لیکن بادشاہ کسی بنا پر اس سے ناراض ہی رہا۔ اور کوئی قابلِ ذکر خدمت اسے تفویض نہ کی۔ بعد میں بادشاہ نے اس کا معمولی سا وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن وہ اس کی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ اور اس کی وفات ۷۵۸ھ میں احتیاج کی حالت میں ہوئی۔ بلکہ سیر الاولیا کے مطابق "آخری دم آپ کے پاس روپیہ پیسہ کوئی نہ تھا بلکہ آپ نے بدن کے کپڑے تک سب راہِ خدا میں دے دیے تھے۔ چنانچہ آپ کے جنازے پر صرف ایک بوریا اور ایک چادر تھی"۔

تاریخ فیروز شاہی اصل میں طبقاتِ ناصری کا تکملہ ہے۔ اور اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی جلوس (۶۶۴ھ) سے سلطان فیروز شاہ کے چھٹے سال جلوس (۷۵۸ھ) تک کے واقعات ہیں۔ برنی منہاج کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ واقعات کا بیان کرتا ہے۔ اور اس کا طرزِ تحریر بھی زیادہ شگفتہ ہے۔ اس لیے تاریخ فیروز شاہی طبقاتِ ناصری کی نسبت زیادہ مقبول ہے۔

برنی کا فنِ تاریخ نگاری کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ وہ جس قدر اہمیت بیانِ واقعات کو دیتا تھا۔ اس سے زیادہ توجہ ان واقعات سے نتائج اخذ کرنے اور ان کے ذریعے سے احکام جہانبانی کو نمایاں کرنے میں صرف کرتا۔ وہ خود لکھتا ہے۔

"اگر ایں تالیف را تاریخ خوانند۔ اخبارِ سلاطین و ملوک در و یابند۔ و اگر دریں تالیف احکام انتظام و التیام جو بند، از انہم خالی نیابند۔ و اگر دریں تالیف مواعظ و نصائح جہانباناں و جہانداراں طلبند، بیشتر و بہتر از تالیفاتِ دیگر مطالعہ فرمایند (ص ۲۳)

امورِ ملکی میں بھی برنی ایک خاص نظریے کا قائل تھا اور جن فرمانرواؤں (مثلاً علاء الدین خلجی) کے واقعاتِ زندگی اس نظریے سے مطابقت نہ کرتے۔ ان کا صحیح اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل ہو جاتا، لیکن باایں ہمہ ہمارے مؤرخین کی صف میں برنی کا ایک منفرد مقام ہے۔ اس کا نظریۂ تاریخ نگاری محدود اور ناصحانہ سہی، لیکن کم از کم اسے اس فنِ شریف کی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ اور وہ انھیں نبھانے کی پوری کوشش کرتا۔ اس کی کتاب میں تاریخ نگاری فقط وقائع نویسی نہیں رہی بلکہ ایک تخلیقی فن کے مرتبے کو پہنچ گئی ہے (اور وہ بھی صحتِ بیان کو قربان کیے بغیر) اس کے علاوہ تاریخ فیروز شاہی میں کئی غیر معمولی شخصیتوں (مثلاً بلبن، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق) کی جو چلتی پھرتی، زندۂ جاوید تصویریں ہیں، ان کا جواب قدیم تاریخوں میں کہاں ملے گا؟

عصامی اس عہد کا ایک اور مورخ عصامی ہے، جس نے سلطان محمد بن تغلق کے آخری سالِ حکومت (۱۳۵۰ء) میں ۱۲ ہزار شعر کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی۔ اس میں غزنویوں، غوریوں، خاندانِ غلامان، خاندانِ خلجی اور خاندانِ تغلق کے (پہلے دو) بادشاہوں کی فتوحات اور واقعاتِ زندگی نظم کیے ہیں۔

عصامی دہلی میں ۱۳۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا صحیح نام بھی معلوم نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کے بزرگوں میں جو شخص سب سے پہلے سرزمینِ پاک و ہند میں آیا فخر الملک عصامی تھا، جو خلفائے بغداد کا وزیر تھا۔ کسی بات پر خلیفۂ وقت سے رنجیدہ ہو کر ترکِ وطن کیا۔ اور اپنے خاندان کے ساتھ ملتان کے راستے دہلی آئے۔ دہلی میں اس وقت سلطان شمس الدین التمش برسرِ اقتدار تھا جو اسلامی ممالک سے آنے والے اکابر و علما کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے فخر الملک کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ بلکہ منصبِ وزارت اسے تفویض کیا۔ فخر الملک کا پوتا عز الدین عصامی جو عہدِ بلبن میں ایک فوجی افسر تھا، فتوح السلاطین کے مصنف کا دادا تھا۔ اسی نے اس کی پرورش کی۔ عصامی لکھتا ہے کہ نوے سال کی عمر میں سلطان محمد بن تغلق کے حکم کے بموجب عز الدین اور اس کے پوتے کو دولت آباد کا رُخ کرنا پڑا، لیکن پہلی منزل پر ہی بڈھا جان بحق تسلیم ہو گیا۔

عصامی نے فتوح السلاطین لکھتے وقت بانیِ خاندان بہمنی کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ اور واقعات کو بڑی احتیاط اور وضاحت سے نظم کیا۔ چونکہ وہ خاندان خلجی و خاندان تغلق کے لیے ایک قریب العہد مورخ ہے۔ اور ویسے بھی اس وقت دولت آباد وغیرہ میں کئی لوگ ایسے تھے، جن کے لیے اس دَور کے شمالی ہند کے واقعات چشم دید تھے۔ اور عصامی کی ان تک رسائی تھی۔ اس لیے اس کی مثنوی کی تاریخی اہمیت کافی ہے۔

اس کے اپنے حالاتِ زندگی پر اخفا کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ فتوح السلاطین سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ معاصرانہ حالات سے بہت ناخوش تھا۔ اور چاہتا

تھا کہ کتاب کی تکمیل کے بعد مدینہ منورہ چلا جائے۔ چونکہ فتوح السلاطین کی تالیف کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں چلتا، اس لیے خیال ہے کہ وہ اسے مکمل کرنے کے بعد حجاز میں جا بسا ہوگا۔

عہدِ فیروزی
۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء

محمد تغلق کی وفات کے بعد امرا و علما نے غیاث الدین تغلق کے بھتیجے فیروز کو تختِ دہلی کے لیے منتخب کیا۔ اس بادشاہ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں امن و امان اور رعیت پروری کے لیے یادگار ہے۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا، وہ ان قیدیوں کی رہائی تھی جنھیں محمد بن تغلق نے جیل خانوں میں ڈالا تھا۔ جن لوگوں کو محمد بن تغلق نے قتل کروا دیا تھا، ان کے پسماندگان کو خون بہا دیا۔ اس کے علاوہ پرانے بادشاہوں نے جو دیہات، اراضی یا دوسری جائدادیں ناجائز طور پر ضبط کر کے بادشاہی مقبوضات میں داخل کر لی تھیں، ان کو واپس کیا۔ فیروز شاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی شرعی عدالت کے سامنے اپنے حقوق ثابت کر سکے گا۔ اسے اس کی جائداد واپس مل جائے گی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنے حقوق ثابت کر کے جائدادیں واپس لیں۔

فیروز شاہ نے رعایا کی بہبودی کے لیے بہت محنت کی۔ کئی نہریں کھدوائیں۔ دو سو سرائیں مسافروں کی سہولت کے لیے بنوائیں۔ شفاخانے کھولے، جہاں ناداروں کا معالجہ مفت ہوتا تھا۔ ستلج کے قریب پل بنوائے۔ کئی شہر آباد کیے۔ جن میں جونپور، فتح آباد اور فیروز آباد مشہور ہیں۔ اس نے سرکاری لگان ادا کرنے میں لوگوں کو سہولتیں دیں۔ اور اس کے زمانے میں رعیت بہت خوشحال تھی۔ دکن اور بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں خود مختار ہو گئے تھے۔ فیروز تغلق نے ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوئی سرگرم کوشش نہیں کی۔ اور حکومت دہلی میں جو انتشار شروع ہوا تھا، اسے وہ قطعاً نہ روک سکا لیکن جو علاقے اس کے قبضے میں تھے، وہاں رعیت کی بہبودی کا بڑا خیال رکھا۔

مشہور لغات قاموس کے مصنف مولنا مجد الدین فیروز آبادی اسی زمانے میں ہندوستان آئے۔ عہدِ فیروز شاہی کے تین اور قابلِ ذکر بزرگ مولنا احمد تھانیسری، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے اُستاد مولنا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر دہلوی تھے۔ مشائخ میں سب سے زیادہ مشہور مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ تھے۔ سلطان محمدؒ بن تغلق نے ان کی بڑی بے ادبی کی تھی، لیکن فیروز شاہ نے ان کی قدر و منزلت کی۔ بلکہ جب سلطان محمدؒ بن تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق عنانِ حکومت سنبھالنے سے گریز کرتا تھا اور حج اور زیارتوں کے لیے جانے کا خواہاں تھا تو آپ نے ہی دوسرے علما و مشائخ کے ساتھ جا کر اسے بادشاہت پر آمادہ کیا۔ اور بادشاہ ہو جانے کے بعد بھی فیروز تغلق نے کئی بار ان سے مشورہ کیا۔ شیخ صدر الدین ملتانی اس دور کے دوسرے بڑے شیخ تھے۔ انھیں بادشاہ نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں علم و ادب کو بڑا فروغ ہوا۔ افسوس ہے کہ اس کی وفات کے بعد حکومت کو زوال آگیا۔ اور اس بدامنی کی وجہ سے جو حملۂ تیمور کے دوران میں رُونما ہوئی بہت سے اہلِ علم دہلی سے منتشر ہو گئے اور اس زمانے کے علمی و ادبی حالات کہیں مرتب نہ ہوئے، لیکن معاصرانہ تذکرۂ اخبار الاخیار اور بدایونی میں جو منتشر اشارات ملتے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ علم و فضل میں یہ زمانہ عہدِ علائیؒ سے کم نہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شعر و شاعری کی طرف اہلِ دولت کی خاص توجہ نہ تھی۔ چنانچہ اس زمانے کا ایک شاعر قاضی عابد لکھتا ہے ؎

دوستاں گویند عابد باچنیں طبع لطیف
چیست کاشعار و غزل از تو فراواں برنخاست
ما کر اشعر و غزل گوئیم چوں در عہدِ ما؟
شاہدِ موزوں و ممدوحے زر افشاں برنخاست

لیکن پھر بھی اس زمانے میں کئی قابلِ ذکر شاعر تھے۔ ایک مسعود بک تھے، جن کو اقارب فیروز شاہ سے بتایا جاتا ہے۔ اور جن کا دیوان حیدر آباد دکن میں چھپ چکا ہے۔ ان کا اصل نام شیر خاں تھا۔ مسعود بک غالباً خطاب تھا۔ ایک مدّت تک اہلِ ثروت کی زندگی بسر کی۔ پھر درویشی کی طلب پیدا ہوئی۔ اور شیخ رکن الدین بن شیخ شہاب الدین کے مُرید ہوئے۔ انھوں نے اشعار کے علاوہ تصوّف میں کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً تمہیدات، مراۃ العارفین۔ ان کی نسبت شیخ عبدالحق محدّث لکھتے ہیں: ”در سلسلۂ چشتیہ ہیچ کس این چنیں اسرارِ حقیقت را فاش نگفتہ و مستی نہ کردہ کہ او کردہ“۔ دوسرا حمید قلندر تھا۔ جس نے حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات (خیر المجالس) مرتب کیے۔ تیسرا قابلِ ذکر شاعر ظہیر دہلوی تھا۔ جو صاحبِ دیوان تھا۔ اور جس کے بعض قصائد کا انتخاب بدایونی نے درجِ کتاب کیا ہے۔

امیر خسرو کے صاحبزادے امیر احمد بھی ایک خوش مذاق شاعر مانے جاتے تھے۔ انھی ایام میں ایک طبیب شہابی نے ایک مثنوی طبِ شہابی کے نام سے لکھی۔ لیکن اس زمانے کا بہترین شاعر مطہر تھا، جس کے چند اشعار، جو اس نے حضرت چراغ دہلیؒ کی وفات پر لکھے، ہم گزشتہ اوراق میں درج کر چکے ہیں۔ وہ کڑہ (جو الہ آباد سے ۴۰ میل شمال مغرب کو قدیم زمانے میں صوبے کا دار الحکومت تھا) کا رہنے والا تھا اور فیروز شاہ اور اس کے امرائے عہد کا مدّاح تھا۔ اس کے ممدوحوں میں ایک امیر ملک الشرق ملک عین الملک تھا، جس کی انشائے ماہرو مشہور ہے۔ مطہر خود ایک عالم تھا۔ اور اس کا نصاب، نصیبِ اخوان جو ۷۷۶ھ میں تالیف ہوا، ہندوستان میں بہت مقبول رہا ہے۔

بدایونی لکھتا ہے کہ مطہر کا دیوان پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ دیوان شیخ عبدالحق محدّث کے زمانے میں ہی ”کمیاب بلکہ نایاب“ ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر وحید مرزا کو اس کا ایک نامکمل نسخہ حاصل ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب اور مولوی محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے کالج میگزین میں مع قیمتی مضامین

لکھے اور شاعر کو ایک نئی زندگی دے دی۔

مطہر کے کئی قصیدے ناقص اور نامکمل حالت میں ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدہ عماراتِ دہلی کی تعریف میں ہے۔ شاعر بادشاہ کے دربار میں طلب ہوتا ہے اور معشوق کی معیت میں دہلی کا سفر کرتا ہے۔ پہلے روضۂ سلطان المشائخ کی زیارت ہوتی ہے ؎

ہم ازیں عزم گرفتیم رہِ روضۂ شیخ
تا رسیدیم در آں مرقدِ میمون آثار

پھر حوضِ علائی کی سیر کر کے مدرسے میں پہنچتے ہیں، جہاں مولنا جلال الدین معروف درس دیتے تھے ؎

گفت ایں جائے چہ جائیست بدیں زینت و زیب — باز ایں باغ چہ باغیست ز انواعِ ثمار
گفت ایں مدرسۂ باغ شہنشاہِ جہاں ست — اندروں آئی کہ یک حسن بہ بینی بہ ہزار
چوں در آمد ز درش دیدہ وراں جنتِ خلد — فاضلاں صف زدہ ہر سوئے ملائک کردار
عالمانِ عربی لفظ و عراقی دانش — ہمہ در جُبّۂ شامی و بمصری دستار
ہر یکے نادرۂ دہر درِ انواعِ ہنر — ہر یکے واسطۂ عقل در اطرافِ دیار
در فقاہت بہ بخارا و سمرقند نشاں — در بلاغت بہ حجاز و یمن و نجد و منار
صدرِ آں محفل و سر دفترِ آں استادے — کہ ز سر تا بالقدم صورتِ عقل است و وقار
باز آہستہ در آور و سر اندر گوشم — کہ دراز نسبتِ ایں صاحبِ درس استخبار
گفتم ایں عالمِ آفاق جلال الدین است — رومی آں کز نسبش رے کند و روم فخار
راوی ہفت قرات سندِ چاردہ علم — شارحِ پنج سُنن مفتیِ مذہب ہر چار
گر بخواہی شنوی سحر حلالِ سخنش — یک زماں گوشِ دل و ہوش بقولش بسپار
پس شنیدیم ز گفتارشِ انواعِ علوم — اخذ کردیم ز تفسیر و اصول و اخبار

فقہ کا فروغ

شعر و شاعری کے علاوہ فقہ نے اس زمانے میں بڑا فروغ پایا۔ علاء الدین خلجی کو مذہبی علوم سے دلچسپی نہ تھی۔ اور

اس کے زمانے میں اہلِ شرع کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہ ہوئی، لیکن جب سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہُوا تو شرع اور اہلِ شرع کو نیا وقار حاصل ہُوا۔ برنی لکھتا ہے: "واز برائے جریانِ احکام شریعت قاضیان و مفتیان و داہک و محتسبانِ عہد او را آبروئے بس بسیار و آشنائی تمام پیدا آمدہ بود" (ص ۴۴۱)

اِس کے بعد فقہی علوم اور ترویجِ شرع پر زیادہ توجہ ہوتی گئی۔ اور عہدِ فیروزی میں کئی قابلِ ذکر فقہی تصانیف کے نام ملتے ہیں۔ ہندوستانی فقہ کی قدیم کتابوں میں فقہ فیروز شاہی بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ کے ایک امیر خانِ اعظم تاتار خاں نے جس کی وفات ۱۳۵۱ء کے چند سال بعد ہوئی، علومِ دینیہ میں دو مبسوط کتابیں مدوّن کرائیں۔ ان میں سے ایک تفسیر ہے "دوسری فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں فقہ کے ہزارہا مسائل، فقہا کے اختلافات اور ہر مسئلہ کی نسبت ان کے فتاوے جمع ہیں... کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ جو نویں صدی کا مکتوبہ ہے۔ نو جلدوں میں محفوظ ہے"۔[1] یہ کتاب الفتاوے تاتار خانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کے مدوّن کا نام مولانا عالم بن علاء الدین حنفی تھا۔ اس زمانے میں لوگ فقہ سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک مُرید مولانا رکن الدین نے فقہی مضامین کے متعلق ایک طویل مثنوی طرفۃ الفقہا کے نام سے لکھی۔ اس میں تین ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔

دُوسری علمی سرگرمیاں

فیروز شاہ کے زمانے کا ایک اور قابلِ ذکر واقعہ سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی ترجمہ ہے۔ بدایونی نگر کوٹ پر بادشاہ کی چڑھائی اور وہاں کے کتب خانے کا ذکر کر کے لکھتا ہے:

"و سلطان براہمہ را طلبیدہ بعد ازاں کتب را فرمود تا مترجماں بزبان فارسی

---

[1] تذکرہ مصنفینِ دہلی۔ حاشیہ از حکیم شمس اللہ قادری ص ۱۳-۱۴

ترجمہ نمایند۔ ازانجملہ عزیز الدین خالد خانی کہ از شعرا و منشیان عصر فیروزی بود، کتابے در بیان صعود و ہبوط سیارات سبعہ سعادت و نحوست آنہا و تفاول و شگون بہ نظم آوردہ دلائل فیروزی نام دادہ۔ و فقیر جامع ایں منتخب در لاہور ۱۰۰۲ھ (الف) آنرا از اول تا آخر دیدہ خالی ہم نیست و (لائق) تعریف ہم نے، و چند کتابے دیگر قبل ازیں ہم بنظر فقیر رسیدہ کہ بنام سلطان فیروز ترجمہ شدہ بعضے ازاں در علم پنگل یعنی فن موسیقی و اقسام اکھاڑہ کہ آنرا پاتر بازی مے گویند و بعضے در غیر آں و اکثر را بے حاصل یافت۔ غالباً بے مزگی آں جہت دنائت مطلب و صعوبت تعبیر خواہد بود۔ چنانچہ ظاہر است"۔

بدایونی کا ہندو مذہب اور ہندو علوم کی نسبت جو نقطہ نظر تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے اسے ہندو علوم کی کوئی کتاب کیسے پسند آسکتی تھی۔ لیکن دلائل فیروزی کی نسبت فرشتہ لکھتا ہے" والحق آں کتاب است متضمن اقسام علمی و عملی" بدایونی نے فن موسیقی کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً بار اہ سنگتا ہے، جو فیروز شاہ کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری مولف تاریخ فیروز شاہی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی۔

ان کے علاوہ علامہ شیرانی لکھتے ہیں :۔

"فیروز شاہ کے دور میں یہ امر آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ ہندوی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا داؤد نے کتاب چندا ابن جو لورک اور چندا کا عشقیہ افسانہ ہے۔ جونا شاہ خان جہاں خلف وزیر خان جہاں کے نام پر لکھی ہے"۔

اس مثنوی کو بدایونی کے زمانے تک بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ منتخب التواریخ میں لکھتا ہے: "واز نہایت شہرت دریں دیار احتیاج بہ تعرف ندارد۔ و مخدوم تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے ابیات تقریبی او را بر سر منبر میخواند۔ و مردم را از استماع آں حالات غریبہ روے می داد"۔

اس زمانے کی ایک اور دلچسپ کتاب فتوحات فیروز شاہی ہے، جس میں

خود بادشاہ نے اپنے کارنامے گنائے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے اور اس سے نہ صرف ان کوششوں کا پتا چلتا ہے، جو بادشاہ نے پاک و ہند میں اسلام اور اسلامی علوم بالخصوص فقہ کی تنظیم و ترویج کے لیے کیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذہبی و معاشرتی مسائل کا آغاز جن کا حل آج مسلمان تلاش کر رہے ہیں۔ فیروز شاہ کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ مثلاً جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے اسمٰعیلی شیعہ تو اس سرزمین میں بہت پرانے ہیں۔ اثنا عشری شیعہ بھی فیروز شاہ کے زمانے میں کافی تھے۔ اسی طرح ایک شخص رکن الدین نے سید محمدؒ جونپوری یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک صاحب احمد بہاری خدائی[1] کے دعوٰی دار تھے۔ اور ایک صوفی نے "انا الحق" بھی کہنا شروع کیا۔ ان کے علاوہ مقابر اور مزارات پر مستورات کے جمع ہونے کی مضر اور خلافِ شرع رسم اس زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ فیروز شاہ لکھتا ہے کہ مجھے یہ رسم جبراً بند کرنی پڑی[2]۔

---

[1] حضرت گیسو دراز اس خللِ دماغ کا ذکر کرتے ہوئے جو ترکِ طعام سے پیدا ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں: "احمد بہاری دوازدہ سالہ طعام نخوردہ بود۔ اما خلل شد۔ کلمہائے گفتن گرفت و از دین کلی منحرف شد" (جوامع الکلم)۔ احمد بہاری کو فیروز تغلق نے اس کی شطحیات کی بنا پر، بموجب فتوئے علمائے دہلی قتل کرا دیا۔ صوفیائے کبار نے اس پر بڑا افسوس کیا۔ سیرۃ الشرف میں اس واقعہ پر مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا ذیل کا تبصرہ ہے، "وہ فرماتے تھے" اتنے مشائخِ طریقت دہلی میں موجود تھے کسی سے اتنا نہ ہوا کہ دیوانہ پن کے حیلہ وغیرہ سے ہی خلاصی کراتے۔ افسوس!" (ص ۱۴۳)

[2] افسوس، جو اصلاحیں انسانی نفسیات کا مطالعہ کیے بغیر، اور تبلیغ و تلقین کے ذریعے نہیں، بلکہ احتساب کے زور پر جاری کی جائیں، وہ دیرپا نہیں ہوتیں۔ فیروز نے مستورات کو قبروں پر جانے سے روکا۔ لیکن وہ نہ رکیں۔ اور سکندر لودھی کو از سرِ نو احکام جاری کرنے پڑے (تاریخ داؤدی) اور اُسے بھی جو کامیابی ہوئی، وہ ظاہر ہے۔

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری
(وفات ۱۳۷۱ء)

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت چراغ دہلی کی وفات کے بعد دہلی میں صوفیائے کبار کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اور اس کے بعد جو بزرگان کرام ہوئے (مثلاً بنگالہ کے نور قطب عالمؒ، اوچ کے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، گلبرگہ کے حضرت سید گیسو درازؒ) ۔ ان کی حیثیت بڑی حد تک صوبجاتی اور مقامی تھی۔ اور ہم ان کا ذکر مختلف علاقوں میں اسلام کی توسیع کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی ایک بزرگ ایسے تھے جو شاید اولیائے کرام کی بالکل پہلی صف میں تو نہیں آتے۔ اور دار السلطنت سے بھی ان کو خاص تعلق نہیں رہا، لیکن انھوں نے اپنی تصانیف و تالیف کی بنا پر، جو ملک کے مختلف حصوں میں رائج ہو گئیں، ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ یہ بزرگ بہار کے شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری تھے۔

شیخ شرف الدین سلطان ناصر الدین محمود ابن سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں ۵ جولائی ۱۲۶۳ء کو جنوبی بہار کے قصبہ منیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا سید شہاب الدین پیر جگ جوت، مشہور سہروردی بزرگ شیخ شہاب الدین کے مرید تھے۔ (اگرچہ تذکرہ حضرت ابو النجیب عبد القاہر سہروردی میں شاہ حسن میاں صاحب نے انھیں سہروردی مانتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ معلوم نہیں کہ کس کے مرید اور خلیفہ تھے۔)

شیخ شرف الدین کے والد مخدوم یحییٰ منیری بھی ایک صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ انھیں عقیدت اور ارادت مولٰنا تقی الدین عربی سے تھی، جو شیخ احمد دمشقی کے خلفا میں سے تھے۔ موخر الذکر یا شیخ شہاب الدین سہروردی یا شیخ بہاء الدین زکریا کے مرید تھے۔ مولٰنا تقی الدین عربی کی ذات اس لیے بھی بڑی دلچسپی کی حامل ہے کہ ان کا مزار مہسوں (موجودہ ماہی سنتوش) میں ہے۔ جو پہلے ضلع دیناج پور میں تھا۔ اور اب مشرقی پاکستان کے ضلع راج شاہی

کی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ مولٰنا تقی الدین مہسون (ماہی سنتوش) میں تشریف رکھتے تھے: اور احیاء العلوم کا درس دیا کرتے تھے۔ انھوں نے غزالی کی اس مبسوط کتاب کا اختصار بھی مرتب کیا تھا۔ مخدوم یحییٰ منیری مہسون (ماہی سنتوش) میں ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ مہسون (ماہی سنتوش) میں جو مشرقی پاکستان کی سرحد پر واقع ہے۔ اب کھنڈرات بہت ہیں۔ اس صدی کے شروع میں، جب تذکرہ حضرت ابو النجیب سہروردی مرتب ہوا تو مہسون کی درگاہ قائم تھی۔[۱] اور سجادہ نشین صاحب کا نام شاہ عبد الغفور تھا۔ (ص ۶۶)

شیخ شرف الدینؒ کے والد اور نانا اس پایہ اور رجحان کے بزرگ تھے۔ ظاہر ہے، انھیں علم اور طریقت سے لگاؤ وراثت میں ملا تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم دستور عام کے مطابق مکتب میں شروع کی، لیکن ان ہی دنوں دہلی کے ایک مشہور فاضل شیخ شرف الدین ابو توامہ دہلی سے سنار گاؤں (بنگالہ) جاتے ہوئے منیر میں ٹھہرے اور انھوں نے نوجوان شرف الدین کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے حصولِ تعلیم کے لیے والد سے مولٰنا کے ساتھ سنار گاؤں جانے کی اجازت مانگی۔ یہ اجازت مل گئی۔ چنانچہ آپ سنار گاؤں تشریف لے گئے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کیا۔ آپ نے فاضل اُستاد سے کلام پاک، تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ علومِ عقلی مثلاً منطق، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم پائی اور ساتھ ساتھ ریاضت اور مجاہدہ جاری رکھا اور علمِ تصوف کی کتابیں پڑھیں۔ سنار گاؤں میں ہی آپ کی شادی ہوگئی اور بقول صاحب سیرت الشرف آپ کے تین بیٹیاں بیٹے ہوئے۔ لیکن سوائے شاہ ذکی الدین کے باقی سب ایامِ طفولیت میں سنار گاؤں میں ہی وفات پاگئے۔ اور ان کی والدہ نے بھی وہیں انتقال کیا۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد آپ شاہ ذکی الدین کو لے کر منیر واپس آئے۔ لیکن وہاں ابھی

---

[۱] کاش مشرقی پاکستان کے کوئی بزرگ اس مسئلے پر زیادہ روشنی ڈال سکیں۔

تھوڑا عرصہ ہی قیام فرمایا تھا کہ طلبِ الٰہی کی آگ شعلہ زن ہوئی۔ اور گھر بار چھوڑ کر مرشد کی تلاش میں نکلے اور دہلی کا رُخ کیا۔ پہلے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پہنچے لیکن انھوں نے شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ چنانچہ آپ نے شیخ نجیب الدین فردوسی کے ہاتھ پر بیعت کی اور وطن کو واپس ہوئے۔ راستے میں آپ پر جذب غالب آگیا اور ایک مدت تک آپ نے آبادی سے دُور جنگلوں میں عبادت کی۔

اس دوران میں آپ نے بہت سا زمانہ راج گیر کے جنگلات میں گزارا جو ایک زمانے میں گوتم بدھ کا مسکن اور مگدھ کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں کئی ایک چشمے ہیں، جن میں سے ایک کو ہندو اور بدھ مذہب کے لوگ خاص طور پر مقدس سمجھتے تھے۔ اس کے قریب آپ نے ایک مُدت تک عبادت کی۔ چنانچہ اس کو اب مخدوم کنڈ کہا جاتا ہے۔ آپ جنگلات میں مصروفِ عبادت تھے کہ عقیدتمند یہاں بھی پہنچنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ آپ کو آمادہ کیا کہ آپ آبادی میں جاکر ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ شروع میں تو آپ بروز جمعہ شہر بہار کی مسجد میں تشریف لے جاتے اور بالآخر وہیں جاکر قیام فرمایا۔ سلطان محمد بن تغلق نے آپ کی شہرت سُن کر آپ کے نام فرمان جاری کیا کہ آپ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی جائے اور پرگنہ راجگیر فقرا کے خرچ کے لیے ملے۔

سیرت الشرف میں لکھا ہے کہ عہدِ فیروز تغلق میں آپ جاگیر سے دست بردار ہو گئے، لیکن اس کے بعد آپ نے عمر کے باقی ۵۰-۶۰ سال بہار میں ہی بسر کیے۔ یہاں آپ کا وقت زیادہ تر زبانی ارشاد و ہدایت یا تحریری تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی عمر شریف میں بڑی برکت دی اور بالآخر ایک عالم کو فیض یاب کرنے کے بعد آپ نے ۵ جنوری ۱۳۷۱ء کو ۱۰۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ سے متعدد اکابر علما و ثقات نے فیض پایا۔ ان میں مولنا برہان الدین

شمسی مُظفر بلخی خاص طور پر ممتاز ہیں۔ وہ خود شاعر اور اہلِ قلم تھے۔ بنگال کا بادشاہ سلطان غیاث الدین اعظم ان کا قدر دان تھا۔ چنانچہ جب وہ حج کے لیے گھر سے نکلے۔ جس کے لیے بندرگاہ چٹاگانگ تھی، اور اس سلسلے میں بنگالہ میں طویل قیام کیا تو بادشاہ نے تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ خلفا کے علاوہ اولادِ معنوی میں مخدوم شرف الدین بڑے خوش قسمت تھے۔

آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ سو مکتوبات کا ایک مجموعہ مکتوبات صدی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۷۴۷ھ؍۱۳۴۶ء میں مرتب ہوا۔ ۲۲ سال بعد مکتوبات دوصدی کی تکمیل ہوئی۔ ان مکتوبات میں نجی یا تاریخی اندراجات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ فی الحقیقت یہ مکتوبات تصوف، اخلاق اور فلسفہ کے مختلف مسائل پر مستقل رسالے ہیں، جو آپ نے ان لوگوں کی ارشاد و ہدایت کے لیے جو آپ کی مجلس میں کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکتے تھے لکھے۔ آپ کے ملفوظات کے بھی کئی مجموعے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کئی رسالے بھی آپ کی یادگار ہیں۔

اسلامی تصوف پر سب سے پہلی فارسی تصنیف کشف المحجوب لاہور (پاکستان) میں لکھی گئی۔ لیکن حکومتِ دہلی کے زمانے میں اس کتاب کا ذکر کثرت سے نہیں آتا۔ ہندوستان کے علمی صوفیانہ حلقوں میں جو کتاب سب سے زیادہ رائج تھی، وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف ہے۔ جس میں تصوف کے اصول اور مسائل اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ وہ شرع کی حدود سے باہر نہیں جاتے۔ اسلامی دور میں بالعموم عوارف المعارف صوفیائے کبار کے علمی حلقوں میں بڑی مقبول رہی اور اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں، لیکن اس کے بعد (فوائد الفواد جیسے ملفوظات کو چھوڑ کر) جن صوفیانہ رسائل نے سب سے زیادہ شہرت پائی اور صوفیائے کبار کے نزدیک قریباً قریباً ایک دستور العمل کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ مکتوباتِ شرف الدین یحیٰی منیری تھے۔

فلسفہ میں (اقبال کے فلسفہ خودی و بے خودی سے پہلے) اسلامی پاک و ہند کا سب سے بڑا کارنامہ فلسفۂ شہود کی توضیح و تکمیل ہے۔ جسے پیش تو شیخ علاء الدین سمنانیؒ نے کیا تھا، لیکن جس کی تکمیل عہدِ جہانگیری میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی فلسفہ اور تصوف کے مخلوط مسائل پر کئی بزرگوں نے اپنے خیالات ترتیب دیے۔ ابتدائی اہلِ قلم میں سے قاضی حمید الدین ناگوریؒ، شیخ شرف الدینؒ یحیٰی منیریؒ، مخدوم علی مہائمیؒ، سید گیسو دراز کی تحریریں خاص مطالعہ اور غور و فکر کی مستحق ہیں۔ علمی حلقوں میں ان میں سب سے زیادہ رواج شیخ شرف الدین کی تصانیف کو ہوا اور امید ہے کہ جو کوئی پاک و ہند میں اسلامی فلسفے کی تاریخ مرتب کرے گا اور بیان و زبان اور طرزِ تفکر کی الجھنوں کو صاف کر کے قدیم خیالات کو زمانۂ حال کی اصطلاحات میں پیش کرے گا۔ اسے شیخ شرف الدین منیری کی تصانیف میں سے قیمتی مواد ملے گا۔

عین الملک ملتانی
۱۲۸۰ — ۱۳۶۲ (؟)

عہدِ تغلقیہ کا ایک اور درخشندہ ستارہ عین الملک ماہرو ملتانی ہے۔ اس کے نام کے متعلق بھی شبہ ہے۔ بعض حوالوں میں اسے عین الدین اور بعض میں عبداللہ لکھا گیا ہے۔ عین الملک اس کا خطاب تھا۔ غالباً ماہرو اس کا خاندانی نام تھا۔ اور قیاس ہے کہ ملتان میں پیدا ہوا اور پلا۔ وہ غالباً اسی برس سے زیادہ زندہ رہا، لیکن اس کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کے متعلق بے خبری ہے ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم!

تواریخ کے صفحات میں اس کا نام ان ملکی خدمات کی بنا پر آجاتا ہے، جن کا ذکر برنی، شمس سراج عفیف اور ابن بطوطہ نے کیا ہے، لیکن بقائے دوام کا تمغہ اسے اس کی تصانیف کی بدولت ملتا ہے، جن میں سے اکثر ضائع ہو گئیں۔ لیکن ان میں سے ایک (ترسیلات ماہرو) انشائے ماہرو کے نام سے محفوظ ہے۔ اور

معاصرانہ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

سب سے پہلے نوجوان عین الملک سے ہم رنتھنبور کے قلعے کے باہر اس خاص شاہی مجلس مشاورت میں دوچار ہوتے ہیں، جو علاء الدین خلجی نے ملکی بغاوتوں کی روک تھام کے لیے تجاویز مرتب کرنے کے لیے منعقد کی۔ اور جس میں فقط وہی خاص خاص مشیر طلب کیے گئے، جن میں سے بقول برنی ہر کوئی بزرجمہر وقت اور ارسطوے زمانہ تھا۔ سلطان نے ان سب کو اپنے سامنے بٹھایا۔ اور ملکی بدانتظامی کے متعلق ان کی رائے طلب کی۔ کئی روز کے صلاح مشورے کے بعد تجاویز مرتب ہوئیں، جنھیں بادشاہ نے عملی جامہ پہنایا اور ملکی بد انتظامی کا سدِّباب کیا۔

نوجوان عین الملک کی خاص مجلس مشاورت میں بڑے بوڑھوں کے ساتھ شمولیت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے جلد اپنی علمی اور عقلی قابلیت کی بنا پر نام حاصل کر لیا تھا۔ برنی کے دوسرے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ ایک زمانے میں سلطنت کے سب سے بڑے امیر اُلغ خاں کا دبیر (سیکرٹری) تھا۔ اور فرامین اور مراسلات کی تحریر اس کے ذمہ تھی۔ عفیف اس کے مراسلات کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کثرت سے پڑھے جاتے تھے۔ اور بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے ابتدائی عہدِ حکومت (۱۳۰۰ء) میں ہی وسطی ہند کے اقطاع (دھار اور اجین) اس کے سپرد ہوئے، جنھیں اس نے اپنی خوش انتظامی سے اس قابل بنا دیا کہ دکن اور جنوبی ہند کی فتح کا پیش خیمہ بن سکیں۔ سلطان قطب الدین مبارک نے اسے دولت آباد میں وزیر (دیوانِ صوبہ) بنا کر بھیجا۔ اس نے گجرات کی مہم میں بھی کامیاب حصہ لیا۔ اور سلطنت کے سب سے باعزت امرا میں شمار ہوتا تھا۔

جب قطب الدین مبارک کے بعد غاصب خسرو خاں تخت نشین ہوا تو

اس نے بھی عین الملک کو عالم خاں کا خطاب دے کر اپنے ساتھ وابستہ کرنا چاہا۔ لیکن جب غیاث الدین تغلق نے خسرو کے خلاف یلغار کی تو عین الملک اپنی فوجوں کے ساتھ خسرو سے علاحدہ ہو گیا۔ اور اس کی علاحدگی خسرو کی شکست کا ایک اہم سبب تھی۔ تغلق شاہی دور میں وہ ہمیشہ سر بلند رہا۔ بلکہ جب محمدؐ بن تغلق نے اپنے سابق اُستاد اور دولت آباد کے صوبیدار قتلغ خاں کو برطرف کر کے عین الملک کو اس کا جانشین مقرر کرنا چاہا اور عین الملک نے (قتلغ خاں سے وابستگی یا کسی ذاتی خطرے کی بنا پر) اپنے بھائیوں کے ساتھ بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور شکست کھائی" تو محمدؐ تغلق نے اپنی مشہور سفاکی کے باوجود اسے آسانی سے معاف کیا[1]۔ اور پھر سے دربار میں معزز جگہ عطا کی۔

فیروز تغلق کے زمانے میں وہ مشرف الممالک تھا۔ اور بادشاہ کے مطلق العنان وزیر خاں جہاں اور عین الملک کی جھڑپوں کا تفصیلی ذکر عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتا ہے۔ بادشاہ دونوں کی قدر کرتا تھا۔ اور اس کی مُسلسل کوشش تھی کہ ان کے محکمانہ اختلافات نہ بڑھنے پائیں، لیکن بالآخر عین الملک کو ملتان، بھکر اور سیوستان کی جاگیر ملی۔ اور اس نے اسی عہدے پر وفات پائی۔ وہ ۱۳۶۲ء کے بعد تک زندہ تھا اور غالباً اس کے جلد بعد راہیِ عالمِ بقا ہو گیا۔

عفیف اس کی عقل سمجھ اور قابلیت کی بڑی تعریف کرتا ہے (" عین الملک مردے دانش مندِ کامل و فاضل ۔ در خرد اکمل و درایت اشمل ") اور لکھتا ہے کہ اس نے محمدؐ تغلق اور فیروز تغلق کے عہد میں کئی کتب تصنیف کیں۔ جن میں

---

[1] مشہور ہے کہ محمدؐ تغلق نے دربار طلب کر کے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ اگر کسی کا کوئی قیمتی لعل گم ہو جائے اور کوڑے کرکٹ میں جا ملے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اور سب نے کہا کہ اسے اُٹھا کر، اور دھو پونچھ کر پھر معزز جگہ دینی چاہیے۔

ترسیلات عین الملکی کا شہرہ ہر زبان پر ہے۔ ان کتب میں سے فقط یہی دستبردِ زمانہ سے بچ گئی ہے۔ اسے علیگڑھ کے پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب نے انشائے ماہرو کے نام سے شائع کیا تھا۔ فقط آٹھ نسخوں کی سلائی ہوئی تھی کہ باقی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ ہم نے اس میں سے ایک اہم مکتوب دربارۂ ملّی میں نقل کیا ہے۔

تیمور فیروز شاہ تغلق کی وفات ۱۳۸۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد تخت کے دعویداروں میں خانہ جنگی ہوئی۔ جو بادشاہ فیروز کے جانشین ہوئے، وہ بڑی ذمہ داریوں کے اہل نہ تھے۔ چنانچہ حکومت دہلی کا اقتدار بہت کم ہو گیا۔ اور رہا سہا اقتدار تیمور کے حملے نے مٹا دیا، جو ۱۳۹۸ء میں افغانستان کے رستے ہندوستان آیا۔ راستے میں جہاں کہیں وہ گزرا قہر الٰہی کی طرح علاقوں کو تاخت و تاراج اور باشندوں کو قتل کرتا آیا۔ دہلی میں محمود تغلق بادشاہ تھا۔ وہ دہلی چھوڑ کر گجرات فرار ہو گیا۔ تیمور نے شہر کو لوٹا اور باشندوں کا قتل عام کیا۔ پھر میرٹھ اور جموں کے راستے واپس گیا۔ اور قسطنطنیہ کے عیسائی قیصر کی درخواست پر اس لڑائی کے لیے تیاری شروع کی۔ جس میں اس نے سلطان بایزید یلدرم کو شکست فاش دے کر یورپ کو ایک عرصے کے لیے عثمانی ترکوں سے محفوظ رہنے کا موقعہ دیا۔

بعض لوگ تیمور کا ایک خواب نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے اس کا مقصد کفر و شرک کی بیخ کنی تھا۔ حقیقتاً خود فریبی کی اس سے زیادہ نمایاں مثال ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ تیمور نے ایران اور دوسرے اسلامی ممالک میں جو ظلم ڈھائے اور جا بجا بدنصیب مسلمان مقتولوں کے سر کاٹ کر کلہ مینار بنائے تھے، ان سے کونسے شرک کی بیخ کنی ہوتی تھی۔ اور ہندوستان میں بھی دہلی کی اسلامی حکومت کو تباہ کرنے اور اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگانے کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا۔ تیمور ہلاکو اور چنگیز کا جانشین تھا۔ اور

اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ (بلکہ "خراسان کے خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو مجدد بھی یقین کرنے لگا تھا[۵۰]!) لیکن اس پر اور اس کے ساتھیوں پر اسلامی تعلیمات کا ابھی وہ اثر نہ ہوا تھا جو آہستہ آہستہ بابر اور بعد کے مغلوں پر ہوا۔ اور ابھی تک اس میں اپنی نسل کی روائتی سخت گیری اور درشت مزاجی بہت حد تک باقی تھی۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ تیمور ہلاکو اور چنگیز خان سے کہیں بہتر تھا۔ اور گاہے گاہے وہ مسلمان اولیا کی سفارش پر کسی قدر رحم سے کام لیتا۔ مثلاً جب دہلی میں شہریوں نے اس کے چند سپاہی قتل کر دیے اور تیمور نے حکم دیا کہ شہریوں کو قید کر کے ماوراءالنہر لے جایا جائے تو حضرت شیخ احمد کھتو رحمۃ اللہ علیہ (احمد آبادی) کی سفارش پر اس نے انھیں رہا کر دیا۔ بدایونی لکھتا ہے:۔

"دریں اثنا سپاہی چندرا مردم شہر کشتند در روزِ چہارم حکم بندِ عام فرمود ہمہ را بجانب ماوراءالنہر بردتا عاقبت شیخ احمد کھتو کہ روضۂ او در سرکھیج گجرات قریب بہ احمد آباد مشہور است ہمراہ آں لشکر رفتہ و صاحبقران را دیدہ حالت درویشی و فضیلتِ علم خود را اظہار ساختہ و علما و فضلائے عسکر ماوراءالنہر بحثہائے الزامی کردہ شفاعت اسیران نمود و صاحبقران را نسبت باو اعتقاد تمام پیدا شدہ ملتمس او را قبول فرمودہ ہمہ بندیاں را خلاص داد۔"

تیمور اہلِ علم کا بھی پاس کرتا تھا۔ اور اس کے دربار میں بعض اہل علم اس بے تکلفی سے بحث مباحثہ کرتے تھے جو چنگیز یا ہلاکو کسی صورت نہ گوارا کرتے۔ اس زمانے کے ایک مشہور فاضل مولانا احمد تھانیسری تھے۔ ان کے متعلقین بھی حملۂ تیموری میں گرفتار ہوئے تھے۔ جب حالات کچھ سدھرے تو وہ امیر تیمور کی مجلس میں پہنچے۔ وہاں ان کے اور شیخ الاسلام کے درمیان جو ہدایہ کے مرتب مولانا

---

[۵۰] آئینۂ حقیقت نما از شاہ اکبر خاں نجیب آبادی جلد دوم ص ۱۹۹

بُرہان الدین مرغینانی کا پوتا تھا۔ مجلس میں نشست کے نمبر (جہت تقدم و تفاخر مجلس) پر بحث ہوگئی۔ امیر نے کہا کہ یہ صاحب ہدایہ کے پوتے ہیں۔ اس لیے ان کا احترام لازم ہے۔ مولانا کہنے لگے کہ جب ان کے دادا نے ہدایہ میں اتنی غلطیاں کی ہیں تو اگر یہ ایک غلطی کریں تو کیا مضائقہ (صاحب ہدایہ کہ او پدر کلاں ایشاں بود۔ در چند محل از ہدایہ خطا کردہ است۔ ایشاں اگر یک جا خطا کردہ باشند چہ باک) شیخ الاسلام کہنے لگے کہ ہدایہ میں کون کونسی غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس پر مولانا نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ یہ غلطیاں واضح کریں، لیکن امیر تیمور نے بے لطفی بڑھتی دیکھ کر مجلس برخاست کر دی۔ (اخبار الاخیار۔ ص ۱۴۵)

تیمور کے حملے سے ملک کی علمی اور روحانی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑا۔ اور سلطان محمد تغلق کے وقت سے علماء و مشائخ کے دہلی چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہونے کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ اور بھی قوی ہو گیا۔ تیمور کے حملے سے کچھ عرصہ پہلے حضرت سید گیسو دراز نے رویائے صادقہ میں مغلوں کی آمد اور دہلی کی بدنظمی سے واقفیت پائی۔ اور انھوں نے بہت سے لوگوں کو خبردار کر دیا۔ چنانچہ مولانا خواجگی ان سے یہ اطلاع پاتے پر تیموری حملہ سے پیشتر ہی کالپی چلے گئے۔ شیخ احمد کھتو کو بھی اسی طرح کا اشارہ ہوا۔ اور انھوں نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو جونپور بھجوا دیا۔ لیکن خود دہلی ہی میں مقیم رہے۔ تاکہ خلق خدا کا ساتھ دیں ("مارا موافقت خلق باید کرد") شیخ ابوالفتح جونپوری اور قاضی شہاب الدین بھی اسی حملے کے دوران میں جونپور گئے۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں: "در خطرات کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد، اکثرے از اکابر بہ جونپور رفتند۔"

صوبجاتی حکومتیں

جب تیمور چلا گیا تو محمود تغلق واپس آیا اور تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ لیکن تیمور نے دہلی کو ایک بے جان جسم کی طرح چھوڑا تھا۔ اور اب دہلی کے بادشاہ میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ

باہر کے صوبے داروں سے اپنا حکم منوا سکے۔ چنانچہ دہلی کا حاکم فقط دہلی اور اس کے گردونواح کا صوبیدار تھا۔ اور باقی تمام وسیع صوبوں پر خود مختار حکمران قابض تھے۔

بنگال بنگال محمد تغلق ہی کے زمانے میں خود مختار ہو گیا تھا۔ اور جب تک شیر شاہ نے ۱۵۳۸ء میں اسے دوبارہ فتح نہ کیا یہ صوبہ خود مختار رہا۔ بنگال کے خود مختار مسلمان بادشاہوں میں سب سے زیادہ با اقتدار بادشاہ علاء الدین حسین شاہ تھا۔ جس نے آسام کا بہت سا حصہ فتح کر لیا۔ اور پچیس سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ بنگال کے مسلمان بادشاہوں کی ایک قابل ذکر خصوصیت ان کی رواداری تھی۔ انھوں نے علم و فن کی سرپرستی کی۔ اور بنگالی ادب کو فروغ دیا، جس کی مخالفت سنسکرت کے طرف دار ہندو راجا کرتے تھے۔ سنسکرت کی کئی کتابیں بنگالی میں ترجمہ کرائیں۔ علاء الدین حسین شاہ نے بھاگوت گیتا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ بنگالی شاعر ودیاپتی نے کئی کتابیں نصرت شاہ کے نام معنون کیں۔

بنگالی کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ فارسی کو بھی بڑا فروغ تھا۔ اور وہی دفتری اور ادبی زبان تھی۔

بلبن کے بیٹے بغرا خاں، جس نے سرزمین بنگالہ کی محبت میں تخت دہلی کو ٹھکرا دیا تھا، بڑی کوشش کی کہ کسی طرح امیر خسرو لکھنوتی میں مقیم ہو جائیں اور اس شہر کو شعر و سخن میں دہلی پر بھی فضیلت حاصل ہو۔

بنگالہ کے ایک بادشاہ سلطان غیاث الدین نے بلبل شیراز خواجہ حافظ کو بنگالہ آنے کی دعوت دی۔ اس سرزمین میں جس قدر شیریں اور دلگداز فارسی نثر لکھی جاتی تھی، ان کا اندازہ ان اقتباسات سے ہو جائے گا، جو ہم نے بنگالہ کے مشہور روحانی راہنما حضرت نور قطب عالم کی تحریروں سے نقل کیے ہیں۔

شعر و شاعری کے علاوہ شاہانِ بنگالہ فنِ تعمیر کے بھی بہت دلدادہ تھے۔ اور

پانڈوا اور گوڑ میں ان کی شاندار مسجدیں اب تک موجود ہیں۔

جونپور بنگال سے مغرب کی طرف جونپور کے شرقی بادشاہوں نے ۱۳۹۴ء میں ایک خودمختار حکومت قائم کی اور ۱۴۷۶ء تک خودمختار رہے۔ اس اسّی سال کے عرصے میں جونپور نے بڑی ترقی کی اور علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ جس طرح اٹھارویں صدی میں دہلی کے شعرا کی جائے پناہ لکھنؤ تھا۔ اسی طرح چودھویں صدی میں جو لوگ تیمور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے ملجا و ماوےٰ جونپور تھا۔ چنانچہ ابراہیم شرقی کے زمانے میں جونپور کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بنگال میں جب راجا گنیش نے مسلمانوں پر ظلم و تعدّی کا ہاتھ اُٹھایا تو حضرت نور قطب عالمؒ کے ایما پر سلطان ابراہیم نے ہی ایک لشکر وہاں بھیجا تھا۔ جس کے ڈر سے راجا نے اپنی روش بدل دی۔ اور حضرت نور قطب عالمؒ سے مصالحت کر لی۔

ابراہیم کے دربار کے سب سے زبردست عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے، جنھیں اس نے قاضی القضاۃ کا عہدہ اور ملک العلما کا خطاب دیا تھا۔ ان کا وطن مالوف تو غزنی تھا۔ لیکن دولت آباد (دکن) میں نشو و نما پائی۔ اس لیے دولت آبادی مشہور ہیں۔ تعلیم کی تکمیل دہلی میں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی سے کی۔ مغلیہ دور سے پہلے غالباً ہندوستان میں سب سے معزز فقیہ آپ ہی گزرے ہیں۔ درس و تدریس کے علاوہ قاضی صاحب نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً بدائع البیان، حاشیہ کافیہ، شرح بزدوی وغیرہ۔ ان کے علاوہ فتاوےٰ ابراہیم شاہی کے نام سے ان کے کئی فتوے جمع ہوئے۔ ان کی ایک اور اہم تصنیف بحرِ مواج ہے جو فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس کی نسبت شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں:۔

> و بحرِ مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارت فارسی۔ در دے بیان ترکیب و معنی فصل و وصل دادہ است و در یں جا نیز از بلائے سجع تکلفے کردہ است۔ قابل اختصار و تنقیح و تہذیب است

تذکرہ مصنفین دہلی میں بھی شیخ محدث اس تفسیر کی "عباراتِ حشو و لاطائل" کا ذکر کر کے لکھتے ہیں: "و باقطع نظر ازاں کتابے مفید و نافع و قابلِ تنقیح و تہذیب

است" قاضی کی وفات ۱۴۴۵ء میں ہوئی۔

قاضی شہاب الدین کے علاوہ جونپور میں کئی دوسرے صاحب فضل وکمال بزرگ گزرے ہیں۔ جن کی وجہ سے جونپور اسلامی علوم کا ایک بڑا مرکز بنا رہا۔ شیر شاہ سوری نے جو کئی لحاظ سے اسلامی ہندوستان کا سب سے بیدار مغز بادشاہ تھا یہیں تعلیم پائی۔ اور شاہجہان اس شہر کو شیرازِ ہند کہا کرتا تھا۔ آج بھی اس شہر کی پرانی عظمت کے آثار کچھ تو بلند پایہ عماتوں کی شکل میں اور کچھ اردگرد کے قصبات مثلاً اعظم گڑھ، چریا کوٹ اور سرائے میر کی صورت میں موجود ہیں۔ اور یہ ایسے مقامات ہیں، جنھوں نے جونپور کی علمی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اور جہاں سے دورِ حاضر میں بھی کئی فخرِ روزگار فضلا پیدا ہوئے ہیں۔

مالوہ | بنگال اور جونپور کے علاوہ تیسری خود مختار حکومت مالوہ کی تھی۔ جس کی یادگار مانڈو شادی آباد کی عظیم الشان عمارتیں ہیں۔ یہ حکومت بہت وسیع نہ تھی لیکن یہاں کے بعض حکمرانوں نے علم وادب کی سرپرستی کی اور بعض نئے طریقوں کے بانیوں (مثلاً مہدی جونپوری) اور غیر رائج صوفیانہ سلسلوں کے داعیوں (مثلاً شیخ عبداللہ شطاری) کی ملک کے اس گوشے میں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔

گجرات | مالوہ کی حکومت بالآخر بہادر شاہ والی گجرات کے قبضے میں آگئی۔

شاہانِ گجرات میں سب سے پہلے مظفر شاہ نے ۱۴۰۱ء خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور ۱۵۷۲ء تک جب اکبر نے گجرات دوبارہ فتح کیا۔ یہ علاقہ خود مختار رہا۔ شاہانِ گجرات میں سب سے با اقتدار حاکم سلطان محمود بیگڑھ تھا جس نے ۱۴۵۹ء سے ۱۵۱۱ء تک بڑی شان وشوکت سے حکومت کی۔ اس نے احمد آباد کو، جسے اس کے دادا احمد شاہ نے آباد کیا تھا، بڑی رونق دی۔ اور مصطفیٰ آباد، محمود آباد وغیرہ کئی نئے شہر آباد کیے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ میں ابھی تک کئی مضبوط قلعے ایسے تھے، جو قدیم الایام سے ہندو راجاؤں کے ہاتھ میں چلے آتے تھے۔ اور مسلمان انھیں زیر نہ کرسکے تھے۔ سلطان نے انھیں

فتح کر کے مُلک کا نظم و نسق آسان کیا۔ ان قلعوں میں سے چاپانیانیر اور گرنار خاص طور پر مشہور ہیں۔ سلطان نے دو تین مرتبہ سندھ پر بھی حملہ کیا۔ ۱۴۷۳ء میں سندھیوں نے مقابلہ کی کوشش کی، لیکن گجراتی فوج کی آمد پر صلح کی درخواست کی۔ سُلطان نے یہ دیکھ کر کہ سندھی مسلمان ہونے کے مُدعی تھے۔ ان کی درخواست قبول کی۔ "لیکن چونکہ ان میں بہت سی ہندوانہ رسمیں باقی تھیں، اس لیے وہ بہت سے سندھیوں کو جوناگڑھ لے گیا تاکہ انھیں اسلام کی صحیح تعلیم دے کر واپس بھیجے۔ اور وہ اپنے مُلک میں جاکر اپنے ہم مذہبوں میں صحیح اسلام پھیلائیں۔" سلطان محمُود کے بیٹے مظفر ثانی نے مالوہ کے بادشاہ محمود ثانی کو میدنی رائے سے نجات دلوائی۔

گجرات کے مسلمان بادشاہوں کی یادگاریں ایک تو وہ شاندار تاریخی عمارتیں ہیں، جو احمد آباد اور دوسرے شہروں میں قائم ہوئیں۔ اور دوسرے انھوں نے صنعت و حرفت کو بے انتہا ترقی دی۔ سنگ تراشی، زردوزی، کارچوبی، صندل اور ہاتھی دانت کی نادر اشیاء، زربفت، کمخواب، مخمل وغیرہ کی صنعتیں جن کے لیے گجرات شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں مشہور رہا ہے۔ شاہانِ گجرات کی قدردانی سے شروع ہوئیں۔ اورنگ زیب گجرات کو "زیب و زینتِ ہندوستان" کہا کرتا تھا اور یہاں کے اہلِ صنعت کی بڑی قدر کرتا تھا۔ فنِ تعمیر اور صنعت و حرفت کے علاوہ گجرات میں اسلامی علوم نے بڑی ترقی کی۔ کھمبائت، سورت، دیو اور دمن اس زمانے کی بڑی بندرگاہیں تھیں۔ ان کے راستے لوگ مکّہ مُعظمہ اور مدینہ منورہ کو جاتے اور علم و فضل حاصل کرنے کے بعد وطن آکر اس کے چشمے جاری کرتے۔ مولنا عبدالحی نے "یادِ ایام" کے عنوان سے یہاں کے علماء و مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ ان سے اور دوسرے ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ شاہانِ گجرات کے زمانے میں یہ علاقہ علم و فضل میں دہلی اور آگرے سے بڑھا ہُوا تھا۔

شیخ علی مہائمی گجرات کے جنوب میں ساحل سمندر پر مہائم کا قصبہ ہے۔ جو اب مضافاتِ بمبئی میں شامل ہو چکا ہے۔ یہاں اس زمانے میں مولانا شیخ علی ابن شیخ احمد مہائمی پیدا ہوئے، جو تحصیل علوم اور سیر و سیاحت کے بعد قصبہ مہائم میں فقیہ یعنی قاضی مقرر ہو گئے[1]۔ مولانا عبدالحی مرحوم ناظم ندوہ جو آپ کے بہت مدّاح تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دَور میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان (شیخ علی) کا کوئی نظیر نہیں"۔ آپ نے عربی میں قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی ہے، جو تبصیر الرحمان کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں قرآن پاک کی آیات کریمہ کا باہم دگر مربوط ہونا بڑی قابلیت سے بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت مجدّد الف ثانیؒ ایک خط میں غالباً اسی کتاب کی نسبت لکھتے ہیں:-

"کتاب تبصیر الرحمٰن را کہ مرسل داشتہ بودند بعضے از مواضع آں را مطالعہ نمودہ واپس فرستاد مگر مصنف ایں کتاب خیلے میل بمذہب فلاسفہ دارد و نزدیک است کہ حکیماں را عدیل انبیا سازد علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات۔ آیت در سورہ ہود بنظر در آمد کہ بیاں آنرا بطرز حکما خلاف طور انبیا است علیہم الصلوٰۃ التحیات کردہ است۔ و تسویہ درمیان قول انبیا و حکما دادہ و گفتہ است در بیان کریمہ اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار الحی والحق باوجود اجماع انبیا علیہم الصلوٰۃ اتفاق حکما چہ گنجائش دارد در عذاب اخروی قول شاں را چہ اعتبار است علی الخصوص کہ مخالف قول انبیا بود علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات فلاسفہ کہ عذاب عقلی اثبات مے نمایند مقصود شاں رفع عذاب حسی است کہ اجماع انبیا بر ثبوت آں واقع شدہ است۔ و در مواضع دیگر آیتہائے قرآنی را موافق مذاق حکما بیان می کند ہر چند مخالف مذہب تبیین نبود مطالعہ ایں کتاب

---

[1] شہر بمبئی کا گزیٹیر جلد سوم ص ۳۰۱

بے ضرر ہائے خفیہ بلکہ جلیہ نیست ۔ اظہار ایں معنی لازم دانست بجنیکہ مقدع گشت والسلام"

آپ کی ایک کتاب اسرارِ شریعت میں ہے، لیکن آپ نے تصوف پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان کا ذکر مؤرخین خاص طور پر کرتے ہیں۔ آپ توحیدِ وجودی کے قائل اور شیخ محی الدین ابن العربی کے پیرو تھے۔ آپ نے عوارف المعارف اور فصوص الحکم کی شرحیں لکھیں۔ شیخ عبدالحق محدث آپ کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"از علمائے صوفیہ موحدہ است ۔ عالم بود بعلوم ظاہر و باطن ۔ صاحب التصنیفات الرائقہ والتالیفات اللائقہ تفسیر رحمانی کہ بصفت ایجاز و تدقیق موصوف است وتفسیر را بقرآن امتزاج دادہ است از وست و زوارف شرح عوارف نیز تصنیف اوست وشرح دارد بر فصوص کہ دراں در تطبیق ظاہر و باطن کوشید و رسالہ دارد مسمی بہ جادلۃ التوحید بغایت موجز و منقح و ورائے آنہا تصنیفات دیگر نیز دارد و دریں رسالہ در تحریر دلائل عقلیہ و براہین قطعیہ وازالہ شکوک و اماطہ شبہات سخن را بغایت تدقیق نمودہ"۔ (اخبار الاخیار ص ۱۷۹)

ایک رسالے میں آپ نے لکھا ہے کہ یمن میں ایک فاضل شیخ ابن العربی کا مخالف تھا۔ اسے قائل کرنے کے لیے میں نے یمن کا سفر کیا۔ ایک ہندو اور اس کے خاندان کا آپ کی کرامات دیکھ کر مسلمان ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن آپ کی زندگی کے متعلق بہت باتیں معلوم نہیں۔ آپ نے اُنسٹھ[۵۹] برس کی عمر میں فروری ۱۴۳۱ء میں وفات پائی۔ مزار پر بڑی دُھوم سے عرس ہوتا ہے، جس میں لاکھوں آدمی شرکت کرتے ہیں۔

دکن | جونپور، مالوہ اور گجرات سے بھی بڑھ کر جس حکومت نے شان و شوکت حاصل کی، وہ دکن کی بہمنی حکومت تھی، جس کا آغاز علاء الدین حسن بہمن شاہ نے ۱۳۴۷ء میں کیا۔ گلبرگہ و بیدر اس کے دار الخلافے تھے۔ قریباً ڈیڑھ سو سال تک یہ حکومت بڑی شان سے قائم رہی۔ اس کے بعد اس کا وسیع علاقہ پانچ مختلف

خاندانوں میں تقسیم ہو گیا۔ بیجا پور میں عادل شاہی حکمران تھے۔ احمد نگر میں نظام شاہی برار میں عماد شاہی۔ بیدر میں بریدشاہی اور گولکنڈہ میں قطب شاہی۔ ان میں سے برار ۱۵۷۵ء میں نظام شاہی حاکموں کے قبضے میں آگیا۔ اور ۱۶۰۹ء میں بیدر کی خود مختاری کا خاتمہ ہوا۔ احمد نگر شاہجہان کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا جزو ہو گیا اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ اور بیجاپور اورنگ زیب نے فتح کر لیے۔

دکن میں اسلامی تہذیب و تمدّن کی تاریخ ابھی مکمّل طور پر نہیں لکھی گئی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بہمنی حکمران اور ان کے جانشین علم و فن کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کی شہرت سُن کر ایران اور دوسرے ممالک سے اہلِ علم و فضل آتے اور استحقاق کے مطابق قدر حاصل کرتے۔ شعرا میں سے ظہوری بہت مشہور ہے۔ اور مدبّرین میں سے محمود گاوان کا نام ممتاز ہے۔ اس نے بہمنی سلطنت کو آخری ایّام میں سنبھالے رکھا۔ اور اس کی شہادت کے بعد حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ علم و فضل کا بڑا سرپرست تھا۔ اور اس نے ایک شاندار مدرسہ قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند بہمنی بادشاہوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"انھوں نے دولت آباد اور دوسری جگھوں میں مضبوط قلعے بنائے، جو فوجی فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کی مسجدیں اور مقبرے شاندار ہیں اور ان کے مدرسے پُرشکوہ۔ ان کے جانشینوں بالخصوص بیجاپور اور گولکنڈہ کے حاکموں نے عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں، جن میں سب سے مشہور گول گنبد یا محمد عادل شاہ کا مقبرہ ہے۔"

دکن کی ان حکومتوں کے زمانے میں دکنی زبان کی بُنیاد پڑی اور اردو نظم و نثر کا آغاز ہُوا۔ مشائخ اور اولیا بھی نئی زبان کی ترقی کا باعث ہوئے۔ انھوں نے عوام کے فائدے کے لیے عام زبان میں کتابیں لکھیں۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور ان کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی نے دکنی نثر میں کئی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں۔ اس کے علاوہ دکن میں ہندوؤں کا شمالی ہند کی نسبت سلطنت کے کاموں میں زیادہ عمل دخل تھا۔ بیجاپور میں مرہٹی

دفتری زبان تھی۔ اور یہاں جلد ہی باہمی ربط و ضبط سے نئی زبان نے ترقی کر لی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں نے اس زبان کو بہت ترقی دی۔ ان بادشاہوں میں سے کئی خود دکنی زبان کے شاعر تھے اور ان کی مثال اور سرپرستی سے دکنی شاعری کو بڑا فروغ حاصل ہُوا۔ چنانچہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ شمال میں ریختہ کا آغاز امیر خسرو کے زمانے سے ہو گیا تھا، لیکن اُردو کا سب سے پہلا مشہور اور قابلِ ذکر شاعر ولی دکنی تھا۔ جس نے اُردو کی جنوبی شاخ یعنی دکنی کو ایک ادبی زبان بنا دیا۔ اور جس کی پیروی سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کا آغاز ہُوا۔

دکن کی اسلامی ریاستوں کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ یہاں شیعہ، سُنّی سوال شمالی ہندوستان سے پہلے پیدا ہُوا۔ شاہانِ دہلی کا مذہب اخیر تک اہلِ سنّت والجماعت رہا۔ اور اگرچہ ہندوستان میں ایرانی اثرات کی وجہ سے کئی سُنّی تفضیلی خیالات سے متاثر ہوئے۔ لیکن سوائے مستثنیات کے شاہانِ لکھنؤ کے عروج سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب کو فروغ دینے کی کوئی سیاسی کوشش نہیں ہوئی۔ دکن کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے اکثر بادشاہ شیعہ تھے۔ اور چونکہ مسلمان رعایا بالعموم سُنّی تھی، اس لیے گاہے گاہے پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں۔ لیکن عام طور پر رواداری اور یک جہتی کا اصول زیرِ نظر رہا۔ اور جب وجے نگر کے راجا نے مسلمانوں اور اسلامی معابد کی توہین شروع کی تو بیجاپور کے شیعہ بادشاہ علی عادل نے شاہ بوتراب شیرازیؒ کے ایما پر تمام اسلامی ریاستوں کو متحد کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ اور تلی کوٹ کے مقابلے پر وجے نگر کی فوج کو شکست ہوئی۔ (۱۵۶۴ء) جس نے اس سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

---

[۱] اسد بیگ جو عہدِ اکبری میں بیجاپور آیا لکھتا ہے کہ بادشاہ مرہٹی میں بات چیت کرتا تھا۔ لیکن اگرچہ وہ فارسی سے نابلد نہ تھا لیکن اس میں روانی سے گفتگو نہ کر سکتا تھا۔

خاندان سادات (۱۴۱۳ء تا ۱۴۵۱ء)
خاندان لودھی (۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء)

تغلق خاندان کا آخری بادشاہ محمود تغلق ۱۴۱۳ء میں مرا۔ اُس کے بعد خاندان سادات کا پہلا بادشاہ خضر خان تخت نشین ہُوا۔ یہ خاندان تقریباً چالیس سال تک برسرِ اقتدار رہا، لیکن اس زمانے میں دہلی کی بادشاہت ایک عام صُوبیدار کی حکومت سے زیادہ وسیع نہ تھی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ بڑے نااہل تھے۔ چنانچہ لاہور کے صوبیدار بہلول لودھی نے ۱۴۵۱ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اور خاندان سادات کا خاتمہ ہُوا۔

بہلول لودھی ایک قابل بادشاہ تھا۔ اس نے دہلی کے تخت و تاج کا اقتدار بڑھایا۔ ارد گرد کے علاقوں کو فتح کیا۔ اور بالآخر ۱۴۷۸ء میں جونپور فتح کر کے دہلی کی حکومت کو مزید وسعت دی۔

بہلول لودھی کی وفات ۱۴۸۹ء میں ہوئی۔ اور اس کی جگہ سکندر لودھی تخت نشین ہُوا۔ سکندر ایک قابل، ورسیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس نے آگرہ شہر کی بُنیاد رکھی۔ اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کا بہت سا وقت افغان امرا اور اٹاوہ، چندیری اور گوالیار کے ہندو راجاؤں سے لڑائی میں گزرا۔ لیکن پھر بھی اس نے علم و فن کی طرف بہت توجہ کی۔ اس کے زمانے میں مُلتان کے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلنبی[1] اور شیخ عزیز اللہ دہلی تشریف لائے انھوں نے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔ بدایونی لکھتا ہے:۔

"ایں ہر دو عزیزان ہنگام خرابیٔ ملتان آمده علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود۔"

---

[1] تلنبہ ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے۔

انھوں نے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم داخل نصاب کیں۔ اور بہت جلد یہ کتابیں مقبول عام ہوگئیں۔ بادشاہ نے ان بزرگوں کی بڑی قدر کی۔ وہ شیخ عبداللہ کی درسگاہ میں خود شریک ہوتا تھا۔ اور اس خیال سے کہ اس کے جانے سے درس کا سلسلہ رُک نہ جائے۔ چھپ کر مدرسے سے متصل گوشۂ مسجد میں بیٹھ جاتا۔ جہاں سے وہ مولانا کی پوری تقریر سنتا اور فیض حاصل کرتا۔ سکندر لودھی ہی کے زمانے میں مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے دہلی تشریف لائے۔ سکندر نے ان کی بڑی قدر کی۔ اور انھوں نے آگرے میں مدتوں درسِ حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔

سکندر کی بہت سی خوبیوں کے باوجود یہ کہنا غالباً صحیح ہے کہ وہ طبیعت کا سخت تھا۔ اور جب کسی مسئلے پر دو مختلف رائیں ہوتیں۔ وہ بسا اوقات درشت رائے کی تائید کرتا۔ چنانچہ جس زمانے میں وہ ابھی ایک علاقے کا گورنر تھا۔ اسے پتا چلا کہ کورو کھشیتر میں بہت سے ہندو جمع ہیں۔ اور تالاب میں نہانے اور مندر میں پرستش کرنے کے علاوہ انھوں نے وہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ سکندر نے ارادہ کیا کہ فوراً انھیں تہ تیغ اور مندر کو مسمار کیا جائے لیکن خوش قسمتی سے اس نے ملک العلما عبداللہ سے مشورہ کیا۔ ملک العلما نے فتویٰ دیا کہ ذمیوں کی ایک قدیمی عبادت گاہ کو گرانا خلافِ شرع ہے۔ اور ہندوؤں کے اشنان کی دیرینہ رسم بند کرنا ناجائز ہے۔ شہزادہ یہ سُن کر آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے اپنے خنجر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ "تم بھی کفار کے ساتھی ہو۔ میں پہلے تمھارا خاتمہ کروں گا۔ اور پھر کفار کا"۔ ملک العلما نے جواب دیا "ہر ایک کی زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے حکم کے بغیر کسی کو موت نہیں آسکتی۔ جب کوئی شخص کسی ظالم کے سامنے آئے تو پہلے اسے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیے۔ تم نے جو کچھ مجھ سے پوچھا' میں نے احکامِ نبوی کے مطابق اس کا جواب دیا۔ اگر تمھیں اس کی قدر منظور نہ تھی تو تم نے مجھ سے پوچھا ہی کیوں"۔ اس جرأت کی وجہ سے سکندر کا غصہ ٹھنڈا

ہوگیا۔ اور وہ اپنے ارادے سے درگزرا۔[1]

لیکن سکندر کی مجلس میں تمام علما ملک العلما جیسی سمجھ، اخلاقی جرأت اور اسلامی رُوح سے صحیح واقفیت رکھنے والے نہ تھے۔ چنانچہ اس کے عہد کا ایک عبرتناک واقعہ بدھن برہمن کا قتل ہے۔ اس برہمن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندو مذہب اور اسلام دونوں سچے ہیں۔ یہ خیال کبیر اور بابا نانک نے بھی ظاہر کیا تھا اور مسلمان ان دونوں کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوفیوں کے اقوال اور مسلمان شعرا کے بیسیوں اشعار اس خیال کی تائید میں موجود ہیں۔ لیکن چونکہ بدھن کے معاملے میں علما میں اختلاف تھا، سکندر نے یہ مسئلہ ایک محضر کے سامنے پیش کیا۔ علما نے فتوٰے دیا کہ چونکہ بدھن نے اسلام کی صداقت تسلیم کر لی ہے۔ اس لیے وہ مسلمان ہو گیا۔ اور اس کے بعد اگر وہ کسی دُوسرے مذہب کی صداقت مانے گا تو مُرتد ہو جائے گا۔ اور چونکہ مُرتد کی سزا ان کے نزدیک موت تھی، اس لیے بدھن کے لیے ضروری تھا کہ یا تو وہ ہندو مذہب کی صداقت سے انکار کر کے پوری طرح مسلمان ہو جائے یا ارتداد کی سزا بھگتے۔ چنانچہ اس منطق کی بنا پر، اس جُرم کی سزا میں کہ بدھن نے ہندو رہتے ہوئے اسلام کی صداقت کا کیوں اقرار کیا۔ اسے سزائے موت دی گئی۔ اور سکندر نے جو قاضیوں اور قانون دانوں کے فیصلوں پر عمل کرنا ایک مسلمان بادشاہ کا فرض سمجھتا تھا۔ بدھن کو پھانسی دلوادی۔ طبقاتِ اکبری میں اس واقعہ کی حسبِ ذیل تفصیلات دی ہیں:۔

"نقل است کہ زنار دارے بود بودھن نام در موضع کانیر سکونت داشت۔ روزے در حضور بعضے مسلماناں اقرار کردہ بود کہ اسلام حق است و دینِ من نیز درست است۔ ایں سخن انددشائع شدہ۔ بگوشِ علمار سید۔ قاضی پیارہ و شیخ بدہ کہ ہر دو در لکھنوتی بودند متنقیض یک دیگر فتوے مے دادند۔

---

[1] ملاحظہ ہو اسلامک کلچر میں سید امیر علی کا سلسلہ مضامین (انگریزی)

اعظم ہمایوں حاکم آن ولایت زنار دار مذکور را ہمراہ قاضی پیارہ و شیخ بدہ پیش سلطان بہ سنبھل فرستاد۔ چون سلطان را باستماع مذاکرہ علمی رغبت تمام بود۔ علمائے نامی را از ہر طرف طلبید۔ میاں قادن بن شیخ خوجو و میاں عبداللہ بن اللہ داد تلنبی و سید محمد بن سعید خاں از دہلی و میراں سید احسن از قنوج آمدند۔ و جمعے از علما کہ ہمیشہ ہمراہ سلطان مے بودند مثل سید صدرالدین قنوجی و میاں عبدالرحمن ساکن سیکری و میاں عزیز اللہ سنبھلی ایشاں نیز دراں معرکہ حاضر شدند۔ اتفاق علما براں شد کہ او را حبس کردہ عرض اسلام باید نمود اگر ابا آورد باید کشت۔ بودھن از اسلام آوردن ابا نمودہ کشتہ شد۔ سلطان علمائے مذکورہ انعام فرمودہ بجاہائے خود رخصت داد (طبقات اکبری)

سکندر لودھی کا مذہبی جوش افراط کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اور مسلمان مورخین نے بھی دبے لفظوں میں اس کی شکایت کی ہے۔ مثلاً طبقاتِ اکبری میں اس کی نسبت لکھا ہے۔ "و تعصب اسلام بمرتبہ داشت۔ کہ دریں باب بسر حد افراط رسانیدہ" لیکن اس نے علم و فضل کو بڑی ترقی دی۔ اس زمانے میں اسلامی ہند ایک عبوری دور میں سے گزر رہا تھا۔ اور زبان، مذہب، نظام سلطنت کے بارے میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ دہلی کی مرکزی حیثیت تغلق خاندان کے زوال کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اور اطرافِ مملکت میں بڑی بڑی خود مختار حکومتیں قائم تھیں۔ ان میں بیشتر مسلمان حاکم تھے لیکن مقامی رجحانات کے مطابق مختلف جگہوں میں مختلف رنگ غالب آرہے تھے۔ بنگال میں مسلمان بادشاہوں نے بنگالی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ اور جنوب میں دکنی زبان میں کئی مسلمان بادشاہ دیوان لکھ اور لکھوا رہے تھے، ایک دو ریاستوں میں مرہٹی فارسی کی جگہ لے رہی تھی یا لینے والی تھی۔ سکندر سے پہلے دہلی کی حیثیت بھی ایک صوبجاتی حکومت کی تھی۔ لودھی پہلے افغان حکمران تھے، جو تخت دہلی پر متمکن ہوئے۔ اور چونکہ افغانوں کو ترکوں سے کئی اختلافات رہے ہیں، عجب نہ تھا کہ

وہ زبان کے مسئلے میں بھی الجھنیں ڈال کر زیادہ پریشانیوں کا باعث ہوتے ۔

اخوند درویزہ نے ایک جگہ لکھا ہے : "بہ حکم آنکہ جہل و سختی بر افغاناں غالب است ہر کہ در زبان فارسی نطق و تکلم کند ۔ او را دشمن گیرند" ۔ لیکن سلطان سکندر لودھی نے نہ صرف فارسی کی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھا بلکہ اسے زیادہ اُستوار کیا ۔ معاملہ اور لگان کا حساب و کتاب اسلامی حکومت کے آغاز سے ہندو محاسبوں، پٹواریوں اور قانون گوؤں کے ہاتھ میں رہا تھا ۔ وہ اب تک یہ حساب کتاب ملکی زبانوں میں رکھتے تھے ۔ یہ طریقہ مسلمان حکمرانوں کے لیے بڑا مضر تھا ۔ ان میں سے جو کوئی علاء الدین خلجی جیسا جابر یا رعایا کی خاص جماعتوں کے پاس زیادہ دولت جمع ہونے کو فتنہ کا باعث سمجھنے والا ہوتا، وہ تو رعیت سے جو کچھ وصول ہو سکتا وصول کر لیتا لیکن عام بادشاہوں کی حالت مختلف تھی ۔ ان کا لگان اور معاملہ پٹواریوں اور قانون گوؤں کے حساب کتاب پر منحصر تھا ۔ اور اس میں یہ لوگ بڑی موثر کمی بیشی کر سکتے تھے ۔ سکندر نے اس بدنظمی کو مٹانا چاہا ۔ اور بعض دفاتر کی نسبت حکم دیا کہ وہ فارسی میں رکھے جائیں ۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بہت سے ہندو ملازمین کو فارسی زبان سیکھنی پڑی ۔ مُلّا نظام الدین لکھتے ہیں :۔

"و کافراں بخواندن و نوشتن خطِ فارسی کہ تا آں زماں در ایشاں معمول نبود، پرداختند"

کائستھوں کی فارسی دانی کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے ۔ ہندوؤں کی اس جماعت نے محنت و ذہانت کے سہارے ادبی درجہ حاصل کر لیا ۔ اور عہدِ سکندری میں ایک برہمن شاعر کا ذکر ملتا ہے، جس کا ایک مطلع بدایونی نے نقل کیا ہے ؎

دلِ خوں نشدے، چشمِ تو خنجر نشدے گر
رہ گُم نشدے، زُلفِ تو ابتر نشدے گر

اس کے علاوہ بادشاہ نے علم وادب کی ترویج پر خاص توجہ دی ۔ اور چونکہ اب ملک میں امن و امان تھا ۔ ان کوششوں میں اسے کامیابی ہوئی ۔ طبقاتِ اکبری میں سلطان سکندر لودھی کی نسبت لکھا ہے :۔

"در عہدِ فرخندہ او علم رواج یافت ۔ و امرازادگانِ دولت و سپاہیان بکسبِ فضل اشتغال نمودند"

معدن الشفا سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔

"ہر طرفے علم و فضل را رونق شدہ ۔ و کرم و بذل رواجے افزود و فصحاے روزگار و علماے کبار در ہر علمے تصنیفات ساختند ۔ و در ہر فنے فتحنامہ ساختند"

عہدِ مغلیہ میں جدید ایرانی شاعری کے بالمقابل ہندوستان کی قدیم فارسی ادبیات سے جو بے توجہی برتی گئی، اس کی وجہ سے نہ صرف عہدِ علائی اور اس سے پہلے کی فارسی تصنیفات سے ہم بہت حد تک محروم ہو گئے بلکہ عہدِ سکندری کی تصنیفات کو محفوظ رکھنے کی بھی کوئی خاص کوشش نہیں ہوئی، لیکن اس زمانے کی بعض کتابیں ابھی باقی ہیں ۔ اور ان سے اور شیخ جمالی کے کلام سے اس دور کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

عہدِ سکندری کی ایک نہایت دلچسپ تصنیف معدن الشفا یا طبِ سکندری ہے ۔ اس کا مصنف میاں بھوہ امراے سکندری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا ۔ اس نے سلطان سکندر سے کہا کہ یونانی ادویہ اور ہندوستانی طبیعتوں میں کوئی خاص مناسبت نہیں ۔ اس لیے حکماے ہند کی کتابوں کا فارسی زبان میں ایک ایسا خلاصہ مرتب ہونا چاہیے، جس میں تمام مشہور ہندوستانی اطبا کے نسخے اور گوناگوں امراض کے لیے مختلف ادویہ کا ذکر آ جائے ۔ بادشاہ نے اس رائے سے اتفاق کیا ۔ اور میاں بھوہ نے پانسو صفحے کی ایک مفصل کتاب تالیف کی، جس میں ایک ہزار ایک سو سات امراض اور ان کے لیے مناسب ادویہ کا ذکر تھا ۔ ہندوستان میں اسلامی طب کی تدوین و ترقی میں اس کتاب کو تاریخی اہمیت حاصل ہے ۔ یہ کتاب آج کل بھی مستعمل ہے ۔ اور نولکشور پریس نے اسے چھاپ کر شائع کیا ہے ۔

جہاں تک شعر و سخن کا تعلق ہے سلطان سکندر خود شاعر تھا ۔ اور گلرخی

تخلص کرتا تھا۔ بدایونی نے اس کی ایک غزل نقل کی ہے ؎

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدن استش | رو حلیست مجسم کہ دراں پیرہن استش
مشکِ ختنی چیست کہ صد مملکتِ چیں | در حلقۂ آں زلف شکن در شکن استش

گل رخ چہ کند جوہرِ دنداں ترا وصف
ہمچو دُرِ سیراب سخن در دہن استش

سکندر نے اپنے اُستاد اور اس عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی کو سیرِ عرب کے بعد بلاتے اور ان کی مثنوی مہر و ماہ منگانے کے لیے جو اشعار لکھے، ان میں روانی اور صفائی زیادہ ہے ؎

اے مفخرِ گنجِ لایزالی | وے سالکِ راہِ دیں جمالی!
در گرد جہاں بسے زدہ سیر | در منزلِ خود رسیدہ بالخیر
بودی تو مسافرِ زمانہ | الحمد کہ آمدی بخانہ
باید کہ کتاب مہر و ماہم | ارسال کنی چناں کہ خواہم
اے شیخ بما برس بزودی | بسیار مسافرت نمودی
بکشا لبسوے در گہم گام | تا در یابی ز گلرخی کام
چشم بہ جمالِ تو طپان است | دل مرغ مثال در فغان است
من اسکندر و تو خضر مائی | باشد کہ لبسوے ما بیائی

شیخ جمالیؒ

عہدِ سکندری میں سب سے اہم ادبی شخصیت شیخ جمالی کی ہے۔ ان کا اصلی نام جلال خاں تھا۔ شروع میں نام کی رعایت سے جلالی تخلص کرتے تھے، لیکن پھر اپنے پیر بزرگوار اور خالو مولنا سماء الدین کے ایما پر جمالی تخلص اختیار کیا۔ ان کا وطن دہلی تھا اور ذات کے کنبوہ تھے۔ اوائل عمر میں ہی یتیم ہو گئے تھے۔ لیکن قدرتی استعداد موجود تھی۔ تعلیم و تربیت حاصل کی اور محنت و کوشش سے مشہور شاعر ہو گئے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ ان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

یگانۂ روزگار و عجب اطوار بود..... اقسام شعر از مثنوی و قصیدہ و غزل گفتہ۔

حالتِ شعر او بر اہلِ سخن ظاہر است۔ قصیدہ او بہتر از غزل و مثنوی است۔"

شیخ ایک درویش منش انسان تھے بلکہ عوام الناس میں درویش کے نام سے مشہور تھے۔ دوسرے سہروردی بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی عمر کا ایک حصہ بلادِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ اثنائے سفر میں جن بزرگوں سے ان کی ملاقات ہوئی، ان میں سے مولنا جامی، ملا حسین واعظ کاشفی اور مولنا جلال الدین محمد دوانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جامی کو تو جمالی نے خاص طور پر مسخر کیا۔ پہلے پہل ان کی ملاقات بڑے بے ڈھب طریقے سے شروع ہوئی، لیکن بالآخر دونوں بزرگوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ اور قیامِ ہرات کے دوران میں جمالی جامی کے ہاں ہی مقیم رہے۔ ان دو شاعروں کی پہلی ملاقات کے متعلق مولنا آزاد "دربارِ اکبری" میں لکھتے ہیں :۔

"بزرگوں سے سُنا ہے کہ پہلی ملاقات میں اپنا حال کچھ نہ ظاہر کیا۔ اور پاس جا بیٹھے تن برہنہ فقط لنگ باندھے تھے۔ فقیرانہ حالت تھی۔ انھوں نے کہا: "میانِ تو وخر چند فرق است" انھوں نے بالشت بیچ میں رکھ دی[1]۔ انھوں نے تحمل کیا۔ اور کہا "کیستی؟" انھوں نے کہا: "از خاکسارانِ ہند"۔ ان کا کلام وہاں تک پہنچ چکا تھا۔ پوچھا: "از سخنانِ جمالی چیزے یاد داری"۔ انھوں نے یہ شعر پڑھے :۔

دلکے پُر درد و دوستکے	دو سہ گز کے بوریا و پوستکے
نے غمِ دزد و نے غمِ کالا	لنگکے زیر و لنگکے بالا
عاشقِ رند و لا اُبالی را	ایں قدر بس بود جمالی را

انھوں نے کہا طبع شعر داری یعنی کچھ شعر کہتے ہو۔ انھوں نے یہ مطلع پڑھا

---

[1] تذکروں میں یہ روایت یوں لکھی ہے کہ: جمالی اس ہیئتِ کذائی کے ساتھ جس کا ذکر آزاد نے کیا ہے۔ جامی کی مجلس میں بغیر کسی تعارف یا تمہید کے سیدھے مسند پر شاعر کے پہلو میں جا بیٹھے جامی نے بگڑ کر پوچھا "میانِ شما و خر چہ قدر تفاوت است" اس وقت ان میں اور جامی میں ایک بالشت کا فرق تھا۔ انھوں نے جواب دیا۔ "یک وجب"

ما را ز خاکِ کویت، پیراہن است بر تن
آں ہم ز آبِ دیدہ، صد چاک تا بہ دامن!

یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن پہ تمام گرد پڑی تھی۔ سینہ پر جو آنسو پڑے۔ گرد چاک چاک ہوگئی۔ جامی سمجھ گئے۔ اُٹھ کر گلے ملے۔ اور تعظیم و تواضع سے پیش آئے۔"

یہ قصہ دوسرے تذکروں میں کسی قدر تفاوت کے ساتھ درج ہے۔ سیر العارفین سے جس میں جمالی نے دوسرے بزرگوں کے تذکرہ کے ضمن میں اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں، اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ ہرات میں جمالی مولانا جامی کے مہمان رہے۔ اس کتاب میں جمالی نے چند اُن پُرلطف بحثوں کا ذکر کیا ہے، جو ان کے اور جامی کے درمیان ہوئیں۔ مثلاً عراقی کی تصنیف لمحات کے متعلق جامی کہتے تھے کہ عراقی نے یہ کتاب لکھتے وقت شیخ صدر الدین قونوی سے فیض حاصل کیا۔ اور جمالی کہتے تھے: "لمحات یک قطرۂ سحابِ فیضے است کہ از دریائے معرفت حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین قدس سرہ در کام روحش چکیدہ"۔

شیخ جمالی لباس درویشی پہنے ہوئے تھے، لیکن تھے طبیعت کے شوخ اور تیز۔ چنانچہ اس کا اندازہ "میانِ شما و خرچہ قدر تفاوت است" کے جواب "بقدر یک وجب" سے ہی ہو گیا ہوگا۔ شیخ عبدالحق محدث نے ان کے اور سید حسین پائے میناری کے مذاق کا ذکر کیا ہے، جو بعض اوقات فحاشی کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ شیخ محدث جنھوں نے جمالی کو "مجمع اطوار" کہا ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"مہابت صورت و معنی در ذاتِ او تعبیہ یافتہ بود در محافل در ارتکاب عزائم امور بغایت دلیر بود۔ کمتر کسے را از اکابر در مجلس فرصت سخن دادے"

شیخ کا ابتدائی زمانہ سلطان سکندر لودھی کے عہدِ حکومت کا تھا اور بادشاہ خود ان سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ شیخ نے سکندر کی تعریف میں بڑے زوردار قصائد

لکھے ہیں، لیکن اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ بادشاہ سے ارادت کسی دنیاوی غرض کے لیے نہیں ہے

میانہء من و تو دوستی برائے خدا است
نہ از برائے متاعِ زمانہء غدّار!

جب سلطان سکندر وفات پا گیا تو جمالی نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا۔ اس کا ایک شعر تھا ہے

اے سلیمانِ زماں، آہ کجائی آخر تا کنم پیشِ تو از فتنہء دیواں فریاد!

سکندر کا جانشین ابراہیم لودھی تھا۔ اسے کسی نے جا کر کہا کہ "شیخ جمالی شمارا دیو گفتہ است"[1]۔ چنانچہ بادشاہ شیخ سے ناخوش ہو گیا۔ یہ ناخوشی تو بالآخر جاتی رہی۔ لیکن ابراہیم اور شیخ کے تعلقات میں وہ ارادت نظر نہیں آتی، جو شیخ اور سکندر کے تعلقات میں تھی۔ اور جب ابراہیم لودھی کو بابر نے شکست دی تو شیخ نے اپنے تئیں بابر سے وابستہ کر لیا۔ اور اس کی تعریف میں کئی پُر زور قصیدے لکھے۔

شیخ کی تصانیف میں سے ایک اولیا کا تذکرہ سیر العارفین ہے۔ اس میں حضرت خواجہ اجمیریؒ سے اپنے مرشد مولنا سماء الدین تک کے مشاہیر مشائخ کے حالات دیے ہیں۔ یہ تذکرہ ایک دفعہ دہلی میں چھپا تھا۔ لیکن اب کمیاب ہے۔ مثنوی مہر و ماہ کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ یہ مثنوی بہت دلچسپ ہے۔ اس میں جمالی نے اہلِ تبریز کی فرمائش پر شہزادی مہر اور شہزادہ ماہ کی داستانِ محبت نظم کی ہے۔ لیکن اخیر میں لکھتے ہیں ہے

نہادم مہر و ماہ را قصہ در پیش در آں جا رنجتم دردِ دلِ خویش
بروں دادم غمِ دل در فسانہ حدیثِ مہر ماہم شد فسانہ

---

[1] سیر العارفین ص ۱۳۸

سوادِ نامہ خود افسانہ ماست کہ ایں دود از دلِ دیوانہ ماست

مرا تا دل بہ ایمان و یقین است محبت مذہب است و عشق دین است

جمالی نے اپنے مرشد کی مدح میں بڑے پُر زور قصیدے لکھے ہیں، ایک تشبیب کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ز آسماں گر تیغ بارد سر نخارد اہلِ دل
نیشِ سوزن بر دلِ نامرد زخمِ خنجر است

مرد نتواں گفت او را کو تن آراید بہ زر
زینتِ مرداں ست آہن زر زناں را زیور است

مرد را کردار عالی قدر گرداند نہ نام
ہر کسے کو را علی نام است نے چوں حیدر است

از معانی افتخارِ سینۂ عالم بود
عزتِ معدن نہ از کوہ است بل از گوہر است

سُرخیِ رُوے مُنافق لالہ را ماند کہ اُو
اسود القلب است اگرچہ رنگِ رُویش احمر است

نے کسے کاہلِ بیاباں شُد دمِ وحدت زند
خونِ ہر آہوے صحرائی نہ مشکِ اذفر است

اصلِ ایماں در نیابی در فقیہِ بے اصول
کامتحانِ دینِ او در احتضارِ محضر است

جمالی کا مشہور ترین شعر وہ ہے، جسے علامہ اقبالؒ نعت کا بہترین شعر کہا کرتے تھے۔ اور جس کی نسبت شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں: "ایں بیت او در نعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم شہرت دارد و بعضے از صلحا در خواب بقبول ایں بیت در پیشِ آں سرور بشارت یافتہ ؎

مُوسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتوِ صفات
تو عینِ ذات مے نگری و در تبسمی"

جمالی کے دو بیٹے تھے۔ ایک حیاتی، جن کی بدیہہ گوئی اور فیاضی و حسن اخلاق کی شیخ عبدالحق محدث بڑی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے شیخ گدائی، جن کا ہمایوں بڑا مداح تھا۔ اور جو عہدِ اکبری میں پہلے شیخ الاسلام تھے۔

بھگتی تحریک

لودھیوں کے عہدِ حکومت کا ایک قابلِ ذکر واقعہ شمالی ہندوستان میں کئی ایسے بزرگوں کا ظہور ہے، جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کو ملانا چاہا۔ اور ایسے فرقوں کا آغاز کیا جن میں دونوں مذہبوں کے عقائد شامل تھے۔ ان بزرگوں میں کبیر سب سے پہلے تھے جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱۸ء میں وفات پا گئے۔ تذکرہ اولیائے ہند میں انھیں شیخ کبیر جولاہہ قدس سرہ لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ "حضرت تقی سہروردی کے خلیفہ تھے۔ اور مشاہیرِ زمانہ سے ہوئے ہیں۔ اپنی ولایت کو طریقہ ملامتیہ میں چھپایا تھا اور تمام موحدانِ وقت سے ممتاز تھے۔ چند روز رامانند بیراگی کی خدمت میں رہ کر فنِ شاعری زبانِ ہندی میں حاصل کیا۔ زبانِ ہندی میں پہلے معرفت انھوں نے بیان کی۔ ان کی تقلید گورونانک نے کی۔" آگے چل کر اسی تذکرے میں لکھا ہے کہ "کبیر صاحب بعد اس کے حضرت شیخ بھیکا چشتی کی خدمت میں رہ کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور ہندو و مسلمان دونوں گروہ آپ کے معتقد تھے۔ ہر ایک آپ کو اپنے میں شمار کرتا تھا۔ اور جو اہلِ ہنود آپ کے سلسلے کے ہیں وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ طریق ان کا اذکار و اشغال میں بالکل اہلِ اسلام کے مطابق ہے۔ مگر الفاظ کا فرق ہے۔"

بابا نانک جن کی تعلیمات کبیر کی تعلیمات سے کئی باتوں میں ملتی جلتی ہیں۔ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۵۳۸ء میں وفات پا گئے۔

اس اثر کا ذکر کرتے ہوئے جو اسلام نے ہندو عقائد پر کیا، ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:-

> "جنوب میں جہاں مسلمان پہلے بسے، ہندوؤں کے مذہبی و معاشرتی خیالات میں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ بہت سی تبدیلیاں شنکراچاریہ، شیو اور

وشنومت کے سادھوؤں کی وجہ سے تھیں۔ رامانج نے ان کا خاص اسلوب ترتیب دیا۔ اور بھگتی کی تحریک کو اس کے فلسفے سے ایک بُنیاد مِل گئی۔ اس کے پیروؤں نے اس تحریک کو تمام ہندوستان میں پھیلا دیا۔ بھگتی یا پریم اور عبادت کا مذہب جو آہستہ آہستہ شمال اور جنوب کے تمام ہندوؤں میں پھیل گیا۔ ایک لحاظ سے اپنشد اور بھاگوت گیتا کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ میں اس کی مقبولیت اسلامی اثرات کی وجہ سے ہوئی۔ بھگتی کے پُرانے پہلوؤں پر اسلامی اثرات کی وجہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا اور کئی پہلو تو اسلام سے اخذ کیے گئے تھے۔"[1]

مولینا نجیب اشرف لکھتے ہیں :-

"اشاعتِ اسلام کا کام صوفیوں نے جو باہمہ و بے ہمہ کی زندہ مثال، وسیع المشرب آزاد خیال اور روادار ہوتے تھے، شروع کیا۔ ہندوؤں نے بھی اس رنگ کو اختیار کر لیا۔ رامانند، گورو نانک، سوامی چیتینا اسی قسم کے گورو تھے۔ انھوں نے نہ صرف "ویدانتی توحید" اور "متصوفانہ" "فنا فی اللہ" کے اصول کو عام کر دیا۔ بلکہ اپنی برادری میں داخل ہونے کے لیے ہندو و مسلمان کی قید بھی اٹھا دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان کے معتقدین میں نہیں بلکہ خلفا میں ہم کو مسلمان نظر آتے ہیں۔ کبیر پنتھی، داؤد پنتھی وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔"

ترویجِ اسلام

اس کتاب کے دوسرے حصّے میں ہم نے اسلام کے پنجاب، سندھ، بنگال، کشمیر، دکن اور گجرات میں اشاعت پانے کا حال لکھا ہے۔ تسلسل مضمون کے خیال سے ہم نے بعض جگہ اپنا اندراج صرف گزشتہ دَور یعنی ۱۳۲۱ھ تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ

---

[1] مختصر تاریخ اہلِ ہند (انگریزی) ص ۲۰۸

ان خطوں میں اشاعتِ اسلام اور ترویجِ علومِ اسلامی کے جو واقعات اس سن کے بعد بھی ظہور پذیر ہوئے، یکجا کر دیے ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سال تک ان علاقوں میں اشاعتِ اسلام مکمل ہو چکی تھی۔ قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ گزشتہ دور میں اشاعتِ اسلام کا کام بخوبی آغاز کر چکا تھا، لیکن اس کی ترقی اور توسیع موجودہ دور میں جاری رہی مثلاً بنگال میں شاہ جلال الدین تبریزیؒ کی مساعی گزشتہ دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن حضرت نور قطب عالمؒ اور ان کے رفقا کا کام جس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ موجودہ دور میں ہوا۔ اسی طرح مغربی پنجاب اور سندھ میں اشاعتِ اسلام موجودہ دور میں بھی زوروں پر جاری رہی۔ اور مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سید راجو قتال کی مساعی موجودہ دور سے متعلق ہیں۔ ہم نے تسلسلِ مضمون کے خیال سے اور ہر ایک خطے میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ یکجا ترتیب دینے کے لیے ان تفاصیل کو گزشتہ باب میں بیان کیا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ دور اس بارے میں کورا رہا۔

ہندوستان پر اسلام کے اثرات

خلجی خاندان کے زمانے میں اسلامی حکومت سارے ہندوستان میں قائم ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مبلغین اور مشائخ بھی خطۂ پاک و ہند کے کونے کونے میں پہنچ چکے تھے۔ اور وہ عمل شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے آج اس سرزمین کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے آنے سے جو مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، ان کا مطالعہ بڑا دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ لیکن یہاں اس اہم مسئلے پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس کے چند پہلوؤں پر ڈاکٹر تارا چند نے ایک کتاب اور پروفیسر تھامس نے ایک مختصر رسالہ لکھا ہے۔

سر جادو ناتھ سرکار نے بھی ان اثرات کا خلاصہ ایک لیکچر[1] میں بیان کیا ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد اور اسلامی حکومت کے قیام سے ہندوستان کو مفصلہ ذیل فائدے پہنچے :-

۱۔ بیرونی دنیا سے تعلقات کی بحالی اور بحری فوج اور بحری تجارت کا احیا، جو چولا راجاؤں کے زوال کے بعد ختم ہو گئی تھی۔

۲۔ ہندوستان کے بڑے حصے، بالخصوص بندھیاچل کے شمال میں اندرونی امن و امان۔

۳۔ ایک ہی طرح کا نظم و نسق قائم ہونے کی وجہ سے انتظامی یکسانیت۔

۴۔ تمام قوموں کے اعلےٰ طبقوں میں طرزِ معاشرت اور لباس کی یکسانیت۔

۵۔ انڈو اسلامک آرٹ جس میں ہندوستانی اور چینی مصوّری کے نمونے شامل ہو گئے تھے۔ فنِ تعمیر کا نیا طرز اور اعلےٰ قسم کی صنعتوں کا فروغ (مثلاً شال سازی، ململ، قالین سازی وغیرہ)۔

۶۔ ایک عام لنگوا فرینکا (ملکی زبان) جسے اُردو، ہندوستانی یا ریختہ کہتے تھے۔ اور سرکاری نثر لکھنے کا خاص طرز جسے فارسی نویس ہندو منشیوں نے ایجاد کیا۔

۷۔ بادشاہانِ دہلی کے ماتحت امن و امان اور اقتصادی بہبودی کی وجہ سے صوبجاتی ادبیات کا آغاز۔

۸۔ توحید کا احیا اور تصوّف کی ترقی۔

۹۔ تاریخی کتب کی تصنیف کا آغاز۔

۱۰۔ فنونِ جنگ اور عام تہذیب و تمدن میں ترقی۔

★

---

[1] منقول در "انڈین اسلام" از ڈاکٹر ٹائی ٹس

چند اہم تاریخیں

عہدِ مغلیہ سے پہلے

سیاسی

سال عیسوی	واقعہ
۵۷۰	بعثت نبوی (مکہ معظمہ)
۶۲۲	ہجرت نبوی
۶۳۲	رحلت نبوی
۷۱۲	دیبل کی فتح
۷۱۳	ملتان کی فتح
۹۹۴	سبکتگین کا پشاور پر قبضہ
۱۰۲۱	محمود غزنوی کا لاہور پر مستقل قبضہ
۱۱۹۳	سلطان محمد غوری کا دہلی اور اجمیر پر قبضہ
۱۱۹۴	قنوج کی فتح
۱۱۹۵	گجرات اور مالوہ کی فتح
1197 / 1202	بختیار خلجی نے بہار اور بنگال فتح کیا۔

مذہبی علمی ادبی

سال عیسوی	واقعہ
۷۷۱	پاک و ہند کے علما کا وفد ہارون رشید کے دربار میں (بغداد)
۸۸۳	سندھ میں پہلے اسمٰعیلی مبلغ کی آمد
۱۰۰۷	شیخ صفی الدین گازرونی کی وفات (اچ ریاست بہاولپور)
۱۰۴۸	البیرونی کی وفات
۱۰۷۲	داتا گنج بخش کی وفات (لاہور)
۱۱۵۲	شاہ یوسف گردیزی کی وفات (ملتان)
۱۱۸۱	سلطان سخی سرور کی وفات سخی سرور ضلع ڈیرہ غازی خان
۱۱۹۲	حضرت خواجہ معین چشتی کی اجمیر میں آمد۔
۱۲۲۵	طبل عالم سید نطہر ولی کی وفات [ترچناپلی مدراس]

ادارہ کی چند نئی کتابیں

1-	قرآن حکیم کے سرائیکی تراجم	ڈاکٹر پروفیسر سیّد مقبول حسن گیلانی	800.00
2-	مصالح مرسلہ	ڈاکٹر طاہر مسعود قاضی	700.00
3-	اسلامی ثقافت کے سنگِ میل	ڈاکٹر عبدالکریم عثمان	450.00
4-	مسلم نفسیات	ڈاکٹر اظہر علی رضوی	500.00
5-	نظام التواریخ	قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی ترجمہ: ڈاکٹر انجم رحمانی	700.00
6-	مولانا حامد علی خان	ڈاکٹر شائستہ حمید خان	500.00
7-	سرسیّد شناسی کے چند اہم زاویے	نسیم عباس احمر	250.00
8-	غالب پر سوانحی ادب	ڈاکٹر محمد یار گوندل	500.00
9-	ابدیت کے تناظر سے	ڈاکٹر نفیس اقبال	250.00
10-	اقبال، وقت اور تقدیرِ انسانی	پروفیسر عالم خوندمیری	150.00
11-	قلزمِ فیض میرزا بیدل	مرتب: شوکت محمود	350.00
12-	داستانِ پنجابی زبان و ادب	ڈاکٹر سیّد اختر جعفری	700.00
13-	روحِ تصوف	شیخ زکریا بن محمد الانصاری ترجمہ: خالد حسن قادری	60.00
14-	مولانا محمد حنیف ندوی - ایک تعارفی مطالعہ	ڈاکٹر سعادت سعید	150.00
15-	منٹو اور ہم	الطاف احمد قریشی	150.00

16. South Asian Muslim Creative Mind 400.00
Gilani Kamran

17. The Art of Pen Dr. Rahat Naveed Masud 500.00

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

2- کلب روڈ، لاہور